

”یس! آئی ایم۔۔۔۔۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ وہ اس سے اس کی رویے کی توقع رکھے ہوئے تھیں شاید اس لیے بھی وہ برداشت کر رہی تھیں۔

”بٹ آئی ایم ٹاٹ ٹوائے عطیہ خاتون۔۔۔۔۔! کہ جس کو جہاں چاہا رکھ دیا۔ آئی ایم ہیومن بینک جس کی طرف سے، خواب ہیں، خواہشات ہیں اور نہ ہی میں بچہ ہوں کہ بابا اور آپ اپنی من چاہی زندگی کے قید خانے میں ال دیں۔ میں اپنی زندگی آپ جینا چاہتی ہوں، اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ انجوائے کرنا چاہتی ہوں اور یہ کہ اس ہے، انڈرا سٹینڈن ٹومی۔۔۔۔۔! اب میں اپنی زندگی خود جینا چاہتی ہوں، بچپن سے اب تک بابا اور آپ کے اشاروں پر جیا ہے میں نے ایک ایک لمحہ، آپ دونوں نے میرا بچپن مار دیا، جب مجھے میرے بچپن کے ملنے چاہئیں تھے تب بھی آپ لوگوں نے مجھے نہیں دیے، مجھے اپنی زندگی کا کوئی دور ڈھنگ سے، خوشی سے الٹا کر دیا۔ میں نے آپ دونوں نے، مجھے وہ زندگی جینے پر مجبور کیا ہے جو میں جینا نہیں چاہتی تھی، ایب ایل زندگی دی ہے مجھے، میں اپنی عمر کی لڑکیوں سے مختلف کیوں ہوں۔۔۔۔۔؟ کیوں ان جیسی اچھی زندگی نہیں جی سکتی۔۔۔۔۔؟ وہ لوگ اپنی ہر عمر کی بہار کو انجوائے کرتی آئی ہیں اور مجھے پابند سلاسل رکھا آپ لوگوں نے۔۔۔۔۔؟ کیوں؟ کیوں آخر۔۔۔۔۔؟“

خولہ رورہی تھی، چیخ رہی تھی اور وہ بالکل درست کہہ رہی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ٹوٹے گھر کی بچی، اپنی اپنی انا کے خول میں بند والدین کی بیٹی ہے۔ عطیہ خاتون مانتی تھیں کہ خولہ کے ساتھ شہباز نے پہلی بار اپنی نواسے ماں سے چھین کر کی دوسری غلطی یہ کہ لپٹی نے جنگ جیت لینے کے چکر میں انہوں نے معصوم بیٹی کو مار مار لگا دیا۔ اس کی ہر خواہش ہر خوشی پر پابندی لگا دی گئی جو کہ عطیہ خاتون کو بھی پسند نہیں تھیں۔ عطیہ خاتون اصلاح پسند خاتون تھیں مگر اس معاملے میں وہ شہباز سے کڑی نہیں لے سکتی تھیں، کچھ بھی تھا ان کی حیثیت ایک ملازم اور گورنس کی ہی تھی اور وہ اپنی حیثیت کبھی بھولتی نہیں تھیں۔

”شاید اسی لیے بیٹا۔۔۔۔۔! کہ تمہارے بابا تمہاری ماما سے جیتنا چاہتے ہیں۔“

”وہ اس جیت کے جیون میں مجھے ہار دینا چاہتے ہیں۔ کیا ماما ایسے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔؟ عطیہ

خاتون۔۔۔۔۔! کیا سب کے والدین ایسے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔؟ غزل وغیرہ کے ماما پاپا تو ایسے نہیں کیوں۔۔۔۔۔؟“

خولہ جسم سوال بنی کھڑی تھی اور جب سے وہ شعور کو پہنچی تھی یہ سوال اندر ہی اندر اسے کاٹتا رہتا کہ اس کے

ماما پاپا ساتھ کیوں نہیں رہتے، دوسری لڑکیاں اتنی خوش مطمئن کیوں ہوتی ہیں مگر جواب کبھی نہیں ملا۔

”شاید اس لیے بیٹا۔۔۔۔۔! کہ کچھ والدین کچھ بھی سوچے کچھ بغیر ریت کے گھر بناتے ہیں جو اختلاف کے

ایک ہی ریلے میں بہہ جاتے ہیں جیسے تمہارے ماما پاپا نے۔ اپنی ویز بیٹا۔۔۔۔۔! تمہارے بابا بہت اچھے ہیں، انہوں

نے ہمیشہ تمہارے لیے اچھا سوچا۔“

”کیا کہا۔۔۔۔۔؟ میری ننھی ننھی خواہشات کو اپنی دھونس، غصے اور انجانی دشمنی کے پیروں تلے کچل کر رکھ دیا،

معمولی معمولی خواہشات کو بابا نے میرے لیے انمول بنا دیا، ٹی وی کی کیا حیثیت ہے۔۔۔۔۔؟ لوگوں کے گھروں

کے ہر کمرے میں موجود ہیں مگر بابا نے اس معمولی سی انجوائے منٹ کو بھی میری حسرت بنا دیا۔ کیوں ایب نارٹل

”میں پاکستان نہیں جاؤں گی عطیہ خاتون۔۔۔۔۔!“

چہرے پر سختی، لہجے میں قطعیت اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ خولہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس پر عمل بھی کرے گی اور یہ سارا ہارون کی تربیت کا اعجاز تھا کہ وہ باپ کے فیصلے کے خلاف ڈٹی کھڑی تھی۔ عطیہ خاتون نے پاپا سے اسے دیکھا، مگر اسانس لیا اور پیکنگ کا عمل جاری رکھا تو خولہ نے بدتمیزی سے جا کر ان کے ہاتھ سے کپڑے لے کر پرے پھینک دیئے۔

”بند کریں یہ تیاریاں عطیہ خاتون۔۔۔۔۔! آئی ڈونٹ وائٹ لو کو پاکستان۔۔۔۔۔! انڈرا سٹینڈ۔۔۔۔۔!“

”یس۔۔۔۔۔! آئی انڈرا سٹینڈ اینڈ یور فادر آل سو۔۔۔۔۔! اسی لیے تو یہ فیصلہ ہوا ہے۔“

عطیہ خاتون نے انتہائی پرسکون انداز میں کہا۔ وہ اس کی بات کو قطعی قابل توجہ نہیں سمجھ رہی تھیں یا یہ ان کی توقع تھی کہ ایسا ہی مزاحمتی رویہ ملے گا۔ انہوں نے مختصر سے جھلپ میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتی تھیں مگر خولہ کے اندر تو جیسے ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ہارون سے جدائی اور اس کی سنگت سے ملنے والی آزادی اور پورے ہوتے خوابوں کے ٹوٹ جانے کا صدمہ طوفانی صورت اختیار کیے اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت اس جذباتی موڑ پر تھی کہ ایسے کسی موڑ کی طرف جانا تو ذور کی بات دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر رہی تھی۔

”کچھ بھی عطیہ خاتون۔۔۔۔۔! میں کسی قیمت پر پاکستان نہیں جاؤں گی۔“

خولہ نے بدتمیزی سے عطیہ خاتون کی محنت پر یوں پانی پھیرا کہ ان کا ترتیب دیا ہوا اٹیچی قالین پر اٹل تو ایک لخت عطیہ خاتون کو شدید غصہ آیا۔ ان کا جی چاہا دو چار پتھر ایسے رسید کریں کہ خولہ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں مگر وہ بہت صابر خاتون تھیں، برداشت اور ضبط پر ان کو اختیار تھا۔ انہوں نے ایک بظاہر خاموش مگر پوری ہوئی نظر خولہ پر ڈالی۔ اگر وہ ذرا بھی سمجھ سکتی تو ان خاموش نظروں کی تحریر اسے بہت کچھ سمجھا جاتی مگر وہ اس وقت لفظوں کو سمجھنا نہیں چاہتی تھی تو خاموشی کو کیا سمجھتی۔

”آریو ڈیف عطیہ خاتون۔۔۔۔۔!“ اس کی ہر بات کے جواب میں ان کو خاموش دیکھ کر خولہ نے ان کو ہتھی



سوچ رکھتے ہیں.....؟ ان کو کسی پر اعتبار نہیں۔“

وہ سوال بن کر ان کے سامنے کھڑی تھی تو عطیہ خاتون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔

”شاید خود پر ہے۔“ اتنے عرصے کی رفاقت میں عطیہ خاتون یہی جان پائی تھیں مگر وہ خولہ کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھیں اس لیے اسے ہر حال میں باپ کا فرمانبردار رہنے کی تائید کرنی پڑ گئیں۔

”آئی دل ناٹ گوٹو پاکستان.....!“ خولہ کے اندر کی بغاوتی سوچ نے اسے بغاوت پر مزید مضبوط کیا۔

”یول بے بی.....!“

”واٹ.....! ہارون.....! یہ تم کہہ رہے ہو کہ میں پاکستان چلی جاؤں.....؟“

خولہ کے لہجے میں حیرت اور دکھ کی آمیزش اس کی آنکھوں میں تیرنے لگی۔ جن پر تکیہ ہو وہیں دینے لگیں تو کشتیاں ڈوب جایا کرتی ہیں۔

”ہاں.....! اسی لیے کہ تمہارے بابا کا حکم بھی ہے اور فیصلہ بھی، آئی تھنک یول بی او بے.....!“ ہارون جو نگم چباتے ہوئے اس ہارون سے قطعی مختلف اور پرجنبی لگا جس نے اسے زندگی کے نئے رنگوں کی دکان دکھائی تھی، نئے اور اچھوتے خوابوں کے نگر کی سیر کرائی تھی اور اب وہ اجنبی بنا اسے بائے بائے کر رہا تھا۔ غم و غصہ کا طوفان اسے اندر سے تباہ کر گیا۔

”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا میرے جانے سے.....؟“ تھکے تھکے، بجھے لہجے میں اُمید کے تارے ٹوٹ کر گر گئے لگے تو ہارون کا قہقہہ کمرے کی فضا میں گونج گیا۔

”کم آن خولہ.....! یہ زندگی کا سفر ہے اگر محسوس نہ کرو تو کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

خولہ کو اس وقت وہ بہت گھٹیا لگا۔

”تو تمہیں میرے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا.....؟“ لہجے میں ٹوٹے اعتماد کی کرچیوں کی آواز تھی۔

”کیوں پڑے گا فرق.....؟ دیکھو مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ تمہیں پڑے گا۔“

”میں..... میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھے اس جہنم سے نکالو گے۔“

ساتھ شادی کے خواب دیکھنے لگتی ہو۔ وائے.....؟“

ہارون منچلا تو جوان تھا غیر سنجیدہ سا مگر خولہ کو تو اپنی تاریک دنیا میں وہ جگنو لگا اور اس نے بے ساختہ اسے طعنے میں بند کرنا چاہا تھا مگر اس وقت ہارون کا انداز سے سر تاپا کھولا گیا۔

”شٹ آپ ہارون.....! تم اتنے چھوٹے اور گھٹیا ہو سکتے ہو یہ معلوم ہوتا تو میں اپنی دنیا کی تاریکی میں ہی گم رہتی۔ میں نے کوئی خواب تمہارے حوالے سے نہیں دیکھا، میں نے تمہیں ایک اچھا اور مخلص دوست سمجھا، اے.....! اور میں تمہارے ساتھ یہاں رہنے سے بہتر پاکستان جانے کو سمجھتی ہوں۔“

دوستی کا مان ٹوٹ جانے کا غم آنکھیں نم کر گیا۔ ہارون کے ساتھ کسی اور رنگین دنیا کی سیر کرنے کے خواب ٹوٹ گئے۔ خولہ باہر نکل گئی تو ایک ویرانی سی ہارون کے اندر بھی اُتر آئی جس کا سبب وہ خود بھی نہ جان پایا۔

”سوری خولہ.....! میری اور تمہاری منزل ایک نہیں ورنہ میں تمہارے لیے ضرور لڑتا۔“

ہارون جیسا بھی تھا فیر آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خولہ اس کی منزل نہیں اس لیے اس نے اسے ایسا خواب بھی نہیں دکھایا تھا۔ وہ تو بس اپنا اور اس کا وقت خوبصورت بنانا چاہتا تھا جو شہباز کو اچھا نہیں لگا مگر ہارون کو خولہ کی اُمیدیں توڑنے پر دکھ ضرور ہوا تھا۔

والدین کے آپس کے اختلافات بچوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اس ضمن میں شرجیل بہترین مثال تھا۔ اس قدر بے یقین کیفیت میں جیتا رہا کہ مرد ہو کر انداز نہ ہوتے گئے، مرد ہونے کا احساس آواز میں بھاری پن پیدا کر دیتا تو ماما کے رونے کا احساس، چپا کی مار کا خوف اس کے تمام مردانہ احساسات کو مار ڈالتا اور آواز دب جاتی، آپ ہی باریک ہو کر زنانہ صورت اختیار کر لیتی اور اسی بے یقینی کے ساتھ وہ اللہ کی ایسی ہی مخلوق کے پاس آ گیا جن کے پاس نہ مرد ہونے کا اعزاز تھا نہ عورت ہونے کا البتہ جو انسان تو کہلاتے تھے مگر نہ تو معاشرے میں ان کے لیے کوئی مقام تھا نہ جگہ تھی نہ ہی کسی دھڑے کی نیم پلیٹ ماتھے پر لگی تھی۔ اپنی شناخت کی تلاش کا یہ راہی یہاں آ کر رہی سہی پہچان بھی گنوا بیٹھا تھا۔ وہ ان عاصمہ، صائمہ، نادرہ اور شاہینہ کے ہتھے چڑھا ہوا تھا جس کو وہ بطور کھلونا استعمال کر رہی تھیں۔ عجیب سا ماحول تھا گروڈیرے کا، تیز آواز میں پاکستانی اور انڈین گانے لگے۔

”مما.....! آپ کہاں ہیں ماما جان.....! پلیز آ جائیں، دیکھیں تو آپ کے بیٹے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

ماہم.....! تم تو موبی کے ساتھ میری وجہ سے لڑتی ہو۔ پیاری بہن.....! آ جاؤ۔“

رات بھر وہ روتا رہا، سسکیاں اندر ہی اندر دم توڑتی رہیں کیونکہ وہ عاصمہ اور نادرہ کے قبضے میں تھا۔ جو ادھر سے آتیں اسے آنکھ مار جاتیں، ادھر سے آتیں چٹکی بھر جاتیں۔ اس کے مزاحمتی انداز پر اس طرح گھورتیں جھڑکتیں کہ وہ سہم جاتا۔ کیا عیش و آرام میں پلنے والا اس وقت شدید گرمی میں بان کی چار پائی پر صحن میں لینا سینے میں سسکیوں کو دبا رہا تھا۔ وہ آپس میں بیہودہ مذاق کرتے ہوئے اپنے دن بھر کی کمائی کو گنتیں۔

”ویسے شنیدو.....! یہ مرد بھی بہت ہی بے وقوف ہوتے ہیں۔“ نادرہ نے حقہ زور سے گڑ گڑایا۔



”اری.....! چھوڑ یہ مرد بھی کوئی اس قابل ہے کہ اس پر بات کی جائے۔ اب دیکھو ہم جیسوں کو دیکھ کر تو شیشہ بھی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور یہ مرد ہم جیسی بد شکل، کالی پیلی، کر مار یوں کے پاس آتے ہیں، نہ ہم سے کیا ملے گا ان کو.....؟ ہم کسی کو کچھ دینے کے قابل ہوتیں تو ایسی ہوتیں۔“

صائمہ کے لہجے کے فسون نے کچھ دیر کے لیے ماحول پر گھیرنا طاری کی۔ کوئی نام، کوئی پہچان، کوئی حیثیت نہ ہونے کا دکھ کس قدر جان لیوا ہوتا ہے یہ کوئی ان سے پوچھے۔

”چھن چھن ناچوں گی، گن گن گاؤں گی، سیاں مورے آئیں گے، ان کو سمجھاؤں گی۔“ منجلی راشو کی تیز آواز اور ناچ نے ماحول کی افسردگی کو نگل لیا تو سب میں جیسے بجلی بھرنی، سب ناچنے اور گانے لگیں۔ اتنا شور ہونے لگا کہ شرجیل کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

”بند کرو یہ بکواس.....!“ وہ شاید زندگی میں پہلی بار دھاڑا۔ آواز میں کسی خوف کی لرزش تھی نہ بے یقینی کا احساس لرز رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایسا کیا تھا جس نے کچھ دیر کے لیے متحرک ماحول کو سلاکت کر دیا تھا۔ ایک بارگی سب کے دل سینے میں دھڑک اٹھے تھے اور جب آواز کا فسون ٹوٹا تو عاصمہ اور صائمہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھیں، ان کے بڑھتے قدم شرجیل کے قدموں کو لرزنے پر مجبور کر گئے۔ وہ جو خود بھی اپنی آواز، اپنے انداز، اپنی جرأت پر حیران ہو رہا تھا آہستگی سے چار پائی پر دیک کر بیٹھ گیا، ہاتھوں میں وہی لرز اتر آیا، پیشانی پر سے ٹھنڈا پسینہ بہنا شروع ہو گیا۔

”کیا کہا.....؟ بکواس.....؟ ہاں بکواس.....؟“ چنانچہ ایک زوردار تھپڑ دھان پان اسٹارٹ سے شرجیل کے چودہ طبق روشن کر گیا، دائیں بائیں سے ہائے، اوکی، مرگی، ہونہ، طاکم نہیں کی قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ ”شرم نہیں آئی تجھے منھی سی جان پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے.....؟ اری.....! کٹ جائیں تیرے یہ ہاتھ جو میری بنو پر اٹھے ہیں۔“

شنیو کی آواز بھگ گئی تھی۔ وہ شرجیل کو بہت چاہنے لگی تھی۔

”چل ہٹ.....! خبردار جو اس جنم جلی کی حمایت کی ہو تو۔ اری بد بخت.....! جس کو تو بکواس کہہ رہی ہے ناں یہ روزی روٹی ہے ہماری۔ ہمارے کون سے باپ، بھائی، شوہر، بیٹے بیٹھے ہیں جو ہمیں تخت پر بیٹھا کر کھلائیں گے.....؟ اری نصیبوں جلی.....! پیٹ کے اس دوزخ کو بھرنے کے لیے ہمیں یہ بکواس کرنی ہے۔“

تک پیدا کرنے والا رب سوہنا ہمیں اٹھانہ لے۔ کیوں ری نصیب جلیو.....! میں نے جو بکواس کی درست کی کہ غلط.....؟“

عاصمہ جو غصے سے شرجیل کو گھور رہی تھی اس نے قریب جا کر اٹھایا۔ شرجیل کی گھٹی گھٹی خوف کے پہروں میں دبی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔

”نہ چھوٹی.....! تو کوئی بات غلط کرتی ہے جواب کرے گی.....؟“

”ہونہ.....! چچی کہیں کی۔“ عاصمہ کی بات پر راشو نے لہک لہک کر گاتے ہوئے کہا تو شنیو جل گئی۔

”اچھا میری لڑیا.....! میری شہزادی.....! مت رو چاندنی.....! مت رو۔ تو ابھی نئی نئی ہے ناں سمجھ جائے گی ہولے ہولے۔ اری.....! خبردار تو نے آئندہ میری پری پر ہاتھ اٹھایا ہو تو۔“ صائمہ نے بڑھ کر شرجیل کو

لگا کر پکارا اور بھلانے کے لیے عاصمہ کو آنکھ دبا کر ڈانٹا بھی۔ شرجیل کو اس ماحول میں اپنا دل بند ہوتا

”اچھا تو کہتی ہے تو آئندہ نہیں لگاؤں گی ہاتھ لیکن تو اسے سمجھا دے یہ جس کو بکواس کہہ رہی ہے ناں اسے

لگاؤں گے۔“

عاصمہ کو اسے مار کر خود بھی افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر اسے پیار کرنا چاہا مگر شرجیل نے اسے زور سے دھکیل دیا۔

”نہیں کروں گا میں یہ سب..... مجھے اپنے ماما اور ماما کے پاس جانا ہے۔“

”اچھا نہیں کرے گی تو کھائے گی کہاں سے جانی.....! کمائے بغیر کوئی کھانے کو نہیں دیتا، ہر کوئی اپنا پیٹ

لے کے لیے خود کماتا ہے اور آخر تو اس ”گا“ کے چکر سے نکلے گی کب.....؟ اس کی کبخت پر لگتا ہے بہت ہی

”صائمہ باجی.....! تو دیکھنے دے اگر یہ نہیں کماتی ناں تو نہ کمائے، میں کما کر کھلا سکتی ہوں اس کو۔“ شنیو

راشدہ نے آگے بڑھ کر شپ ریکارڈ کی آواز بلند کر دی تو شرجیل کو اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس

”کل بڑے کرو آ رہے ہیں، کل اس پری کو اس کے سامنے پیش کرنا، ذرا ڈھنگ سے تیار کر دینا۔“

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو

”ماہم.....! ماہم! اٹھو بیٹے تمہیں پچھتے تو نہیں آتی۔“ تیمور اور ثاقب گری ہوئی ماہم کو اٹھا رہے تھے جو



نارٹل ہے تو پیا کے ظلم و ستم کی وجہ سے، اس کے اندر بے یقینی ہے، خوف ہے تو مہم کی بے بسی اور خوفزدہ آوازوں کی وجہ سے، پھر کیوں اب رو رہے ہیں.....؟ اچھا ہے وہ چلا گیا ہے، بہت ہی اچھا ہے، ایسے والدین کو ایسی سزا ملنی چاہیے۔ یا اللہ.....! بھائی مجھے لوٹا دے۔ پروردگار.....! میرا چاند سا بھائی لوٹا دے۔“

ماہم کا جگر خراش انداز تیمور اور ثاقب کی آنکھوں کے کنارے بھی بھگو گیا۔  
 ”ماہم.....! دیکھو میری بہن.....! ایسی باتیں گھروں میں کی جاتی ہیں یوں سڑکوں پر نہیں۔“  
 ”ہم جیسے ٹوٹے ہوئے گھروں اور ایب نارٹل حالات کی گود میں پرورش پانے والے بچوں کی کیا باتیں کر رہی ہوتی۔“ ماہم کا ایک ایک زخم بلبلارہا تھا، سسک رہا تھا۔

”ایسا نہیں کہتے ماہم.....! ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا، اب تو چچا جان نے آمنہ چچی سے معافی مانگ لی ہے۔“  
 ”اب تو کوئی گڑبڑ نہیں، سب ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ ثاقب بھائی.....! کہ کوئی گڑبڑ نہیں، سب ٹھیک ہو گیا ہے لیکن کبھی کبھی سب ٹھیک ہونے سے پہلے جنم لیتی ہے۔“

سیٹ کی پشت سے سر لگا کر ماہم شدتوں سے رو دی۔ شرجیل کی گمشدگی نے گھر بھر میں سوگوار سی فضا پیدا کر دی تھی۔ آمنہ تو سکتے کی سی کیفیت میں تھیں، آنکھیں کھولنے بس وہ دروازے کو نکلے جاتیں، ان کی آنکھوں میں جیسے انتظار کا موسم بس سا گیا تھا، پہلے اچھے دنوں کا انتظار، دواصف کے لوٹ آنے کا انتظار، معافی کا انتظار، بچنے کا انتظار، کالافتا ہی سلسلہ پھیلا تو پلکیں ساکت ہو گئیں، چمکنا بھول گئیں۔ دواصف سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے، تڑپتے پھرتے، زیادہ تر خود اس کی تلاش میں پھرتے رہتے، جب گھر ہوتے تو تلاش کے لیے نکلتے، ہوا کی آمد پر تڑپ کر ان کی طرف بڑھتے، مایوسی پر وہیں دیوار سے لگ کر رونے لگتے۔

”یا اللہ.....! کیا واقعی میری خطا اتنی بڑی تھی کہ مجھے اتنی بڑی سزا ملی.....؟ پروردگار.....! معاف کر دے، بخش دے میری کوتاہیاں۔ آمنہ.....! کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا کہ مجھے ایسی سزا مل رہی ہے.....؟“  
 گم سم بیٹھی آمنہ کے پاس آ بیٹھے تو ماہم کو کچھ دیر کے لیے اپنے مہم چا پر ترس کے ساتھ غصہ آ گیا۔

ماہم اٹھ کر جانے لگی تو دواصف نے اسے شدت سے ساتھ لگا لیا۔  
 ”کچھ تو کہو میری بیٹی.....! جو چاہا وہ اپنے گناہ گار باپ کو کہو، آخر میں ہی تو ذمہ دار ہوں اس ساری صورت حال کا، میں مجرم ہوں تم سب کا، گناہ گار ہوں، ایک بے معنی سی بات نے شعلہ بن کر میرا گلشن خاکستر کر ڈالا۔“

اب تم لوگ مجھ سے خفا کیوں ہو.....؟ میری خطا سے بڑی سزا تو مل گئی ہے مجھے۔ میرا جوان بیٹا، میرا مظلوم بیٹا میری جان.....! اب جبکہ ازالہ کا وقت آیا تو تم.....! وہ ماہم کو ساتھ لگا کر تڑپتے رہے پھر تیزی سے باہر نکلتے گھر پڑے۔ عارف نے جلدی سے بڑھ کر اٹھایا تو وہ پھر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھے۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہیں بھائی جان.....! اس وقت تین بج رہے ہیں رات کے، سب کچھ بند“

”ہاں.....! ہو گا سب کچھ بند مگر میرے اللہ کے گھر کا دروازہ ہر وقت، ہر لمحہ کھلا رہتا ہے میرے لیے۔“

گناہ گاروں کے لیے، وہیں جا رہا ہوں اور اپنے خالق، مالک سے توبہ کروں گا اور بھیک مانگوں گا کہ میرا شرجیل ایک بار پھر دے دے تو اسے اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گا، اپنی تمام غلطیوں کا ازالہ کروں گا، میرا شرجیل تو مجھے عاف کرنے پر تیار ہی نہیں تھا، اپنی جدائی کی سزا دے کر تجا نے کہاں چلا گیا مگر میں اب اسے خدا سے مانگوں گا۔  
 ”ماہم میرا بیٹا لوٹا دے گا، دیکھ لینا وہ آ جائے گا۔“

دواصف عارف کے ساتھ لپٹ کر بری طرح رو رہے تھے۔ پھر لاکھ سب نے سمجھایا مگر دواصف مسکد چلے گئے۔ وہ جلدے میں گرے اپنا بیٹا اللہ سے مانگتے رہے۔

● ● ●

آج شرجیل کی بڑے گرو کی عدالت میں حاضری تھی۔ عاصمہ، صائمہ وغیرہ سب خوب شوخ میک آپ اور اس میں گھوم رہی تھیں، اونچی آواز میں ڈیک بھی لگا تھا اور خود بھی اپنی بھاری آواز میں گار رہی تھیں۔ الٹی سیدھی میں کر رہیں، ایک دوسرے کو آنکھ مارتیں، کبھی دھکا دے کر گرا دیتیں تو بے ہنگم قہقہہ پھوٹ پڑتا، شرجیل ایک کونے میں دبکا سہا یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر ہول رہا تھا۔

”بڑے گرو کو آنے دو، پتہ ہے میں نے ان سے کیا مانگتا ہے.....؟“  
 شنیو شرجیل کے گرد چکر لگاتے ہوئے اترائی تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”پشاور سے میری خاطر دنداسہ لانا او میرے گل جاناں.....!“ نادرہ کے ٹھمکے پر سب کی سب گانے اور ہنسنے لگیں تو شنیو کے دل پر چوٹ پڑی۔ کوئی اس کی بات کیوں نہیں سمجھ رہا۔

”وقفہ ہو جاؤ تم سب، آج کل دنداسہ کرنا کون ہے، لپ اسٹک کے بے شمار شیڈز آگئے ہیں جو کہ میرے پاس ہیں، میں تو کچھ اور ہی مانگنے والی ہوں۔“ شنیو پہلے اترائی پھر آنکھوں میں چمک لیے وہ شرجیل کو دیکھنے لگی۔

اس نے خوف سے آنکھیں میچ لیں، دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، اسے بری طرح ڈر لگ رہا تھا، ڈر تو اسے بچپن ہی سے لگا کرتا تھا مگر اس وقت مہم اور ماہم کا آچل اور مہم کی گود میں تھی ڈر کے آسیب سے چھپنے کے لیے، اب تو وہ دکھوں کے آسمان تلے بے سائبان کھڑا تھا۔ دلائیں بائیں، آگے پیچھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، ایسے میں کون تھا جو اس کا اپنا تھا، نگہبان تھا، محافظ تھا، سائبان تھا۔

”اللہ.....! دل کی گہرائیوں سے نکلا اور اس کے کپکپاتے ہونٹوں کی طاقت بن گیا۔ وہ کھسک کھسک کر باہر جانے لگا مگر سب نے اسے دبوچ لیا۔“

”کہاں چلی.....؟ اونچلی.....!“  
 ”بس تو بھئی.....! جان لو کہ میں آج بڑے گرو سے اس شہزادی کو مانگنے والی ہوں۔“

”کیا کیا.....؟ ہے ناں پاگل کا دماغ خراب۔“ سب کی سب اس پر پل پڑیں، شرجیل تو لوٹ کا مال تھا ان سب کے لیے جس پر سب اپنا حق جتنا چاہتی تھیں مگر زیادہ حق تو عاصمہ اور نادرہ کا تھا جو اسے لے کر آئی تھیں۔

”شنیو.....! یہ بات کرنے سے پہلے تو نے شیشے میں اپنی یہ چمٹے جیسی شکل نہیں دیکھی.....؟ فٹے منہ۔“

عاصمہ نے نفرت سے شنیو کو دھکا مارا۔

Post by Sanyoo



گیا اور سب اس کو تیار کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو شرجیل کو لگا اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ وگ، میک اپ، سامان اور دیگر لوازمات دیکھ کر شرجیل پریشان ہو گیا۔ اس نے کب سوچا تھا کہ زندگی میں ایسے بھی مرحلے آئیں گے۔ اس نے باپ کی مار کھائی تھی۔ نفرت، غصے کی آگ میں جلا تھا مگر یہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا۔

”مت کرو میرے ساتھ ایسے۔ پلیز.....! مت کرو میں..... میں مرد ہوں۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ واللہ.....! میری مدد فرما۔“

اس کی منت سماجت، آہ، فریاد کچھ کام نہ آئی۔ انہوں نے اپنی کارروائی جاری رکھی، پہلے اسے گنجا کیا گیا، اس نے اپنی ہٹا کی جنگ آخری دم تک لڑی تھی کہ آخری دم تک وہ ہاتھ پیر مارتا رہا تھا مگر آخر اس نے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب وہ مکمل طور پر ان کے اختیار میں تھا موم کی ناک کی طرح، ان کا جہاں جی چاہا وہاں اس کو موڑا، اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس کے بالوں کی جگہ گندی کر لی، دراز بالوں کی وگ نے لے لی لیکن اب اس کی کلین شیو کی گئی تو وہ ہلکا کر دیا۔ تب ہی جب عاصمہ شاکتنگ پنک بھڑکیلا زنا نہ جوڑا لیے اس کی طرف بڑھی تو اس نے التجائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں..... میں خود پہن لوں گی۔ ہاں میں خود پہن لیتی ہوں کپڑے۔“ اس کے لہجے کی شکستگی نے اپنی ہار کا اعلان کر دیا کہ وہ مردانگی کی جنگ ہار گیا ہے اور نسوانیت کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس ہار اور اعتراف کے انداز پر وقت بھی حسک پڑا۔ ایک ایک پل نے پلٹ پلٹ کر ایسے والدین کو دیکھا جو اپنی اپنی لڑائی میں معصوم و مظلوم اولاد کو ان کے نازک احساسات کو بے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ آخر انسان شوکر لگے بغیر کیوں نہیں سنبھل جاتا، کیا اصلاح کے لیے حادثہ ضروری ہے۔ کون دیتا اس کا جواب۔

”ہائے ہائے.....! قربان جاؤں، کیا چیز لگ رہی ہے میری پری.....؟“ باقی سب شرجیل پر واری مدد دے ہو رہی تھیں۔

”آخر اسے لایا کون تھا.....؟“ عاصمہ اور ناصرہ اتر آئیں۔

”چلو اب اسے بڑے گرو کے پاس لے چلیں۔“ وہ سب شرجیل کو جواب زندہ لاش بن گیا تھا، لے کر گرو کے پاس چلی گئیں۔

اب بڑے گرو صاحب کی نظریں بھی اس پر جم گئی تھیں۔

”گرو جی.....! یہ گھوڑی ہماری دریافت ہے، ہم اسے لے کر آئے ہیں۔“ گرو کی نظروں میں خوشی اور پسندیدگی کی چمک دیکھ کر عاصمہ جلدی سے آگے بڑھی تو ناصرہ پھنکار کر آگے بڑھی اور عاصمہ کو پرے دھکیلا۔

”چل ہٹ ری.....! بکواس نہ کر، یہ صرف میرا کارنامہ ہے۔“

”اچھا.....! اب بک بک بند کرو، کیا نازل لوگوں کی طرح میں میں لگا رکھی ہے۔ تم لوگ اچھی طرح جانتی ہو یہاں عام دنیا کے اصول نہیں چلتے، یہاں سب کی خوشی، سب کا غم ایک ہے کیونکہ ہم سب کی حیثیت ایک ہے اور ہم سب.....“

”ایک ہیں۔“ بڑے گرو کا یہ ادھورا جملہ ہمیشہ سب یک زبان ہو کر ادا کرتیں اور چھوٹے موٹے

”اپنی اوقات نہ بھول ہونہ.....! یہ جو بچ بن جیسی آنکھیں ہیں ناں ان سے صرف دیکھا کر، پر غواب دیکھا کر، آئی کہیں سے اس پری پر نظر رکھنے والی، نہ تو تجھے غیرت نہ آئی ہمارے حق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے۔ اگر ام گھوڑیاں، جنم جلیاں بھی ایک دو بچے کا خیال نہ رکھیں گی، ایک دو بچے کی ٹانگ کھینچیں گی، ایک دوسرے کے حق ڈاکہ ڈالیں گی تو کیا فرق رہ جائے گا ہم میں اور ان عام لوگوں میں جو مطلب پرست ہیں، ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ لہذا اس پری بیکر پر صرف ہمارا حق ہے۔ خبردار جو کسی نے اسے میلی نظر سے دیکھا ہو تو۔“

ناصرہ نے اچھا خاصا لکچر دے ڈالا تو راشدہ مسخرے پن سے آگے بڑھی۔

”ہائے ہائے.....! تیرے قربان، کیا تقریر کرتی ہے میری مہارانی.....! میلی نہ سہی پیار کی نظر تو ڈال دے ناں، ہائے پریٹی وومن۔“ راشدہ نے شرجیل کے چہرے کے انتہائی قریب آ کر کہا۔ گندی، بدبو سے شرجیل کو ابکائی آگئی، وہ چلایا۔

”جسٹ شٹ آپ.....! نہیں ہوں میں وومن۔“

اس کے اندر کا مرد ہر قسم کے خوف، خدشے اور بے یقینی کے بند توڑتا ہوا دھماکا تو ماحول پر ایک بار پھر سکت طاری ہو گیا۔ ان دس بارہ کے منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں مگر اس ہار شرجیل پر نہ تو لرزہ طاری ہوا نہ وہ خوف سے سہا سہٹا۔ البتہ چہرے پر پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے تھے، ہتھیلیاں پٹپٹ ہوئی تھیں، وہ کانپ رہا تھا مگر خوف سے نہیں غصے سے، وہ یقین سے کھڑا تو ہو گیا تھا مگر ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں بے شمار راستے نکل رہے تھے اور تمام راستے ہی اسے اپنی طرف بلا رہے تھے، وہ انتخاب کرتے کرتے چکر گیا، سر چکرانے لگا، ہتھیلیاں کھلنے لگیں، گون پینہ منجمد ہونے لگا، وہ اسی جگہ ڈھیر ہو گیا مگر اندر کہیں ایسا روغن دریافت ضرور ہو گیا تھا جس سے روشنی کے آئینے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے اندر باہر کی کیفیت سے بے خبر وہ سب جن کے لیے یہ ایک سونے کی چڑیا تھا، ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ یہ کسی وقت بھی یہاں سے چلا سکتا ہے یہ خوف سب کے دلوں پر دستک دیتا ہوا بڑھ گیا۔

”اس سے پہلے کہ یہ کوئی ہوشیاری دکھائے بدل ڈالو اس کا حلیہ۔“ ناصرہ نے جیسے سب کو حکم دیا تو عاصمہ غصے سے نتھنے پھلائے شرجیل کی طرف بڑھی۔

”مارنا نہیں پیار سے، سمجھ جائے گی بد بخت.....!“ شنیو نے بڑھ کر عاصمہ کی منت کی کہ پہلے کی طرح اسے مار نہ پڑ جائے اور پھر سب نے مل کر شرجیل کا حلیہ بدلنا شروع کر دیا، وہ چیختا چلاتا ہی رہا۔

”چھوڑ دو پلیز.....! مجھے چھوڑ دو، میں ماما پاپا سے بہت سے پیسے دلا دوں گا۔ پلیز.....! مجھے چھوڑ دو، ماہم.....! آ جاؤ، مجھے بچا لو۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل ایک ہوشمند مرد کی طرح دھاڑنے والا یہی نو جوان ہے جو اب بچہ بناد کے لیے اللہ کو پکار رہا تھا۔

”آج اسے بڑے گرو کے سامنے پیش کرنا، اس طرح سنوارو کہ گرو دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔“

”میں ابھی تیار کرتی ہوں گڑیا کو۔ آؤ میری جان.....! میری گڑیا.....! تجھے سنوار دوں تاکہ بڑے گرو

خوش ہو کر ہمیں انعام دیں۔“

نادرہ نے باقاعدہ قصائیوں کی طرح آستین چڑھائیں اور بطور خاص شرجیل کے لیے لایا ہوا نیا سامان لایا



اختلافات بھلا کر ایک ہو جاتیں اور آج تو گرو بہت خوش تھے۔ شرجیل کا اٹھ کر انہوں نے استقبال کیا، لگایا، ماتھا چوما، وہ زندہ لاش کی طرح حرکت کرتا رہا۔

”یہاں آمیر اینٹا.....! کیا بات ہے تو اتنا اداس کیوں ہے.....؟“

محبت بھرے نرم لہجے کی پھوار خشک بے جان زمین پر پڑی تو شرجیل نے آنکھیں کھولیں۔ نجانے کون اسے بڑے گرو کچھ ہمدرد سے لگے۔ وہ کچھ دیر ان کو دیکھتا رہا پھر جیسے بے حس حیات نمودار ہوئے تو اس کے دونوں ہاتھ آپس میں جڑ گئے، شل ہوتی ٹانگوں میں حرکت ہوئی، گھٹنوں میں خم آنے لگا تو وہ بڑے گرو کے پیروں میں ڈھیر ہو گیا۔

”مم..... مم..... مجھے چھوڑ دیجئے، میرے مہاپا کے پاس، میری ماہم کے پاس، پلیز..... اور نہ.....“  
میں مرجاؤں گا، پلیز.....! چھوڑ دیجئے۔“ وہ اس بری طرح بلبلایا کہ گرو نے گھور کر ان سب کو دیکھا۔  
”کیوں ری بد بختو.....! اسے مار اپنا تو نہیں.....؟“

”ہائے.....! قربان جاؤں گرو جی.....! اس کلی کو مارنے کو کسی کا دل چاہے گا.....؟ بس ذرا غصہ آتا ہے جب جانے کو کہتی ہے۔“  
”ہاں گرو جی.....! میں.....“

”میں صدقے جاؤں.....! دیکھ تو کتنا چاہے اس کے منہ پر گرو جی۔ میری رانی.....! ایک بار پھر کہہ گرو جی۔“ شنو اس کے انتہائی قریب آ کر بولی تو وہ جھٹکے سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پھر گرو کی طرف متوجہ ہوا جو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

”گرو جی.....! یہ آئیاں میری بات نہیں سمجھتیں، آپ تو بہت سمجھدار لگتے ہیں، مجھے جانے دیں میرے گھر میرے مہاپا اور ماہم کے پاس، یہ ماہم میری بہن ہے میں اس کا بھائی ہوں جی.....!“  
”تجھے یقین ہے چندا.....! کہ تو اس کا بھائی ہے۔“ گرو جی کے لہجے میں بھی وہی سوال تھا جس کا جواب ڈھونڈتے وہ بے نشان ہو گیا تھا۔

”ہاں جی.....! جب وہ مجھے بھائی کہتی ہے تو پھر میں بھائی ہی ہوں ناں۔“ وہی یقین کے چھوٹے کناروں کا ملال، وہی بے یقینی کی آندھیاں، شرجیل کا لہجہ ڈوب گیا تو گرو نے پیار سے اسے اپنے برابر کر لیا۔

”یہ جو تمہاری بہن کہتی ہے ناں ہو سکتا ہے اسے بھائی کی طلب ہو اور اس لیے وہ تمہیں بھائی کہتی ہو۔ خیر یہ بتاؤ تم کیا سمجھتے ہو.....؟ تم اس کی بہن ہو کہ بھائی.....؟“

پھر وہی بے یقینی کی آندھیاں چلنے لگیں، دائرے بنتے چلے گئے، اتنے بن گئے کہ دائرے ایک گول جال کی صورت اختیار کر گئے جس میں شرجیل پھنس گیا تھا، کتنے ہاتھ پیر مارتا تھا، اس جال سے نکلنے کی ہر ممکنہ کوشش ناکامی کے ڈھیر میں بدل جاتی تو وہ بھی ڈھیر ہو جاتا۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں میں کون ہوں، ماہم کا بھائی کہ بہن.....؟“ وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر پھر سسکنے لگا۔ تب گرو نے اسے ساتھ لگا لیا۔

”کچھ بیٹا.....! ہم وہ لوگ ہیں جن کی نہ کوئی پہچان ہے نہ گھر بار نہ انسانی رشتوں کی وہ کڑی جن سے کسی کی رشتے جڑے ہوتے ہیں بلکہ ہم لوگ تو اس زنجیر کی وہ بد نما کڑی ہوتی ہیں جن کو اپنے ہی گئے رشتے الگ کر دیتے ہیں کیونکہ معاشرے میں وہ ہمیں کسی رشتے کا اعزاز نہیں دے سکتے۔ یہ سب تو اللہ کی مرضی ہے اس کو جو بناتا ہے وہ بن جاتا ہے۔ کچھ بیٹا ہمارے اختیار میں کب ہے بیٹا.....! تو سمجھو بس یہی تیرا گھر ہے اس رشتوں کے نام تو لے رہا ہے ناں چاہے تو یہیں تلاش کر لے ورنہ وہ اب تجھے قبول نہیں کریں گے، اس لیے انہوں نے نکالتے گھر سے۔“

گرو جی دھیمے انداز میں اسے بہت کچھ سمجھا گئے مگر اسے کسی پل قرار کیوں نہیں آتا تھا، وہ کیوں درمیانی گلی میں رہتا تھا، وہ یقین کی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا اور وہ منزل کب اور کہاں ملے گی یہ سوچ کر وہ بے دم ہو جاتا۔  
مگر گرو نے انصاف کے ساتھ کام لیتے ہوئے شرجیل کی ڈیوٹی جس کا نام اب انہوں نے حسینہ رکھ دیا تھا، کسی کے ساتھ لگا دی۔ اب اسے کمانے جانے تھا۔ پہلے روز وہ عاصمہ اور ناصرہ کے ساتھ تھا۔

”میں بھی جاؤں گی حسینہ کے سنگ۔“ عاصمہ کی گھر کیوں اور ناصرہ کی چٹکیوں کے باوجود شنو دانتوں کی آواز میں کہیں گئی۔ آج اتنے دنوں بعد وہ اس جہنم سے نکلتا تھا۔ نیلے آسمان پر آزادی سے اڑتے پرندوں کو اس نے مسرت سے دیکھا، کتنا دل چلا کہ یہ زنجیریں توڑ کر بھاگ جائے، آزاد ہو جائے، اتنی تیزی سے بھاگے کہ گھر جا کر دم لے مگر یہ خواہش، یہ خواب ناصرہ کی چٹکی نے توڑ ڈالا۔ وہ لوگ ٹیکسی ڈرائیور سے مذاق کر رہے تھے اور وہ بھی ان سے بیہودہ مذاق کرتا رہا۔

شرجیل کو عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ شعور کی دنیا میں جیسے جھٹکے لگ رہے تھے، زلزلہ آرہا تھا، اندر الٹا ہر آرہے تھے، سوچ کے نئے نئے راستے سامنے آرہے تھے جن پر وہ کبھی نہیں گزرا تھا۔  
”اوئے ہوئے.....! انرا سیپا ہے۔ اب کیا ہو گیا ہے ٹیکسی کو.....؟“  
یہ ٹیکسی کو لگنے والا دوسرا جھٹکا تھا۔ شنو کا تو خیال تھا مسخرہ ڈرائیور جان کر ٹیکسی خراب کر رہا ہے۔

”کیوں جی.....! اب کیا ہوا ہے.....؟“  
”اس میں میرا کیا قصور ہے.....؟ ٹیکسی کو جھٹکے لگتے ہیں، گرم ہو جاتی ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔  
اللہ اللہ کہ ٹیکسی شارٹ ٹھیک ہوئی، ڈرائیور ٹیکسی چلانے لگا پھر صین شہر کی بڑی مسجد کے سامنے ٹیکسی کو روکا۔

اللہ اللہ کہ شرجیل کا سر زور سے پیچھے لگا۔  
”یا اللہ.....!“ بے ساختہ شرجیل کے کیوں سے نکلا پھر اس کی نظریں گیٹ سے اندر جاتے نمازیوں پر جم گئیں۔ دماغ میں فرار کے طرح طرح کے طریقے آرہے تھے مگر ناکامی کا بھی خوف تھا کہ اچانک اس کی نظریں داخلہ پر پڑیں جو اس روز سے مسجد میں تھے۔ انہوں نے عہد کیا تھا کہ وہ تب تک اللہ کے گھر میں بیٹھے رہیں گے تب تک اللہ ان کا بیٹا ان کو دوبارہ نہ لوٹا دے۔ کلین شیو چہرے پر اب داڑھی خوب چر رہی تھی مگر شرجیل نے ان کو پہچان لیا۔

”پاپا.....!“

...



”اوہ سوری.....! دیری سوری.....!“ ٹکرانے والی لڑکی تھی۔ اس نے معذرتی الفاظ کی ادائیگی کی۔ اس کا نیچے گرا ہوا موبائل اٹھا کر اسے دیا۔ لڑکی مہذب اور تعلیم یافتہ لگ رہی تھی۔ تب ہی نہ صرف اپنی لڑکی کی بلکہ موبائل بھی اٹھا کر اسے دیا اور نہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ڈھیروں صلواتیں سناتی کہ لڑکی سے لطف کیا ہے۔ لڑکی نے لڑکی کو کھڑی کھڑی سنانے کا سوچ رہا تھا لڑکی کے عمدہ اخلاق، عمدہ شرمندہ ہو گیا۔ اس نے سوچا چونکہ لڑکی نے اتنے عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے تو اسے بھی مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اخلاق کا۔

”نو پرابلم.....! یو آر ویلکم.....! آپ مجھے دس ٹکریں مزید مار سکتی ہیں۔“ لڑکی چوکی۔

”واٹ.....!“ لڑکی نے بغور اسے دیکھا اور مزید چوکی اور جس بات پر وہ چوکی تھی اسی بات پر شہرام نے چونکا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جس کو اس روز دیکھا تھا مگر وہ پارک تھا یہ گھر ہے اور یہاں وہ مہمان کی شہادت ہے۔ وہ کچھ پریشان ہو گیا مگر لڑکی پر سوچ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے خیال سے آپ کو کہیں دیکھا ہے.....؟“

لڑکی جس کا نام ردا تھا محسن صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور مستقل سوچ رہی تھی کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

”نوںو.....! آپ نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہوگا تو خواب میں کیونکہ لڑکیوں کے خوابوں پر ہے میری راء اور میں اسی پر.....“

”بس یاد آ گیا.....!“ ردا کو سارا منظر یاد آیا تو ساتھ ہی چہرے پر تان آ گیا۔

”آپ کو کچھ یاد نہیں آیا نہ آنا چاہیے اور میں ہرگز بھی وہ نہیں ہوں جو آپ کو پارک کے باہر ملا تھا، میں آپ کو تنگ کیا تھا، جس نے آپ کی گاڑی کے چاروں پہیوں کی ہوائ نکال دی تھی۔“

”یوفول مین.....! یہاں تک آئے کیسے.....؟“ ردا کو شدید تان آ گیا۔ وہ تو یہی سمجھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا آنا پھاڑ ہو کر یہاں تک آ گیا مگر چونکہ آج شہرام اپنی فیملی کے ساتھ آیا تھا لہذا ردا آیا۔

”اجی.....! فقیر نظر آتا ہوں مگر ہوں نہیں، وہ دیکھئے اس گاڑی میں آیا ہوں۔“ شہرام نے اپنی لینڈ کرائز کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کی سواری کوئی بھی ہو مجھے کیا.....؟ آپ میرے گھر میں داخل کیسے ہوئے.....؟“

”جی.....! یہ کیا ناں مردوں والا سوال، آپ کے چپا شکر ہے خاصے عقل مند واقع ہوئے ہیں جن کو معلوم ہے کہ کھڑکیوں اور روشن دانوں سے داخل ہونے والے کی ٹانگیں جسم سے بے دخل ہو جاتی ہیں۔ لہذا انہوں نے آمدورفت کے لیے گھر میں ڈھیر سارے دروازے بنا چھوڑے ہیں۔ میں انہی دروازوں سے اندر آیا ہوں۔“

”اوہ.....! بس..... تم وہ ہو لیکن تمہیں میرے گھر آنے کی جرأت ہوئی کیسے.....؟“

”ایسے.....!“ شہرام نے مسکرا کر کہا، آگے بڑھا اور گیٹ کھول کر اندر کی جانب بڑھا۔ ردا بھی اس کے پیچھے بھاگی۔

”اسٹاپ!.....! خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو.....“

”اوہ سوری.....! دیری سوری.....!“ ٹکرانے والی لڑکی تھی۔ اس نے معذرتی الفاظ کی ادائیگی کی۔ اس کا نیچے گرا ہوا موبائل اٹھا کر اسے دیا۔ لڑکی مہذب اور تعلیم یافتہ لگ رہی تھی۔ تب ہی نہ صرف اپنی لڑکی کی بلکہ موبائل بھی اٹھا کر اسے دیا اور نہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ڈھیروں صلواتیں سناتی کہ لڑکی سے لطف کیا ہے۔ لڑکی نے لڑکی کو کھڑی کھڑی سنانے کا سوچ رہا تھا لڑکی کے عمدہ اخلاق، عمدہ شرمندہ ہو گیا۔ اس نے سوچا چونکہ لڑکی نے اتنے عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے تو اسے بھی مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اخلاق کا۔

”تاج دین.....! صاحب کو عزت سے اٹھا کر باہر پھینک دو۔“

”دائی بی بی.....! خانہ کیا کرتا، اے یہ تو مہمان لوگ ہیں، ابھی آئے ہیں اور اندر بڑی بی بی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ تاج دین نے شہرام کا تعارف کرایا تو وہ غصے سے اس کی طرف گھومی۔ وہ شوخی سے مسکرایا۔

”آداب عرض.....! بندے کو اگر آپ بندہ سمجھیں تو شہرام خرم کہتے ہیں۔“

”واٹ.....! آئی ڈونٹ بی لیواٹ.....! کہ خرم انکل جیسے اسمارٹ اور ڈسٹنک بندے کے بیٹے ہیں۔ آئی ڈونٹ بی لیو.....!“ ردا کو واقعی یقین نہیں آرہا تھا۔

”میں خرم انکل کا بیٹا ہوں اس بات کا آپ کو یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا.....؟“

”کم از کم بندہ اور زیادہ سے زیادہ انسان بننا پڑے گا۔“ وہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

”اتنی کڑی شرط.....؟ ویسے ایک ریکوسٹ ہے آپ سے کہ آج اور اس فرسٹ میننگ میں جو ہوا وہ آپ تک ہی رکھیے گا۔ میری فیملی کے سامنے میرا اشتہار لگانے سے گریز کیجئے گا۔“ شہرام کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر ردا نے جی، سفینہ کے سامنے کچھ کہہ دیا تو خوب ریکارڈ لگے گا اس کا۔

”میں آپ کی پابندی نہیں کرتی مجھے آپ کے مشورہ پر چلنا ہوگا، آپ کے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔“

”کرنا تو پڑے گا، وہ میرا مطلب ہے اندر جانے کے لیے دروازہ تو کھولنا پڑے گا ناں، رائٹ.....!“

”اوہ اچک کر آگے بڑھا اور اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”ارے بیٹا ردا.....! آج بھی چکو، مہمان کتنی دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔“

جیسے ہی دروازہ کھلا سامنے مسز محسن کھڑی تھیں۔

”یہ.....! یہ آپ کی مٹی ہیں، آئی ڈونٹ بی لیواٹ.....! بالکل چھوٹی بہن لگ رہی ہیں۔“ شہرام نے ہنسی بھر کر رقیہ بیگم کو دیکھ کر کہا تو ردا چونک کر پلٹی۔

”میری چھوٹی بہن.....؟“

”جی نہیں.....! اپنی بڑی بہن کی چھوٹی بہن، آداب آنٹی.....! میں ہوں شہرام خرم اور یہ آپ کی بیٹی ردا، آئیے ناں ردا.....! چلئے اندر۔“

شہرام شوخی سے ردا کی تیوریوں کو دیکھتا آگے بڑھا۔ مسز محسن شہرام کی بات پر مسکرا دیں۔

”تمہاری دادو بالکل درست تمہاری تعریف کر رہی ہیں۔“ انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔

”جی.....! وہ محبت ہے ان کی۔“

وہ ان دونوں کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔ ردا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ خود کلامی کر رہا تھا۔ وہ سر ہلاتی آگے بڑھ گئی۔ شہرام سارا وقت گھبراتا ہی رہا کہ کہیں ردا پہلی ملاقات والا پول نہ کھول دے اور اس کی اسی گھبراہٹ کو







اللہ اس پر ڈالی۔ عجیب سے، انجانے سے ملاں نے اسے اور حسین بنادیا تھا۔

”خالی ڈبے بھی بچتے ہیں، حیرت ہے۔“ اس نے ردا کو چوٹ کی تھی، ردا بھی سمجھ گئی تھی مگر آپ سیٹ تھی، پھر کسی سی باتیں ہوئیں، مل کر خوشی کا اظہار ہوا، آنے جانے کا عہد لے کر دونوں فریقین جدا ہو گئے۔

”ردا بہت پیاری لڑکی ہے بھئی! مجھے تو بے حد پسند آئی ہے۔“

”دادو! مجھے بھی۔“ شہرام باہر سے آکر ان کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔

”بھائی! اول پر ذرا قابو رکھیے گا کیونکہ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے.....“ وہ آدمی بات کہہ کر چپ ہو گئی۔

”کیا اسے.....؟ ہاں.....! کیا اسے.....؟“ شہرام لڑا کا انداز میں سنی کی طرف بڑھا۔

”اسے جو کچھ قطعاً پسند نہیں۔“ لیلیٰ نے اس کے کان بھینچے۔

”لیکن اسے بتا دیجئے پچھو.....! کہ مجھے جو کرنی بہت پسند ہے۔“

”دیے اچھی تو شانو بھی ہے۔ شہرام.....! کیا خیال ہے.....؟“

”تو یہ کرو لیلیٰ! کیسی باتیں کرتی ہو.....! کا وہ جتنی بھی خوبصورت ہو، ہے تو ملازمہ ہی ناں، تو میں اپنے

لے کے لیے کسی ملازمہ کو پسند کروں گی.....؟“

قریب سے گزرتے خرم کے دل میں ایک ٹیس بٹا بھری۔ انہوں نے ماں کو افسردگی سے دیکھا جنہوں

اپنی بات جاری رکھی ہوئی تھی۔

”ارے.....! مجھے تو ردا ہی پسند آئی ہے اور دیکھنا اس ردا ہی کو اپنی بہو بناؤں گی۔ ماشاء اللہ چاند سورج

کا بڑی رہے گی۔“

”ہائے اللہ دادو! کیسی باتیں کر رہی ہیں.....! مجھے تو شرم آرہی ہے۔ پلیز میرے سامنے تو شادی کی

اہمیت کریں۔ ویسے آپ اپنی بات جاری رکھیں میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں۔“

شہرام نے دونوں کانوں پر کٹن رکھ لیے۔

”بیٹا! کان ایسے نہیں ایسے بند ہوتے ہیں۔“ خرم نے بڑھ کر اپنی انگلیاں اس کے دونوں کانوں میں

دیں تو وہ درو سے چیخ پڑا۔

• • •

”کیسے ہیں وہ اب.....؟“ غزین آفاق آج کئی دنوں بعد کالج آیا تھا۔ اسد نے بڑھ کر پوچھا تو اس نے

مگرٹ کا گہرا کش لے کر گویا اتنے دنوں کا غبار آزاد فضا میں پھیلا دیا۔ پھر ایک طائرانہ سی نظر سارے کالج پر

ال۔ ہر طرف زندگی مصروف عمل تھی۔

”ہوں.....! اب تو بہت بہتر ہیں۔ معلوم ہے ذرا ہوش آیا تو لڑکھڑاتی زبان میں بولے تم میری زندگی

بہتر ہے.....!“

ایک سایہ غزین کے چہرے پر پھیل گیا، لہجہ زہر خند ہو گیا، پھر دوسرا کش لے کر اس نے بات جاری رکھی۔

اسد اسے بغور اسے دیکھتا رہا۔ کتنا الجھاؤ تھا اس کے وجہ چہرے پر، سوچوں کا جال بچھا تھا وہ بہت اکیلا اور تنہا

طبقاتی فرق میری عمر ہی یہ تھیں۔ یہ کہیں درج ہے کہ اگر کوئی عرب ہے تو اس کا کوئی حق نہیں.....؟ کال کرنا

ہاں ملازمت کر کے روزی کمار ہا ہے تو اس کا زندگی کی خوشیوں اور عزت پر اس کا کوئی حق نہیں.....؟ کال کرنا

بیٹا ہوتا تو میں شانو کو ضرور بہو بناتی۔“

رقیہ بیگم کے جواب پر اک سایہ سا خرم کے چہرے پر سے گزر گیا۔ لیلیٰ نے اسی وقت بھائی کو دیکھا

گہرا سانس لے کر ٹیس پر آ گئے۔ محسن صاحب اس وقت کسی کا کوئی فون سن رہے تھے۔ خرم دل کا

سفیدے کے درخت کی اوٹ سے جھانکتے پورے چاند کو دیکھنے لگے تھے۔

”بھائی! میں جانتی ہوں ممانے آج یا دل کی راکھ کرید کر زخم ہرے کر دیئے ہیں۔“ لیلیٰ نے خرم

شانے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ دیا۔

”مما کی سوچ کیسی ہے لیلیٰ! نہ رت بدلتی ہے نہ موسموں کی آمد و رفت کوئی تبدیلی لاتی ہے۔“

کی سوچ کا سورج ڈھلا نہیں، وہی سوچوں کی تیز دھوپ کہ خشکی میں بھی جلا کر رکھ کر دے۔“ دل کا دروازہ

کی ویرانیاں لیے خرم کے لہجے میں در آیا۔ ماضی کے آئینے میں مومی اور خود کو بے بسی کو قید میں دیکھ کر زخم

ہرے ہو گئے۔ پھر دونوں بہن بھائی کتنی ہی دیر چپ چاپ کھڑے چاند کو دیکھتے رہے۔

”ارے بھئی خرم.....! آپ بہن بھائی یہاں کیوں چلے آئے.....؟ خیریت تو ہے ناں.....؟“

محسن ان کے پیچھے چلے آئے تو دونوں چونک کر ماضی سے لوٹ آئے۔

”یونہی پورے چاند کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔“

”یہ بات تو ہے۔ پورے چاند کی اپنی ہی بات ہے۔ آئے کھانا لگ چکا ہے۔“ شہرام اپنی بیٹی

خفا تو تھا ہی اب ردا سے بھی خفا ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو ان دونوں کے ساتھ مل گئی تھی۔ تب ہی وہ چکر لگانا

تھا۔

”ارے شہرام.....! آپ کیوں چلے آئے.....؟ کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”کیوں.....؟ آج مجھ پر ہاتھ صاف کیے جائیں گے کہ میرا انتظار ہو رہا ہے.....؟“

”بھائی! کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟ اندر چلئے۔“

”ردا! تمہارا فون ہے جلدی آؤ۔“ اس سے قبل کہ سنی ردا سے کچھ کہتی، شانو بھاگتی ہوئی آئی اور فون کی

اطلاع دے کر بھاگ گئی۔ ردا بھی تیزی سے چلتی لاؤنچ میں پہنچی جہاں فون ہولڈ پر تھا۔

”ہیلو.....! اوہ.....! تو یہ آپ ہیں.....؟ کہہ دیا ناں میں نے آپ سے، مت فون کیا کریں آپ

یہاں، میں خوش ہوں یا نہیں آپ کو غرض نہیں ہونی چاہیے، جیسے دیں اب تو سکون سے مجھے۔“

غصے میں ردا نے خدا حافظ کہے بغیر ہی ریسیور ہنج دیا۔ غم و غصے سے عجیب سی حالت اور شکل ہو رہی تھی

اس لیے وہ اندر ہی نہیں گئی پھر جب کھانے کے بعد وہ لوگ جا رہے تھے تو وہ بھی باہر آ گئی۔

”بیٹا! آپ نے ہمارے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھایا.....!“

کسی اور نے اس کی کمی محسوس کی تھی یا نہیں البتہ خرم نے اسے ضرور مس کیا تھا۔

”جی.....! بس یونہی ذرا سر میں درد تھا۔“ پھکی سی مسکراہٹ کو اس نے ڈھال بنایا تو شہرام نے اک گہری



لگ رہا تھا۔

”یار.....! کوئی ایسا دیوانہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کو زہر کے جام میں ڈبو دے اور پھر قطرہ قطرہ اس جام میں اٹھیل کر انجوائے کرے اور انہوں نے مجھے اپنی زندگی کہا اور زندگی کو زہر کے جام میں ڈبو کر اب انجوائے رہے ہیں۔ لیکن اب نہیں.....! اب تو وہ ہوگا جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔“

غزین نے آدھا سگریٹ پاؤں تلے یوں پکلا جیسے کوئی تلخی پکھل رہا ہو۔  
”سلام پاجی.....! تسی کتھے ہو جی.....؟ ایسے دنوں تو قسم نال لوکاں نے بڑا یاد کیا اے تانوں۔“  
کھڑا غزین کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگا تو غزین نے بائیں پھیلا کر اسے ساتھ لگا لیا۔ شاید اس کی پسندیدگی کی یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ انسانوں میں کسی قسم کے فرق کا قائل نہیں تھا۔

”اچھا.....! آلوکاں نوں چھڈتوں وی یاد کیتا سی کہ بس اپنی چھنوںوں ہی یاد کرداریاں اس.....“  
”اوہ چھڈو پاجی.....! چھنوںوں گولی مارو۔“

پھر وہ کھڑے سے اسی طرح ہنسی مذاق کرتا رہا۔  
”شکر ہے یار.....! تم آئے۔ تمہارے بغیر تو کالج بالکل سونا اور ایران لگتا تھا۔“  
”ارے غزین.....! تم آگئے.....؟ شکر ہے۔ تمہارے بغیر کالج پیکا پیکا سا لگ رہا تھا۔“

وہ لڑکے اور لڑکیوں میں یکساں مقبول تھا۔ وہ تھا ہی ایسا کسی کو ڈکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کوئی بچہ نہ اپنے دوسرے کے آنسو پونچھنے سب سے پہلے پہنچ جاتا، کسی مستحق کی مدد اس طرح کرتا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔  
”بس.....! بس کرو یار.....! میں تو اتنی محبت پر خوش تھی کا شکر ہونے لگا ہوں۔“  
”محبت خوش فہمی نہیں ہوتی غزین.....!“ ماریہ غزین کو پسند کرتی تھی مگر اس حقیقت سے بھی باخبر تھی کہ اس کے چاہنے والوں کی لسٹ میں نہیں ہے۔

”محبت خوش فہمی ہی تو ہے ماریہ.....! اک خوش کن گمان جھامرت بن کر زگوں میں اترتا ہے اور زہر بن کر کاٹنے لگتا ہے زگوں کو خیر چھوڑو، تم نہیں سمجھو گی۔“  
پھر کتنی دیر وہ اپنے دوستوں سے باتیں کرتا رہا مگر بار بار متلاشی نگاہیں ناکام لوٹ رہی تھیں۔ تب اس نے اسد کی نظر چرا کر وردہ کے موبائل کا نمبر ملایا اور میسج سینڈ کر دیا۔

”آئی مس یو الاٹ وردہ وجاہت.....! جس طرح میں اذیت ناک زندگی جی رہا ہوں ناں وردہ وجاہت.....! اس سے زیادہ اذیت ناک تمہاری زندگی نہ بنا دی تو کہتا۔“ میسج سینڈ کر کے غزین نے سختی سے ہونٹ بھیجنے۔

”غزین.....! تو اس کا مطلب ہے موصوف کالج واپس آگئے ہیں۔“  
لاہری سے نکلنے ہی میسج کی پیپ ہوئی تو اور اب اس کا میسج سارے بدن میں کرنٹ بن کر دوڑ گیا۔  
”ویسے تم ہو بڑی ناشکری، اتنا خوبو، ڈشنگ بندہ تمہارے پیچھے مرا جا رہا ہے اور تم گھاس نہیں ڈالتیں اے.....؟“

”شٹ اپ نا جیہ.....! اب کوئی اسٹیپ لینا پڑے گا ورنہ یہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ یہ دیکھو پھر وہی ہے۔“

لوہ کی بات ابھی جاری تھی کہ پھر موبائل پر غزین کا نمبر آ گیا۔

”ڈنٹ وری ڈارلنگ.....! میں ہوں ناں ابھی اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر تمہاری آنکھوں میں سجاتی ہوں۔ اوکے اوکے.....! جسٹ جوک یار.....!“

ناجیہ اس کی گھر کی کے ساتھ اٹھا ہوا ہاتھ دیکھ کر چپ ہو گئی۔ اگلے دنوں پیریڈ فری تھے۔ اس کے بعد تمام پیریڈ تھا جو مس نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ ناچا جتے ہوئے بھی دونوں کیفے ٹیریا آ گئیں، سامنے ہی غزین اگال دوستوں میں گھرا ہوا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سب اپنی اپنی کلاس لینے چلے گئے۔ غزین کا قلعی کوئی موڈ نہیں تھا۔ سستی سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا، دوسری پر ناٹکیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس نے دور سے وردہ کو آتے دیکھا جس کا قدم لکڑ کے تھے اسے دیکھ کر مگر پھر اندر سے کسی نے ہمت دلائی تو وہ آگے بڑھی اور کچھ فاصلے پر آ کر بیٹھ

”اوکھڑے.....!“

”جی جی آکھاں پاجی.....! صحت ہے ہوواں۔“ کھڑا تو جان بھٹلی پر لیے پھرتا تھا غزین کے لیے۔  
”اوچن دے ٹوٹے.....! ذرا اوگنا تھرتھنا۔“ وردہ کو سنانے کے لیے غزین نے بلند آواز میں کہا تو کھڑے نے پہلے شرما کر اپنے پیلے دانت نکالے پھر کلا صاف کیا اور لگا اپنی بھونڈی آواز سے ماحول کو بیزار کرنے۔

”چاہے ہمیں تم اپنا لو، چاہے ٹھکرا دو ہم کو، ہم تو پیار کرتے ہیں..... جی آکھیا ہے کہ دُنیا اسان پے مرقی، اسان کسی پے مرقا ہے۔“

”واہ واہ کھڑے میاں.....! خوش کیٹا ای، ہنوڑ میں تینوں سداواں.....؟“ غزین نے جیب سے دوسرے لوٹ نکال کر کھڑے کے ہاتھ پر رکھے تو وہ سو جان سے اپنے نخی پر نثار ہو گیا۔ غزین کھڑا ہو گیا، گرے ٹی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا مگر وردہ کے لیے وہ اتنا ہی غیر اہم تھا جتنی اس کی حیثیت اور حیولیت۔ غزین چند قدم اور قریب آ گیا، ایک ہاتھ میں کھڑے کا ہاتھ تھا دوسرے میں اسد کا، وہ گنگنانے لگا۔ وردہ نے گھور کر دیکھا تو حیرت آداب عرض والے انداز میں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر شروع ہو گیا۔

”چاہے ہمیں تم ٹھکرا دو یا اپنا بنا لو، تمہیں ہم پیار کرتے ہیں..... زمانہ ہم پہ مرتا ہے، ارے ہم تم پر مرتے ہیں۔ کھڑے جی مکرر ارشاد اے۔ زمانہ ہم پہ مرتا ہے، ارے ہم تم پر مرتے ہیں۔“

اس کی خوبصورت بوجھل آواز کے سحر کو ناجیہ نے تو دل کھول کر سراہا یہ الگ بات کہ وردہ کے خوف سے منہ مالتی رہی۔

”واہ جی.....! تسی تے میرے نالوں وی سوہنا گاتے او۔“  
”اچھا.....! تے چل فیر اسی خوشی میں چاء پلا اپنی باجیوں نوں۔“  
غزین کا انداز، باتیں وردہ کو جلانے ہی کے لیے تو تھیں جن میں وہ سو فیصد کامیاب ہو گیا۔ وردہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی، تیزی سے آگے بڑھنے لگی تو کرسی کی ٹھوک سے گرنے لگی۔

”ماں صد تے.....! لگ گئی ناں نظر.....؟ نظر کا ٹیکہ لگا کے نکلا کرو۔“ غزین جلدی سے اسے تھامنے کے



لیے آگے بڑھا تو وہ کھول گئی۔

”مسٹر غزین.....! اپنی اخلاقیات کا دائرہ اپنے حلقہ احباب اور کھڑے تک رکھیے۔“

”کیوں جی.....؟ آپ کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں.....؟“ وہ کرسی پر پاؤں رکھ کر اس کی جانب

جھکا، دل جلانے والی معصومیت طاری کیسے پوچھ رہا تھا۔

”جی نہیں.....!“ وہ دھاڑنا چاہتی تھی مگر ارد گرد کو دیکھ کر دبی دبی آواز میں بولی۔

”اچھا تو یوں کہیے ناں.....!“ غزین نے اس کو آنکھ دبا کر دیکھا اور موبائل کیسرہ سے وردہ کی تصویر

بھری تصویر کھینچ کر محفوظ کر لی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے.....؟“ وردہ کھول کر رہ گئی اور موبائل لینے کے لیے اس پر جھپٹی تو غزین نے اس کی

نازک کلائی مضبوطی سے تھام لی۔

”یہ بد تمیزی نہیں مس وردہ وجاہت.....! موبائل کیسرہ ہے جس میں میں ہر لمحہ خدا جانے والی چیز کو صرف

اپنے لیے قید کر لیتا ہوں۔“ غزین نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی کلائی ابھی اس کے ہاتھ

میں تھی۔ ناجیہ تیزی سے آگے بڑھی، غم و غصے اور ندامت سے وردہ کا پہرہ سرخ ہو گیا، ہونٹ بھیجنے ہوئے تھے۔

”لیو مائی ہینڈ.....!“ وردہ نے دانت پیس کر کہا۔ احساس تو ہین گرم پانی کی صورت ٹپ ٹپ بند ہوا

رخساوں پر پھیل گیا، تکلیف سے زیادہ اسے ندامت ہو رہی تھی۔

”غزین آفاق.....! یہ کیا بد تمیزی ہے.....؟ اپنے ہی فیلوز کے ساتھ اس قسم کی بد تمیزی کا کیا مطلب

ہے.....؟ چھوڑو وردہ کا ہاتھ۔“ ناجیہ بھی قریب قریب روہینے کوئی۔ اس نے غزین کے ہاتھ سے وردہ کا ہاتھ

کھینچا۔

”غزین.....! پلیز.....!“ اس نے صورت حال کو بگڑنا دیکھ کر غزین کے شانے پر معنی خیز دباؤ ڈالا تو اس

نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی یوں چھوڑی کہ وہ گرتے گرتے پڑی۔ اس کی کلائی پر غزین کی انگلیوں کے واضح

نشان ابھر آئے تھے۔ وردہ اس وقت شدید غصے میں تھی۔ وہ غزین کے منہ لگانا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ اس کی

طرف بڑھی۔ غزین سینے پر ہاتھ باندھے گہری نظروں سے وردہ کو دیکھتا رہا۔

”مسٹر اسد.....! آپ اپنے جنگلی دوست کو سمجھا دیں کہ اگر کالج میں رہنا ہے تو انسان بن کر رہیں۔“

میری ایک شکایت پر یہ کالج سے نکال دیا جائے گا۔“

غصے کی شدت سے لہجہ انتہائی سرد اور دبا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کوئی بات کرتا غزین جس کو اس جملے

سے کرنٹ لگتا تھا، بازو سے اس کو پیچھے ہٹاتا آگے بڑھا۔

”اوکے.....! میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ جاؤ اور میری شکایت کرو لیکن کہو گی کیا کہ میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا

یا موبائل پر تمہاری تصویر اتاری.....؟ گو ہیڈ، جو چاہے الزام لگا دو لیکن یاد رکھو اگر تم مجھے نکلوانے میں کامیاب نہ

ہوئیں تو پھر میری ٹرن ہوگی یہ کام میں کروں گا، اوکے.....! اینڈ آئی مین اٹ.....!“ غزین نے مضبوط کٹیلے لہجہ

میں کہا تو ایک زور کا جھٹکا تو وردہ کو بھی لگا۔ ناجیہ تو کانپ اٹھی تھی کیونکہ ان تین سالوں میں اندازہ تو ہو ہی گیا تھا

کہ وہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

”ہیلپ.....!“ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ کچھ جوئیر لڑکے لڑکیاں چندا جمع کرنے آگئے۔ غزین نے

ان کے دونوں لڑکیوں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔“

”تھینک یو غزین بھائی.....! ہیلپ وردہ.....!“ اب وہ لوگ وردہ کی طرف مڑے جس کے اندر ٹوٹ

اٹا ہوا رہی تھی۔ وہ ہو جانے والی انہونی کے اثر میں ابھی تک تھی۔

”ہیلپ پلیز.....!“ لڑکیوں نے وردہ کا شانہ ہلایا تو غزین نے بڑھ کر ایک اور ٹوٹ ان کی پلیٹ میں

رکھ دیا۔ سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں کچھ اس انداز میں اُڑایا کہ وردہ کے چہرے پر پھیل گیا۔

”یہ لو بچو.....! کسی ایسے بندے سے جو خود مستحق ہو، کچھ مانگ کر اسے شرمندہ نہیں کیا کرتے۔ جاؤ

لاماش.....! یہ ان کی طرف سے۔“ غزین کا انداز ہی آگ لگانے والا تھا، وردہ سلگ اٹھی، اس نے اس کے

کامیاب ہونے پر ٹوٹ پھاڑ کر فضا میں اُچھال دیا اور اپنے بیگ سے پیسے نکال کر ان کو دے دیئے تو وہ چلتے بنے۔

وردہ تو غور انداز میں غزین کی طرف پلٹی۔

”آئندہ میرے ہر معاملے سے دور رہنا مسٹر غزین.....!“

”ہوں، اچھا.....! کتنا دور.....؟ کتنی کر بتاؤ گی کہ ناپ کر بتاؤ گی.....؟ بھی.....! حد فاضل بھی تو تم نے

بیمنی ہے ناں تو بیانش بھی تم ہی.....“

”شٹ آپ.....!“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولتی آگے بڑھ گئی تو غزین کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا

کیا۔ جب اس نے اس کے موبائل کا نمبر ملا دیا۔

”اس کا کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا نا جیہ.....! میں نے تو سوچا تھا کہ چلو دو سال رہ گئے ہیں مگر کیا کروں.....؟

کس سے کہوں.....؟ کس کو بتاؤں.....؟“

کلاس میں آ کر اس کا نمبر دیکھ کر وہ شدت سے رو دی۔ اپنے طور پر تو اس نے اب تک معاملے کو سنبھالا ہوا

تھا مگر بات بڑھ رہی تھی تو لامحالہ اسے شہلا سے بات کرنا پڑتی اور وہ تو کبھی ایسی کوئی بات گوارہ نہ کرتیں فوراً کالج

بہل سے شکایت کرنے پہنچ جاتیں اور غزین کوئی معمولی چیز تو نہیں تھا کہ اس کی شکایت پر کالج سے نکال دیا

جاتا۔ جو ادا ایک تو چھوٹا تھا دوسرا بہنوں کے معاملے میں بہت جذباتی بھی، وہ کچھ بھی کر گزرتا۔

”ارمغان.....! ہاں.....! ارمغان سے بات کی جا سکتی ہے۔“ یہ خیال جیسے گھپ اندھیرے میں کرن

بن گیا۔

”وردہ.....! یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ غزین سب کے لیے تو اتنا اچھا ہے تمہارے ہی ساتھ کیوں ایسا

ہے.....؟ اگر پسند و غیرہ کا چکر ہوتا تو بھی اس طرح کوئی نہیں کرتا۔“

ناجیہ خوفزدہ ہو گئی تھی آج کے واقعے سے جبکہ وردہ تو بری طرح کھول رہی تھی۔

”چکر کوئی نہیں، بگڑا ہوا نہیں ہے، سمجھتا ہے پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ میں آج ہی ارمغان

سے بات کرتی ہوں۔ ماشاء اللہ میرے سارے بھائی مل کر اس کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ سارا ہیر وازم بھول

جائیں گے موصوف۔“

باتیں کرتے دونوں باہر آ گئیں۔ اسی وقت ارمغان کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو وردہ خوش ہو



گئی۔ گاڑی لاک کر کے وہ انہی کی طرف آگیا۔

”کیا ہوا.....؟ علیزہ نہیں آئی تمہارے ساتھ.....؟ میں نے کہا تھا اس کو بھی لے آتے تو یہیں۔“  
شاہنگ کے لیے چلے جاتے۔“ یہ پروگرام طے ضرور تھا اور ارمغان نے جب علیزہ کو ساتھ چلنے کو کہا تھا تو اس کے جواب نے اسے اندر تک توڑ دیا تھا اور اس وقت بھی اسی کرب کے زیر اثر تھا۔

”جس دن وہ تمہاری پناہ بہن علیزہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی ناں تو اسے یہاں تھوڑی لے آؤں گا۔“  
اسے لے کر خواب نگر کو اڑ جاؤں گا، خیر یہ بتاؤ غزین آفاق آیا ہے ناں.....؟“ ارمغان نے دائیں بائیں نظریں گھمائیں تو وردہ خوش ہوگئی۔

”یہیں ہے بدتمیز آدمی لیکن سنو.....! تم اکیلے میں اس سے بات نہ کرنا۔ عدیل، یا سر کو بھی ساتھ لے آ اور پھر لینا اس کی خبر۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو.....؟ میں تو اسے شادی کا رڈ دینے آیا ہوں۔“

”غزین کو شادی کا رڈ دینے آئے ہو.....؟“ وردہ خود کو اس دھماکے میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ وہ اس خوش فہمی میں تھی کہ اس کے بھائی اس کی خبر لیں گے، وہ اسے شادی کا دعوت نامہ دینے آیا تھا۔

”ہاں.....! ارے.....! بہت اچھا لڑکا ہے، وہ اس روز جو ہمارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس کے بعد غزین ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا۔ کئی بار وہ ہمارے گھر بھی آیا ہے، سب سے اس کی بہت اچھی دوستی ہے اور ہم اسے شادی میں شرکت کا دعوت نامہ دے رہے ہیں۔ ادھائے غزین.....!“

اسے حیرت اور پریشان میں غرق کر کے ارمغان سامنے سے آتے غزین کی طرف بڑھا۔ مگر وردہ دونوں کو بغل گیر ہوتے دیکھا تو اسے لگا وہ جہاں تھی وہاں جہاں ہے۔

”یہ کیا ڈرامہ ہے.....؟ لگتا ہے یہ شخص پوری پلاننگ کے ساتھ ہماری جڑوں میں اتر رہا ہے۔ لیکن مسٹر غزین.....! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ غزین نے اول درجہ کا، نجانے کیسے ہمارے اندر کھس گیا.....؟ اور یہ ارمغان کے بچے کو تو دیکھو، کیسے بچھا جا رہا ہے۔“

وردہ کو ارمغان اس وقت زہر لگ رہا تھا۔ وہ واقعی غزین سے بہت محبت سے مل رہا تھا۔  
”ارے.....! تم کیوں راکھ ہو رہی ہو.....؟ یہ بد اخلاقی، بے مروتی، تنگ نظری، یہ جملہ بیماریاں ہم مورتوں کی ہیں ورنہ یہ مرد ذات بہت وسیع نظر اور کھلے دل کے ہوتے ہیں۔ دیکھتی نہیں یہ سب لڑکے روز ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بغل گیر ہو کر اس طرح خوشی سے ملتے ہیں گویا صدیوں بعد ملے ہوں۔“

ناجیہ نے اس کے غصے کے شعلوں پر چھڑکاؤ کیا تو وردہ اسے گھورنے لگی۔

”ناجیہ.....! تم اچھی طرح جانتی ہو یہ شخص غزین کوئی عام لڑکا نہیں ہے۔“

”ہیں..... سچ.....! تو مان لیا ناں تم نے بھی اس کی خاصیت کو.....؟“

ناجیہ کی شوخ معنی خیز بات کی گہرائی میں وردہ اتری تو اسے کاٹ کھانے دوڑی۔

”شٹ اپ.....! تم اچھی طرح جانتی ہو یہ غزین ارمغان سے کس چکر میں دوستی بڑھا رہا ہے۔“

”تمہارے چکر میں۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے چکر میں ارمغان سے دوستی بڑھا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا کوئی معاملہ ہو ہی نہ جو تم سوچ رہی ہو۔“ ناجیہ کو اس حد تک غزین سے بدگمانی کچھ بھلی لگی نہیں۔

”ناجیہ.....! میں جانتی ہوں وہ میرے چکر میں نہیں مگر پھر بھی نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے الارٹ رہنے کو کہہ رہی ہے۔“

وردہ کے دل میں انجانے خدشات سر اُبھار رہے تھے اور نظریں غزین پر تھیں جو شخصیت کے اعتبار سے ہی کسی بہت اچھے خاندان کا لگتا تھا مگر اب تک جو اس کے ساتھ اس کا انداز اور رویہ تھا اس کی بنیاد پر وہ بھی سوچ سکتی تھی اور اس سوچ کی دُھند میں غزین اپنی شخصیت کی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ دُھندلا جاتا تھا مگر ناجیہ غزین کے اس انداز کو ہیر وازم سے موسوم کرتی۔



”سچ!...! وردہ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری اس بدگمان چھٹی حس کو ہائی ڈوز ولیم لگا دوں!“  
 تمہیں اتنے ہینڈسم بندے سے بدگمان کرتی ہے۔“  
 ”ناجیہ!...! خیر تو ہے، کہیں تم بہہ تو نہیں گئیں۔“ وردہ نے گویا بدلہ لے لیا۔  
 ”آہ!...! اپنے ایسے نصیب کہا۔“؟ ہی تو خاندان سے باہر جھانکنے کی اجازت نہیں۔ ویسے بندہ  
 بڑا ہی ڈشنگ۔ اگر کبھی زندگی میں اس نے دست سوال بڑھایا ناں تو جھٹ اپنا ہاتھ دے دینا اس کے ہاتھ  
 کہ کچھ شکول بڑے وضعدار ہوتے ہیں زیادہ پھیلے نہیں رہتے۔“  
 ”شٹ آپ!...! اب چپ ہو جاؤ، وہ آرہے ہیں۔ مجھے تو رہ رہ کر ارمغان پر غصہ آرہا ہے۔ دیکھو  
 کیسے بچھا بچھا جا رہا ہے۔ گویا وہ کوئی شہزادہ گلفام ہو۔“  
 ”ہے تو!...!“ اس کی بات پر ناجیہ نے بے ساختہ کہا پھر اس کی نظروں سے بچنے کے لئے اپنی ٹانگیں  
 سامنے کر دی تب تک وہ دونوں قریب آچکے تھے۔ غزین نے بڑی نیکی نگاہ وردہ پر ڈالی تو اس نے بھی ناک بہوں  
 چڑھا کر اس کی نظر کی اہمیت کو بے اہم بنا دیا۔

”او کے ارمغان!...! میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا آنے کی۔“  
 غزین نے خالصتاً وردہ کو سنانے کے لئے ذرا اتر کر کہا تو وہ راگھو گئی۔  
 ”اوہو!...! اتر اہٹ دیکھو جیسے ہماری محفل اُدھوری ہی تو رہ جائے گی ان کے بغیر۔“  
 ”یہ تو ہے!...!“ ناجیہ پھر بے دھیانی میں کہہ گئی تو وردہ نے اب کے گھر کی کے ساتھ زوردار چٹکی بھیج دی۔  
 ناجیہ غزین اور ارمغان کی وجہ سے درد برداشت کر کے رہ گئی۔  
 ”نہیں بھی غزین!...! کوشش نہیں، تم کو ضرور آتا ہے۔ او کے!...! کیونکہ سعود بھائی یعنی دولہا کا اصرار  
 ہے۔“ ارمغان کا اصرار وردہ کو جلا گیا۔ اس نے ارمغان کو گھورا مگر وہ مسلسل غزین کو متاثر کن نظروں سے دیکھ  
 رہا تھا۔  
 ”تھینکس!...! مگر پھر وہی بات کہ۔“ غزین کو جانا تو ضرور تھا مگر اس وقت وہ صرف وردہ کو جلانے کے  
 لئے اپنی اہمیت جتا رہا تھا۔

”ارمغان!...! تم نے کارڈ دے دیا ناں!...!“ وردہ سے نہ ہا گیا تو کھول کر کوئی پڑی۔ اسے غزین کا  
 اہمیت دینا قطعی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔  
 ”ہاں!...! کارڈ تو دے دیا ہے۔“ ارمغان بیچارہ کیا جانے کہ دونوں میں کیا بات ہے کیونکہ آج تک  
 وردہ نے کسی بڑے ہنگامے کے خوف سے گھر کے لڑکوں کو کبھی کچھ بتایا ہی نہیں تھا کہ یہ شخص اسے کتنا تنگ کرتا  
 ہے۔

”کارڈ باقاعدہ دعوت نامہ ہوتا ہے جب وہ دے دیا تو اتنا شدید اصرار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
 اس کے اندر کا سارا غصہ نفرت اس کے لہجے میں ڈھل گئی جسے صرف غزین نے ہی محسوس کیا ارمغان نے نہیں اسی  
 لئے وردہ کی بات پر اس نے اسے گھورا جبکہ غزین نے گہرا سانس فضا میں چھوڑا سینے پر ہاتھ باندھے اور وردہ کے  
 عین مقابل آن کھڑا ہوا۔

”کی انشاء اللہ!...!“

وہ جتنا جتا کر بولتا وردہ پر گہری نگاہ ڈال کر مسکرایا جو بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات  
 ”نادمیرے سے مسکراتا ہوا ارمغان سے ہاتھ ملاتا آنے کا جتا کر آگے بڑھ گیا۔

”کیا ضرورت تھی اس قدر اصرار کرنے کی!...! اول تو بلانے کی کیا ضرورت تھی!...! دوسرا اتنا اصرار  
 کہ گویا وہ نہیں آئے گا تو ہماری شادی نہیں ہوگی!...! تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ کس قسم کا شخص ہے!...! اول  
 ہے کا بد تیز، سمجھ میں نہ آنے والا پراہم، زہر لگتا ہے یہ شخص مجھے۔ آئی ہیٹ ہم اور!...!“

”یہ لفافہ آپ کی فائل سے گرا تھا محترمہ!...!“ وہ جو غصے میں اپنے دھیان میں بولے جا رہی تھی اور سمجھ  
 رہی تھی کہ ارمغان اس کے ساتھ چل رہا ہے مگر ارمغان تو گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ناجیہ گدھے کے سینگوں کی  
 طرح غائب اور ساتھ ساتھ جو چل رہا تھا وہ وہی تھا جس کے خلاف وہ زہر اگل رہی تھی۔ وہ اس کی فائل سے نکل  
 کر ارمغان کی طرف بڑھا رہا تھا جس میں اس نے ہنی کا برتھ ڈے کارڈ خرید کر رکھا تھا۔ اس کو یوں قریب  
 دیکھ کر یکدم یہ خیال گزرا کہ اگر اس نے سب کچھ سن لیا ہے تو کتنا برا ہوگا۔

”کیوں برا ہوگا!...! اچھا ہی ہے سن لیا ہو تو، مجھے اس سے کتنی نفرت ہے، اگر ہیر و بننے کا خواب دیکھ رہا  
 گا تو باز آجائے گا۔“ دماغ کی اس شاباشی نے حسین چہرے پر آئی نا معلوم سی عداوت کی دھند کو صاف کر دیا،  
 اس نے بغیر کسی تاثر بغیر کسی شکرے کے اس کے ہاتھ سے جھٹکے سے کارڈ چھینا اور تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ وہ بھی  
 اسی رفتار سے اس کے ساتھ چلتے لگا۔ وردہ کو یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔  
 ”ہوں!...! تو آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں!...!“ وہ چلتے چلتے تیزی سے اس کے سامنے آ گیا تو وہ جو  
 اسی رفتار سے بڑھ رہی تھی اس سے جا ٹکرائی تو غصہ اور نفرت دو چند ہو گئے۔

”آپ کے وہم گمان سے بھی زیادہ۔“ دانت پیس کر اس نے گویا اپنی نفرت کا اظہار کیا تو غزین کے دل  
 پر جیسے چوٹ سی پڑی۔ مٹھیاں سمجھتی گئیں۔ جی میں تو آیا کہ ابھی اسے اس کی نفرت کا ایسا جواب دے کہ نفرت  
 بھول جائے مگر اس نے اندر اُٹتی آندھوں کو روکا۔

”شاید آپ کو معلوم نہیں وردہ و جاہت!...! کہ جب اتنی شدید نفرت کے بیچ سے محبت جنم لیتی ہے تو اتنی  
 ہی شدید ہوتی ہے جتنی کہ وہ نفرت ہوتی ہے۔ اس لئے نفرت کے اس سفر میں سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہئے جس کی  
 منزل محبت ہوتی ہے۔ او کے!...! دیکھتے ہیں۔“ وہ مسلسل اس کی جان جلا رہا تھا۔

وہ اور اس شخص سے محبت کرے گی، امپا سبل۔ اس نے نفرت اور حقارت کی سلگتی نگاہ اس پر ڈالی اور آگے  
 بڑھنے لگی کیونکہ ارمغان گاڑی اشارت کر چکا تھا۔

”کم آن وردہ!...! کتنا سلو چلتی ہو تم!...!“ ارمغان نے ہانک لگائی تو وردہ کو غصہ آ گیا۔ پہلے اسے  
 تائے بغیر چھلا وہ بن کر گاڑی میں جا بیٹھا اور اسے اس ناپسندیدہ شخص سے الگ ہونا پڑا اور اب اس کی خرگوش چال کو  
 کچھ اچال کہہ رہا تھا۔

”جب ہم سفر ڈشنگ ہو تو سفر ختم کرنے کو کس کافر کا دل چاہتا ہے!...!“ غزین نے کہا ہی اتنی آواز میں



تھا کہ صرف وردہ کی ساتوں تک ہی اس کی آواز پہنچ پائی تھی۔ ارمغان نے کچھ نہیں سنا۔ وردہ سگ کر بکھ کر ارادہ کر کے بٹنی ہی تھی کہ وہ ہاتھ فضا میں بلند کر کے بولا۔

”او کے ارمغان.....! آجاؤں گا، وردہ وجاہت بھی تو فیلوشپ بھاری ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ شادی ضرور آؤں۔“ غزین نے پھر شرارت سے کہا تو وردہ کو لگا وہ جل کر راکھ ہو جائے گی۔

”چلو اچھا ہے ناں.....! اب کم از کم تم فریڈ شپ نہ سہی فیلوشپ بھانے تو ضرور آؤ گے ناں.....؟“ ارمغان ہر بات سے لاعلم تھا۔ اس نے وردہ کی پیشانی پر آئے پسینے کے قطرہوں کا مطلب بھی نہیں سمجھا اور غزین سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”کیوں نہیں یار.....! آنا ہی پڑے گا۔ آخر ہمیں اسی کالج میں پڑھنا ہے۔ اگر یہاں سے نکلوا دیا گیا تو کس کس کو لگوانے والی وردہ گھرے گھرے سانس لے رہی تھی۔ غزین سے انتقام کی آگ نے راکھ کر ڈالا۔

اس کی نظر دروازے کے بچر کے غزین کے ہاتھ پر پڑی وہ چونکہ اسی کی سائیڈ میں کھڑا تھا اور اسی کے دروازے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وردہ نے کچھ بھی سوچے بغیر دروازہ زور سے بند کیا تو غزین کی تینوں بڑی انگلیاں گویا بکلی

تھیں۔ شدت تکلیف سے غزین کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر اس نے برداشت کی حد کر دی۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکلا۔ ارمغان نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کی شدت کی سرخی اذیت اور ہاتھ سے گرنے

خون کی بوندیں وردہ کی آنکھوں میں ٹھہری گئیں مگر اس وقت اتنی غصے میں تھی کہ وہ نہ تو اس کی تکلیف کو اہمیت دے رہی تھی اور نہ ہی خون کی سرخی نے نفرت کی برف پگھلائی تھی۔

”میں پوچھتی ہوں تم نے غزین کو شادی کا کارڈ کیوں دیا.....؟“

کالج گیٹ سے باہر نکلتے ہی جیسے وہ پھٹ پڑی۔ ارمغان نے قدرے حیرت سے اسے اور اس کے غصے سے لال چہرے کو دیکھا۔ وردہ کا یہ رد عمل غیر معمولی تھا اور نہ تو وہ بڑی نرم خواہ فریڈ لی لڑکی تھی۔ غزین کے لئے

اس کا یہ انداز اس بات کا غماز تھا کہ چونکہ دونوں کالج فیلوز ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اختلاف یا نوک جھونک ہو اسی لئے اس نے اس بات کو اہمیت نہیں دی کہ یہ قطعی دور کا لازمی جز ہے کہ اسٹوڈنٹس آپس میں لڑتے جھگڑتے

رہتے ہیں جب ہی اس نے گیر بدلتے ہوئے نظر روڈ پر بھاڑ دیں۔

”ویری سمل.....! تمہارا کالج فیلو ہے۔“

”اگر یہی وجہ ہے اس کو بلانے کی تو میرا تو یہ سارا کالج فیلو ہے، ان سب کو بلاؤ ناں شادی پر، سب کو کارڈ دو اور..... اور جس شخص کے جال میں پھنس کر تم لوگ اس سے دوستی کی ٹنگیں بڑھا رہے ہو ناں معلوم بھی ہے وہ کیا چیز ہے.....؟“

”کیوں نہیں.....؟ وہ ایک اچھا منسا رہندہ ہے۔“

ارمغان نے موڑ کاٹتے ہوئے مزید چڑایا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

”ہونہ.....! وہ اچھا..... جب تم سب کو آلو بٹا جائے گا ناں تب پتہ چلے گا۔“

”چلو.....! ہمیں تو جب وہ آلو بٹائے گا دیکھا جائے گا۔ یہ تم کو اس نے بندر یا سے کیا بتا دیا ہے کہ تم اس

کمالی خلاف ہو گئی ہو۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم.....!“ وردہ نے گاڑی ڈھنگ سے رکنے بھی نہیں دی اور دھڑ سے دروازہ کھول کر باہر

آئی۔ اسی وقت باہر نکلتی علیزہ پر ارمغان کی نظریں ٹھہر گئیں۔

”ہوں.....! بھاڑ میں جانے کو بھی تیار ہوں اگر ہم سفر وہ مہ جین ہو جائے۔“

”یہ مہ جین کون ہے.....؟“ ارمغان کے فرشتے بھی بے خبر تھے کہ عفت بیگم اس کے پیچھے کھڑی ہیں اور

مہ جین انہوں نے سن کر باقاعدہ اس کے کان کھینچتے ہوئے مہ جین کا آنا پتا پوچھا تو وہ بوکھلا گیا۔

”وہ مہ.....! وہ.....! اس کی نظریں ابھی بھی علیزہ پر تھیں جواب اندر جانے کے لئے مڑ چکی تھی۔

”کیا یہ وہ لگا رکھی ہے.....؟ یہ وردہ غصے میں کیوں ہے.....؟ کیا کہا ہے تم نے اس سے.....؟“

”میں نے کچھ نہیں کہا مہ.....!“

”پھر اس کا مہ کیوں آف ہے.....؟“

”فیوز آڑ گیا ہوگا.....! وہ میرا مطلب ہے مہ.....! اس کے کالج فیلو نے اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا ہے۔“

وہ کان چمڑاتا ہوا بولا۔

”کیوں بھی کیوں.....؟ کالج فیلو اس کی دم پر پاؤں رکھنے کی جرأت کیسی ہوئی.....؟ تمہارا پاؤں کہاں

ہا.....؟ تم..... میرا مطلب ہے کیا وجہ ہے.....؟ اور کان کھول کر سنو.....! وردہ کے سامنے خبردار جو تم نے کسی مہ

جین کا نام لیا ہو تو.....“

”اس کے سامنے کب لیا مہ.....! وہ جا چکی تھی۔“

”خدا اس کے سامنے نہ پیچھے۔ تم وردہ کو برا نہیں کہو گے، سمجھے.....؟ کیونکہ وہ تمہاری ہونے.....“

”ارے بھابی جان.....! آپ یہاں ہیں.....؟ جلدی آئیے یہ لڑکے تو کسی کام کے نہیں۔“

شہلا کی آواز پر عفت اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی آگے بڑھ گئیں اور ارمغان ان کی اُدھوری بات کو

مکمل کر کے الجھ سا گیا۔ اس کے دل کے فریم میں اس تو صرف اور صرف علیزہ کی تصویر تھی اور مہاوردہ کو۔

”میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ نجانے مہاوردہ چپ گھٹی میں ایسی کیا بات نظر آتی ہے جو علیزہ میں

نظر نہیں آتی، گھبرانے کی کیا ضرورت ہے اللہ ہے ناں۔“ اور پھر یہ یقین اس کے اندر تک اتر کر مایوسی کو نگل گیا تو

اک خوش گن احساس لئے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

”مانی بھیا.....! دیکھئے یہ میرا جوڑا ہے، مہندی پر پہنوں گی۔ اچھا ہے ناں.....؟“ اس کزن شانی گرین

رنگ کا جھلملاتا ہوا غرارہ اسے دکھا کر بولی تو وہ شوخی سے ہنسا۔

”ہاں.....! بہت زیادہ اچھا ہے۔ اگر اسی طرح بیگر پر لٹکا رہے تو.....“

”مانی بھائی.....! جانیے میں آپ سے خفا ہوں۔“ شانی روٹھ گئی تو اس نے زور سے اس کی چوٹی ہلا دی۔

”ارے احمق.....! بھول گئیں.....؟ میں تمہیں اکثر بیگر ہی تو کہتا ہوں ناں۔ اتنی لمبی اور ڈیلی جو ہواور

مٹاؤ جب تم یہ لباس پہنو گی تو کتنی حسین لگو گی۔ پو آرسو کیوٹ گرل.....!“

وہ اسے یوں بھلا کر اپنی بات کا ازالہ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ گھر بھر میں ہڑ بونگ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی



مصرف نظر آرہا تھا یا مصروفیت کے اس ہنگامے میں مصروف نظر آکر اپنا حق ادا کر رہا تھا۔ لڑکے باہر بڑے لان میں مہندی کی تقریب کے لئے ڈیکوریشن کروا رہے تھے۔ لڑکیوں کی الگ جان پر بنی ہوئی تھی کہ وہ کون کون سے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مس ورلڈ بن سکتی ہیں۔ ہر طرف شور ہنگامہ، بڑوں کے اپنے ہی ٹینشن تھے، بلا وہ چھوٹوں کو ڈانٹا جا رہا تھا۔ بزرگ خواتین الگ مصروف تھیں۔ کاموں کے ساتھ ساتھ برائیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شوہروں کی برائی ختم ہوتی تو سسرال والوں کی برائیاں شروع ہو جاتیں۔ بڑا دلچسپ ماحول ہو رہا تھا آج کل گھر کا۔

”ایاز.....! آؤ ذرا خواتین کی طرف چلیں۔“

ارمغان، یاسر اور ایاز کھسک آئے، عدیل، نبیل وغیرہ بڑی مستعدی سے کام کر رہے تھے اور نامے چڑے ہو رہے تھے۔ ان تینوں کو کھسکتے دیکھ کر عدیل بلبلایا۔

”کہاں بھی.....!“

”وہیں جہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔“ ارمغان نے دائیں آنکھ دبائی۔

”ہرگز نہیں.....! یار.....! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم مسلسل کام کر رہے ہیں اور تم لوگ گھوم رہے ہو، پیش کر رہے ہو۔“

”وہ اس لئے عدیل بھائی.....! کہ ایسے موقعوں پر بزرگ ہی سارے کام دیکھتے ہیں۔ ہم جیسے منڈے انجوائے کرتے ہیں، کیوں بچو.....! میں نے غلط کہا.....!“

”ہرگز نہیں.....! قطعاً نہیں.....! دیکھئے ناں عدیل بھائی.....! جتنا اچھا کام آپ کر سکتے ہیں وہ تم میں سے کوئی نہیں کر سکتا، وہ دیکھئے سامنے کیا ہے.....؟“

یوں وہ تینوں عدیل کو بے وقوف بنا کر بھاگ لئے اور عدیل کھول کر رہ گیا۔

”علیزہ.....! تم فارغ ہو تو ذرا میرا فیشنل تو کر دو۔“ قدسیہ چچی لڑکیوں سے زیادہ تیار ہو رہی تھیں۔

”وردہ.....! تم اپنے کپڑے آئرن کرو تو پلیز میرے بھی کپڑے آئرن کرو۔“

دو نیانے اپنے کپڑوں کی ذمہ داری بھی وردہ پر ڈال دی جو پچاری اکب سے سب کے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔

ہرگز نہیں.....! سب اپنے اپنے کپڑے خود استری کریں۔ حد ہوگئی۔ میری جی فالٹو نظر آ رہی ہے۔

کوہٹا اپنے کپڑے، وردہ.....! تم نے ابھی تک مہندی نہیں لگائی۔“

عفت ایک دم اندر آئیں۔ وردہ کو کپڑے استری کرتے دیکھ کر غصے سے بڑھیں تو علیزہ نے پلٹ کر کچھ عجیب سی نظروں سے عفت بیگم اور وردہ کو دیکھا۔ شاید اسے وردہ کو اہمیت دینا برا لگتا تھا۔ کچھ بھی تھا اسے عفت بیگم کا یہ رویہ اور انداز اچھا نہیں لگا اس لئے کہ اسے ان سب سے شہلا کے حوالے سے چڑھتی۔

”ارے واہ واہ.....! یہاں تو گویا رنگ و بو کا سیلاب آیا ہوا ہے۔“ ایاز نے ماہا کو دیکھا جس کے چہرے، رنگ اتر آئے تھے اس کے آنے سے۔

”آپ لوگ یہاں کیسے آئے.....؟“ ارمغان کی آمد علیزہ کے حسین چہرے پر ناگواری لے آئی۔ وہ جو

لڑکیوں کی نظر سے اسے ہی دیکھ رہا تھا بدل سا ہو گیا اس بیزاری پر۔

”دیری سکیل.....! دروازے سے۔“ وہ اس کے قریب کھسک آیا تو وہ بھنویں چڑھا کر پرے ہٹ گئی۔

”انتہائی گھسا پٹا جواب ہے آپ کی طرح۔ اب جائیں یہاں سے۔“

”کیوں جائیں بھی.....! تم لوگ ہم پر حملہ آور ہونے والی ہواتے مہلک ہتھیاروں کے ساتھ تو ہمیں مار مار کر مارتے ہو گاناں اپنا۔“

یاسر نے ایک طرف پڑی میک اپ کی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھا۔

”جبکہ ان کو قتل کے لئے ایسے آلہ قتل استعمال کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“

”مانو.....! یہ کیا تم لوگوں نے فضول باتیں شروع کر رکھی ہیں.....؟ کل مہندی ہے لڑکیوں کی ابھی تک ماراں بھی مکمل نہیں ہوئیں۔ تم ایسا کرو مانی.....! کہ وردہ کو لے جاؤ اور پارلر سے مہندی لگوا لاؤ۔“ عفت بیگم

”اردہ کو ارمغان کے برابر کھڑا کر دیا تو علیزہ نے ہونہ کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ ارمغان چڑسا گیا۔

”کیوں.....؟ یہ عرصہ سے آئی ہیں کہ صرف ان کو مہندی لگوائی جائے۔“ باقی لڑکیاں احتجاجاً چلائیں۔

”مما.....! کی جیتی جو ٹھہریں۔“ ارمغان بھنا گیا۔

”ہاں ہے پھر.....؟ چلو جاؤ وردہ.....! اس کے ساتھ۔“ ممانے دونوں کو دھکیل کر کمرے سے نکالا۔

”کیا بات ہوئی تائی جان.....! آخر اور لڑکیوں کے بھی ہاتھ ہی، معصوم و مظلوم اس نا انصافی پر بددعائی کی۔ لہذا می عدالت سے اپیل کرتا ہوں کہ باقی ہاتھوں کو بھی پارلر سے مہندی لگوائی جائے۔ چلو بھی

اپنے اپنے ہاتھ اُٹا کر دو اور ڈیزائن بتا دو، ہم مہندی لگوا لاتے ہیں۔“ ایاز اور یاسر نے دونیا اور ثوبیہ کو ہاتھ دکھائیں بلے کے۔

”کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی، میں نے عدل اور غفران سے کہہ دیا ہے کہ وہ ان سب لڑکیوں کو لے جائیں اور ان کو جو چھوٹی موٹی شاپنگ ہے، پارلر سے جو کرنا ہے سب کام کر لیں گی۔“ شہلا نے اندر آ کر اطلاع دی تو یہ اطلاع نیزے کی انی بن کر ایاز، یاسر اور ارمغان کے دلوں میں اتر گئی۔ تینوں سراپا احتجاج بن گئے۔

”عدیل اور غفران کیوں.....؟ ہم مر گئے ہیں کیا.....؟ یہ زیادتی ہے پھپھو.....!“

”ڈرائیونگ لائسنس ہمارے پاس بھی ہیں خالہ.....! ہم بھی ڈرائیور بن سکتے ہیں۔“

”چند تو تم پھر بھی لگو گے۔ بہر حال عدیل اور غفران کے ساتھ اشعر اور فیضی بھی جائیں گے۔“ شہلا نے فیصلہ سنا دیا تو وہ تینوں کھول کر رہ گئے جبکہ لڑکیاں بہت خوش تھیں۔

”یار.....! یہ عدیل اور غفران کا کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

ارمغان اور یاسر کھسر کھسر کر رہے تھے۔ عدیل اور غفران کو پس منظر سے غائب کرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔

”کچھ بھی کرنے سے پہلے گھی سیدھی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کرو۔“ ایاز کے مشورے پر ارمغان

الورست کرتا آگے بڑھا۔

”ٹھیک ہے پھپھو.....! آپ کہتی ہیں تو میں لے جاتا ہوں لڑکیوں کو پارلر۔ اگر یہ لوگ پارلر نہیں جائیں



”اور نہیں تو..... ویسے کچھ اللہ معاف کرے ایسے چہرے ہیں کہ پارروالیاں بھی قفل ہو جاتی ہیں۔“  
شانی.....!“

ایاز نے سانولی سی شانی کو چھیڑا اس نے تو غصے میں پانی کا گلاس اس پر پھینکا وہ ہوشیاری سے ہٹ گیا اور پانی شہلا پر جا پڑا۔  
”توبہ.....! اللہ میری توبہ.....! آج یہ وقت آگیا کہ گھر کی بیٹیاں گھر کے بزرگوں کو پانی پانی کرتی ہیں استغفار، استغفار.....!“ وہ تینوں کانوں کو چھو کر توبہ کرنے لگے تو شانی مزید شرمندہ ہو گئی مگر شہلا مسکرا رہی تھیں۔  
”زیادہ بکومت، چلو تم لوگ غفران اور عدیل کو بھیجو۔ خود ان کی جگہ سنبھالو پچارے صبح سے کام میں ہوئے ہیں۔“

”اوہو خالہ.....! اس میں اتنا ترس کھانے کی کیا ضرورت ہے.....؟ آخر نیل جو بچنے کے لئے بنی ہے.....“

”جی.....! نیل اپنا کام کر چکے، اب گدھوں کی باری ہے۔“ غفران اور عدیل بھی آگئے تو وہ تینوں گھر کر رہ گئے۔ اب راہ فرار کوئی نہیں تھی کیونکہ انہوں نے واقعی کوئی کام نہیں کیا تھا۔  
”تف ہے یار.....! تف ہے تم لوگوں کی زندگی پر۔“ یاسر نے بھڑاس نکالی۔

”ارے.....! یہ بھی کوئی کام ہوا کہ لڑکیوں کو پاؤں لے جانا۔“ جاتے جاتے ارمغان نے عدیل کو پاؤں کو مسل ڈالا تو وہ بیچارہ ڈہرا ہو گیا تکلیف سے۔

”بہت بدتمیز ہیں۔ چلو لڑکیو.....! تیار ہو جاؤ اور بھی بہت سے کام ہیں۔ علیزہ بیٹا.....! تم یہ کیا کر رہی ہو.....؟ رہنے دو میں ترپائی کر دوں گی تم جاؤ مہندی لگواؤ۔“ شہلا علیزہ کی طرف بوہیں جو سارے ہنگامے خاطر میں لائے بغیر اپنے دوپٹے کے کنارے پر ترپائی کر رہی تھی۔ شہلا نے اس کے ہاتھ سے لے کر کہا تو اس نے انتہائی خشکی نظروں سے ان کو دیکھا جو ممتا کی تمام تر حلاوتوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے مہندی نہیں لگوانی۔“ سرد ترش لہجے میں وہی بغاوت، وہی غصہ، وہی اصرار تھی، نفرت تھی جو کہ گہر اور دل میں اتر گیا، چہرہ تاریک ہو گیا، قدرے فاصلے پر کھڑی وردہ نے کچھ کی بات کی۔  
اور ماما کے چہرے پر اتری شام کو بھی دیکھا۔

”تم اور مہندی نہیں لگواؤ گی.....؟ تم تو موقع کے بغیر بھی مہندی لگاتی رہتی ہو، سنگھار میں تمہیں مہندی تو پسند ہے پھر اب کیوں نہیں لگوا رہی ہو.....؟“

وردہ کو ماما کے ساتھ اس کا اس قسم کا رویہ ہمیشہ ہی تکلیف دیتا تھا اور علیزہ شہلا کو اپنے بابا کی مجرم سمجھتی تھی جن کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے اور یہ خطا وہ ان کی تاحیات معاف نہیں کر سکتی تھی۔

”شاید اس لئے بیٹا.....! کہ میں کہہ رہی ہوں۔“ شہلا کے دھیسے لہجے میں خشکی تھی۔ وہ اپنی محبت اور پر خلوص کوششوں کے باوجود علیزہ کی محبت کی جنگ جیت نہیں سکی تھیں۔ ان کی بات کے جواب میں علیزہ نے دیکھا بھی تو ایسی نظروں سے تھا گویا کہہ رہی ہو کہ آپ نے درست سمجھا۔ مگر کبھی کبھی احساس لفظوں کا محتاج نہیں

”ایسی بات نہیں ہے ماما.....! بس آپ نے نخرے اٹھا اٹھا کر اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ چلو جاؤ چیچ

وردہ نے ایک طرف تو ماما کے زخم پر پھاہا رکھا، دوسری طرف بہن کو تیار ہونے کو کہا تو علیزہ نے ایک نظر شہلا پر ڈالی، دوپٹہ ایک طرف بچھا اور وردہ کو گھورتی کھڑی ہو گئی۔  
”تم میری جڑواں بہن ہو، میری بزرگ نہیں کہ حکم دو۔“ وہ اکھڑ لہجے میں بولتی آگے بڑھی تو سب متوجہ ہو گئے۔ شہلا نے وردہ کا شانہ دبا کر بات کو بڑھانے سے روکا۔ وہ چانتی تھیں علیزہ کوئی بھی بدتمیزی کر کے ماحول کو آگ لگا سکتی ہے اور شادی کے موقع پر وہ ایسا کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی تھی۔

”اوکے بابا.....! تمہیں حکم نہیں دے رہی درخواست کر رہی ہوں، چلو۔“

”نیل.....! تم لوگ جاؤ۔“ اس کے لہجے کی سختی نے وردہ اور شہلا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ یں گھر کی لڑکیاں چلی گئیں تو علیزہ کے روپے پر شہلا ڈکھی سی ہو گئیں۔ علیزہ کو عجیب سی بوریت ہو رہی تھی۔ اندر سے پھٹاؤ اساتھا کہ چلی جاتی تو اچھا تھا۔ بلاوجہ ماما کی چڑ میں نہیں گئی اور جب انسان کا کوئی پسندیدہ کام کرنے کو اپنی چاہ رہا ہو اور اپنی ہی وجہ سے کرب بھی نہ سکے تو اک عجیب سی کوفت میں اپنا دم گھٹنا محسوس ہوتا ہے اسی کیفیت کا اہر آگئی۔ مہندی کی رسم کے لئے بہت خوبصورت لائٹنگ ہوئی تھی۔ لڑکوں نے مہندی کے گانوں کی کیسٹ ماحول کو اور خوبصورت بنا دیا۔

”ارے علیزہ.....! تم نہیں گئیں.....؟“ یاسر کی آواز پر ارمغان نے پلٹ کر دیکھا تو برقی قہقروں میں لڑی وہ کسی حسین خیال کی طرح لگی۔ ارمغان کے گرد خوشی کے جگنور قصاں ہو گئے۔ دل میں اترنے والا لطیف احساس دھیرے سے شوخ نظروں میں اتر آیا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر ادھر ہی آگیا۔ اب تک اسی ملال میں تو وہ کھڑی تھی اور وہ نہیں گیا اور اب اسے اپنے سامنے پا کر وہ خوشی کے رنگوں کو سمیٹنے لگا اور یاسر کے قریب آگیا اس کے مقابل وہ کھڑی تھی۔

”بس یونہی، میری مرضی.....!“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔  
”ایک تو تمہاری مرضی بڑی خود مر ہے۔ کسی دن میرے ہاتھ لگ گئی ناں تمہاری مرضی تو ہڈی پسی ایک کر اس کا اس کی۔“ یاسر چڑ کر بولا۔

”جو لوگ اپنی مرضی کے غلام ہوتے ہیں ناں یاسر.....! ان کی خوشی کی تھلیاں کبھی آزاد نہیں ہوتیں، اسی لئے ان میں ان کے پروں کے رنگ اڑ جاتے ہیں اور محبت کی کوئلیں بن کھلے ہی اداس خزاں کے احساس میں ہو جاتی ہیں۔ ویسے بندے کو اپنی مرضی کا اتنا پابند ہونا نہیں چاہئے۔“

ارمغان کا لہجہ گمبیر ہوا تو علیزہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

”یہ میری زندگی ہے، میری مرضی ہے، میں جس انداز سے گزاروں، آپ کا کیا لینا دینا.....؟ کیا تعلق ہے.....؟“ وہ ارمغان کو دیکھ کر غرائی تو اک دھیمی سی کک ارمغان کے دل کی بستی سے گزرتی ہوئی آگے آگئی اور بھیگی سی مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر آگئی۔



”کچھ تعلق، کچھ واسطے بے زبان ہوتے ہیں جو احساس کی زبان بولتے ہیں اور احساس اس کی بجائے  
سمجھتے ہیں مگر تمہارا کیا لینا دینا، کیا تعلق واسطے گہرائی سے..... تو مٹی پاؤ۔“ ارمغان نے علیزہ کی ہڈی کو  
جذب سے اس کے انداز میں لوٹایا تو وہ جو واقعی نہ ارمغان کو اہمیت دیتی تھی نہ اس کی بات کو اسی لئے  
شانے اُچکائے اور یاسر کی طرف مڑی۔

”یاسر.....! پلیز میرے ساتھ ڈرائیبل تک چلے چلو۔“

”نہ بابا.....! نہ، میری اس کی لڑائی چل رہی ہے۔ ایسا کرو تم ارمغان کے ساتھ چلی جاؤ۔“ یاسر  
درمیان سے ہٹ رہا تھا۔ علیزہ کو غصہ تو آیا، منہ بھی پھولا مگر پھر یہ خیال کہ کل اسے مہندی کی رسم ہے،  
ہیں۔

”نہیں یاسر.....! پلیز تم چلو نا۔ دیکھو پانچ منٹ کی تو بات ہے۔“ وہ یاسر کی منت پر اتر آئی۔

”پانچ منٹ.....؟ ارے لڑکی.....! آدھا گھنٹہ تو ٹیلر صاحب کی شاپ تک جانے میں لگتا ہے۔“

”ذمے بے شمار کام ہیں، یہ ہے نہ نکما.....! لے جاؤ، عمر بھر کے لئے۔“ آخری جملہ یاسر نے بہت دیر  
ارمغان کے قریب ہو کر کہا جس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

”تم صرف بھرم دکھا رہے ہو ورنہ اتنے ڈھیر سارے لوگ ہیں کاموں کے لئے، چلو پلیز.....!“  
جیسے دیر ہو رہی تھی اسے خوف لاحق ہو رہا تھا، ٹیلر چلانے لگا۔

”ارے.....! کام بھی تو ڈھیر سارے ہیں۔ ارمغان یار.....! ایسا کرو تم علیزہ کو لے جاؤ۔“

”واٹ.....! میں اتنا نکما نہیں ہوں کہ فضول کام کرنا پھروں۔ ہزاروں کام ہیں میرے ذمے۔“  
تایا جان تو سب سے زیادہ مجھ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔“ وہ اپنی اہمیت جتا کر اتر آیا تو علیزہ اور سلسلے کی

”چلو اب نخرے نہ دکھاؤ۔ علیزہ کی مجبوری ہے۔“

”اچھا.....! یہ بھی مجبور ہو سکتی ہیں.....؟“ ارمغان نے خفگی سے علیزہ کو دیکھا جو اس وقت صرف اس

گرین غرارے کے بارے میں سوچ رہی تھی جو ٹیلر سے لینا تھا۔

”جاؤ بھائی.....! اگر ہم نے اس کی مدد نہ کی تو اس بیچاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔“

”ہونہہ.....! تو میں کیا کروں.....؟“ ارمغان کو بھی گویا بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

”ارمغان.....! پلیز.....!“

”اوچپ کرو تم.....! کام جس کا ہے اسے فکر نہیں اور تم فکر سے مرے جا رہے ہو۔ ارے.....! ان

منہ میں بھی زبان ہے اور زبان پر عبور بھی بہت حاصل ہے۔ یہ خود سے کیوں ریکوسٹ کرتیں کہ ارمغان صاحب

پلیز مجھے ٹیلر کے پاس لے چلے.....؟ ہونہہ.....!“ ارمغان نے پہلے تو یاسر کو ڈانٹا پھر ایک سلکتی نظر علیزہ پر ڈالی

علیزہ نے بھی اسی انداز میں ہونہہ کہا۔ جواباً ارمغان بھی زمین پر پاؤں مار کر ہونہہ کر کے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

وقت خلیل صاحب آگئے۔ ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی گئی۔

”یاسر بیٹا.....! تم تو میرے ساتھ چلو اور ارمغان تم علیزہ کو لے جاؤ جو اس کے کام ہیں وہ کر لے۔“

خلیل صاحب نے جھگڑا ہی سمیٹ دیا تو اندر سے خوش ہوتے ہوئے، مگر بظاہر ارمغان نے منہ

”اتنے ڈھیر سارے میرے اپنے کام تھے مگر یہ تم لڑکیاں وقت پر کام کیوں نہیں کرتیں.....؟ کوئی موقع،  
ایک ماہ ہو، عید، شب برأت ہو سارے کام عین وقت پر ہی یاد آتے ہیں۔ ہائے میری میچنگ لپ پٹل رہ گئی،  
ایک ماہ پہن کھو گئی اور پھر مصیبت بن جاتی ہیں گھر کے لڑکوں کے لئے اور اگر وہ بیچارے نہ مائیں تو چٹل  
داں کر کے بڑوں سے جوتے پڑواتی ہیں۔“

”سلسل بولے جا رہا تھا شاید وہ اپنے جذباتوں کا، اپنی اس بے پایاں خوشی کا بھرم رکھ رہا تھا جو وقتی سہی،  
اس کے ساتھ کی صورت میں ملتی تھی۔ یوں بھی وہ علیزہ پر جتنا تارہتا تھا کہ وہ بھی اس سے چڑتا ہے۔ اگر کوئی بے

لگا پٹل جاتا تو خود ہی طرح طرح سے اس کی نفی کرتا رہتا حالانکہ علیزہ تو اس کو کوئی بھی اہمیت دینے کے لئے

نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی مگر اب اسے گھور رہی تھی۔ ارمغان دبک گیا کہ جانے کیا ہم

والا ہے۔

”اگر آپ کو اتنے ڈھیر سارے کام تھے تو ماموں جان سے انکار کر دیتے۔“

”آ.....! ہا.....! ہا.....! انکار کر دیتے تاکہ وہ میرا دوکانوں کے درمیان سر کر کے کیلے کے درخت سے لٹکا

جائے۔ تم ہی انکار کر دیتیں گے مجھے ارمغان کے ساتھ نہیں جانا۔“

”میں انکار کیوں کرتی.....؟ مجھے تو ایک ڈرائیور چاہیے تھا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے۔“

اس کی خوشی کی نرم پھوار پر اپنی فطرت کے شعلے برساتی وہ ٹیلر کی شاپ پر اتر گئی تو ارمغان اندر تک سر دپڑ

ایک ایک کر کے سارے تارے ڈوب گئے۔ اس کی محبت کے آسمان پر علیزہ کی نفرت کا کھپ اندھیرا پھیل

گیا تو اس نے اک گہرا سانس لیا اور اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری نفرت کے خار چنتے چنتے تو میری روح زخمی ہو گئی ہے۔ علیزہ یہ کیا میری زندگی میں تم ہی تم ہو

تمہاری زندگی میں کہیں بھی نہیں۔“

اک کبک اندر سے بے چین کئے رہی پھر واپسی پر وہ بولا کچھ نہیں بس اس کے اپنے ساتھ ہونے کو محسوس

کرتا رہا۔ ایک دو بار علیزہ نے کن انگیوں سے اسے دیکھا۔ گہری سنجیدگی کے سائے تھے اس کے چہرے پر، خفا خفا

علیزہ نے شاید پہلی بار اچھا لگا تھا مگر دوسرے ہی پل نفرت کی آندھی سب کچھ اڑا لے گئی۔

● ● ●

”تمہارا خیال ہے کہ وردہ نے دانستہ طور پر تمہارا ہاتھ زخمی کیا.....؟ آف.....! کتنا گہرا زخم ہے۔

فرین.....! میرا تو خیال ہے کہ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“

اسد غزین کا زخمی ہاتھ دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا جو گاڑی کے دروازے میں آیا تھا اور جس کے بارے میں

فرین کو یقین تھا کہ وردہ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔

”کبھی کبھی یقین کے شعلوں کو خیال کی ہوا ان کو مزید بھڑکاتی ہے، بجھاتی نہیں۔ احس لڑکی مجھ سے انتقام

لیتی ہے ان باتوں کا جو میں اس سے کرتا ہوں۔ یا اسد.....! یہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے.....؟ آخر میرے

اندھ لگی ہوئی آگ کب بجھے گی.....؟ کب میں بھی سکون سے جی سکوں گا.....؟“



”اچھا.....! فی الحال تو ڈاکٹر کے پاس چلو۔ تمہارے زخم کو دوا کی ضرورت ہے۔“ اس کے دکھ کا اندر اتارتے ہوئے اسد نے اسے کھڑا کیا۔

”ارے چھوڑیار.....! بہت کام ہے اس دل میں رفوگری کا۔“

غزین کے زخم میں تکلیف کم مگر دل میں درد کا گویا جہاں آباد ہو گیا تھا۔

”غزین.....! میری بات مان جاؤ۔ ڈاکٹر کے پاس چلو۔“

”ڈاکٹر تو وہ بھی ہے رات اسی کے پاس چلیں گے اپنے زخموں کا حساب لینے۔“

غزین کے ہونٹوں پر بڑی عجیب پر اسراری مسکراہٹ آگئی اسد سے دیکھنے لگا۔

”تو گویا تم مہندی میں جا رہے ہو.....؟“

”آف کورس.....! ارے سب لوگوں نے اتنے اصرار سے بلایا ہے جانا تو پڑے گا ہی۔“ وہ ہاتھ کی تکلیف کو مسکراہٹ میں چھپاتا ہوا بولا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کون کون سے خوابوں رنگ تھے اور ہونٹوں کی معنی خیز مسکراہٹ کون سی داستان چھپا رہی تھی۔ غزین وردہ کے گھر کے لڑکوں اور بزرگوں سے اتنا مانوس تھا کہ مہندی پر اس کی آمد پر سب ہی بہت خوش ہوئے۔

”تھینک یو غزین.....! تم آگئے ورنہ ہمیں گلہ دیتا۔“ سعود نے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا جو سفید سوٹ میں جچ رہا تھا۔

”غزین بھیا.....! آپ یہ دوپٹہ پہن لیں آپ ہماری طرف سے لٹی لڑکے والوں کی طرف سے ہیں جو اداور یوبی نے یلوٹشو کا دوپٹہ غزین کے گلے میں ڈال دیا۔“ ہرگز نہیں.....! غزین ہماری طرف سے ہوگا۔“ یاسر اور شہاب نے اورنج دوپٹہ غزین کے گلے میں ڈال دیا۔

”جی نہیں.....! یہ ہماری طرف سے ہوں گے۔“

”ارے بھئی.....! سب کچھ کہاؤں ہے تم لوگ بلا وجہ جھگڑ رہے ہو۔ آؤ غزین.....! تمہیں اپنی ملاواؤں۔“

اس سے پہلے کہ دو پارٹیاں غزین کو آدھا آدھا بانٹ لیتیں ارمغان اسے لے کر آگے بڑھا۔ ہر رنگ و بو، رنگ برنگی روشنیوں کا جہاں آباد تھا، سنی سنوری لڑکیاں تیلیوں کی مانند اڑتی پھر رہی ہیں۔ لاؤنج میں اس وقت صرف وردہ تھی جو سبز لباس میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ موم بتیوں کے تھال پر جھکی موم بتیاں جلا رہی تھی جب غزین اور ارمغان داخل ہوئے۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔

”ارے.....! یہ تم کیا کر رہی وردہ.....!“

”موم بتیاں جلا رہی ہوں۔“ وہ ارمغان کی بات پر مڑے بغیر بولی۔

”جلانے کا کام تو یہ بہت ہی خوب کرتی ہے۔“

خوبصورت گیسر آواز پر وردہ چونک کر مڑی تو نظریں سامنے کھڑے غزین سے جا ملیں جو نظروں میں

”اے غزین، ہوسوں پر لہری مسکراہٹ سے اسے ہی دیکھ کر ایک دم سے ناپاکی اور گھبراہٹ میں گر آتی سی دیر میں وہ سلگ اٹھی۔ مگر وہ کچھ بھی کہہ نہیں پائی۔ ایک تو وہ مہمان تھا، دوسرا موقع ایسا نہیں تھا۔

”ارے لڑکی.....! ایسے کیا دیکھ رہی ہو.....؟“ ارمغان نے اسے ٹوکا۔

”شاید یہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، پہچانتا ہوں مگر مجھے ہمارے سرے سے اپنا تعارف کرانا پڑتا ہے۔ ان چار سالوں میں اتنی بار تعارف کرایا ہے کہ خیر وردہ اہمیت.....! میں غزین آفاق فقط ایک کلاس سینئر آپ کا کالج فیلو، آداب.....!“ ایک ایک لفظ وردہ کے اندر برم کی طرح پھٹ رہا تھا۔ نگاہوں کی شوخیاں اور مسکراہٹ کی معنی خیزیاں جانے ارمغان کو سمجھ کیوں نہیں آ رہی تھیں۔ وردہ نے ایک سنگتی نظر ارمغان پر ڈالی جو غزین کے ہاتھ پر پٹی دیکھ کر ایک دم چونکا تھا جس سے اب بھی

”غزین.....! یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا.....؟ کیسے زخمی ہوا.....؟“ تکلیف کا ایک گہرا سانس باہر نکلتے نظریں وردہ پر ٹھہر گئیں جو ارمغان کو گھور رہی تھی جو غزین کو اتنی اہمیت دے رہا تھا۔ غزین کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ چھل گئی۔

”ایسے موقع پر مجھے ابن انشاء کے شعر یاد آ رہے ہیں کہ:

ہم سے بھی سب پوچھا کئے

ہم بس دیتے ہم چپ رہے

منظور تھا پردہ تیرا

کچھ زخم اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے یہ کبھی نہ بھریں، کبھی اس کے درد کی لذت ختم نہ ہو۔“ غزین نے انتہائی گہری اور چڑانے والی نظروں سے وردہ کو دیکھا جو یہ بھول گئی تھی کہ ہوا چل رہی ہے اور ساری موم بتیاں جل چکی ہیں۔ ارمغان تو ظیل کے بلائے پر ایکسکیوز کر کے چلا گیا تھا۔ وردہ بھی جانے کے لئے گھومی تو اس کا دوپٹہ کہیں اٹک گیا۔ غزین تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ آزاد نہ کرانا تو موم بتیوں اور مہندی کا تھال اس کا کرتا۔

”میں بھی زخم دینے میں پہل نہیں کرتا مگر جو مجھے زخمی کرتا ہے تو اس سے اپنے زخموں کا حساب میں ضرور لیتا ہوں۔“ ماسٹڈاٹ.....!“

شرجیل واصف کو دیکھ کر تڑپ ہی تو گیا تھا اگر عاصمہ نادرہ نے زور سے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ اب تک پپا سے لپٹ چکا ہوتا۔

”اری.....! یہ کس کو پپا کہہ رہی ہے تو.....؟“ عاصمہ نے اسے گھورا۔

”وہ..... وہ واڑھی والے، میں نے ان کو واڑھی میں بھی پہچان لیا ہے وہی میرے پپا ہیں۔ میرے

پپا۔“



شرجیل چل چل کر گرفت توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔  
 ”اری جنم جلی.....! کجخت.....! یہاں تو بہت سے لوگوں کی داڑھیاں ہیں، کون سے باپ کو کیا مارا ہے.....؟“ نادارہ نے ایک سفید باریش بزرگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، وہ نہیں، وہ جو سب سے پیارے لگ رہے ہیں، سب سے خوبصورت اور اچھے لگ رہے ہیں۔ وہی ہیں میری جان، میرے پاپا۔“

مسجد کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑے شرجیل نے تڑپ کر پاپا کو پکارا جو وضو کر کے اب آخری صف میں کھڑے ہو رہے تھے۔

”ہائے ہائے.....! کتنی گرمی ہے، جان نکلی جا رہی ہے اور موائے کی ٹیکسی ٹھیک نہیں ہو رہی۔“  
 شنیو نے باہر نکل کر اپنا پسینہ صاف کیا تو ساتھ ہی میک اپ بھی اتر گیا۔

”ایک نہیں بھائی.....! چار گلاس شنجوی تو بنا دے۔“  
 شنیو نے ایک درخت کے سائے تلے لیووں پانی بنانے والے سے کہا تو وہ دوسرے کو دیکھ کر معنی سے ہنسا۔

”چار، صرف چار گلاس.....؟ تو کہے تو ٹھیلّا تیرے نام کروں۔“  
 ”ہاں کر دے بے غیرت.....! پھر بھوکا مرنا اور بیوی بچوں کو زہر دے دینا، تیری مکروہ شکل سے تو میری

بری شکل اچھی۔ دفعہ ہو.....! مجھے نہیں پینا۔“  
 شنیو نے کھڑے کھڑے دو گلاس چڑھائے بھی اور فیکل کر کے آگئی تو پیچھے وہ آدمی فضول بکواس کر رہے

ہنے اور تالیاں بجانے لگے شرجیل کو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔  
 ”منحوس ماری.....! خود چڑھا کے آگئی، اس ننھی جان کا خیال نہ آیا۔ چل آ میں تجھے بوتل پلاتی ہوں۔“

نادارہ اور عاصمہ اسے گھسیٹ کر دوسری طرف لے جانے لگیں تو شرجیل تڑپ اٹھا۔ وہ واصف کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

”پلیز.....! میری بات مان لو، وہی میرے پاپا ہیں، وہ ایک بار مجھے دیکھ لیں گے تو وہ فوراً مجھے پہچان لیں گے۔ ابھی مجھے نہیں رہنے دو۔“

شرجیل نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تو نادارہ کو ترس آ گیا۔  
 ”کیا تجھے اپنی پہچان پر یقین ہے.....؟ تجھے تو خود اپنی پہچان نہیں تو باپ کو کیا پہچانے گی.....؟“

اس کاری وار نے ایک بار پھر شرجیل کو چکر دیا پھر دائرے بننے لگے۔ وہ گھومنے لگا واقعی اگر وہ خود کو نہیں پہچان سکتا تو پاپا کو کیا پہچانتا۔

”نہیں.....! خود کو پہچان سکوں یا نہیں لیکن میں اپنے پیارے پاپا کو تو اچھی طرح پہچان سکتا ہوں، وہی تو ہیں میرے پاپا، میری جان، وہی تو ان سب میں پیارے لگ رہے ہیں۔ ہاں.....! میں پہچان لوں گا، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں وہی میرے پاپا ہیں۔“

یقین کی طاقت نے اس کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔ وہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ جب بولا تو اسے

کہ وہ ایک مضبوط ارادے کا مضبوط مرد ہے۔ ایک عجیب سے جوش نے لہو گرم کر دیا کہ حرارت نادارہ اور عاصمہ کو محسوس ہونے لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیزی سے دیکھا کہ ذرا ڈھیل دی تو پتنگ کٹ جائے گی۔ لہذا گرفت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”چل مان لیا حسینہ.....!“  
 ”حسینہ.....؟ میں حسینہ نہیں ہوں، شرجیل ہوں، ممانے میرا نام شرجیل رکھا ہے، مجھے شرجیل کہو۔“ شرجیل نے ایک بار پھر بازو چھڑانے کی کوشش کی جو دیگر کوششوں کی طرح ناکام بنا دی گئی۔

”اور ہمارے گروہ نے تیرا نام حسینہ رکھا ہے شہزادی.....! ہم تو تجھے حسینہ ہی کہیں گے۔ اچھا چل آ تجھے شربت بوتل پلوائیں۔“ عاصمہ نے اس کا دھیان بنانے کی کوشش کی مگر شرجیل ایک انچ بھی نہیں ہلا اپنی جگہ سے،

ثابتی مشتاق نظروں سے مسجد کے گیٹ کو دیکھتا رہا۔ انتظار کے کتنے دیے روشن تھے اس کی آنکھوں میں۔  
 ”جوجی میں آئے ہو مگر آج میں پاپا سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

اس کے لہجے کا اعتماد اور یقین ان تینوں کو خطرے کی گھنٹیاں قریب سے سنار ہاتھا۔  
 ”اچھا چل مان لیتے ہیں تیری بات، انتظار کرتے ہیں تیرے پاپا کا، پر یہ تو بتا اگر انہوں نے تجھے نہ پہچانا

تو۔“ نادارہ نے بڑا کاری وار کیا تھا جس نے شرجیل کی ہمت، طاقت اور جوش کے ابال کو تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈا کر دیا اور پاپا کا رویہ کبھی باتیں یاد آنے لگیں مگر وہ پر یقین ہو گیا۔

”ہاں.....! وہ میرے پاپا ہیں مجھے ضرور پہچان لیں گے۔ کوئی باپ اپنی اولاد کو کیوں نہ پہچانے گا بھلا۔“  
 ”تو بہت بھول ہے شہزادی.....! جب ہم والدین کے گھر جنم لیتی ہیں ناں تو پھر یہ خود ہمیں خود سے نوج

کر پھینک دیتے ہیں کہ معاشرے میں ان کی بدنامی ہوگی، تیرے پاپا نے بھی تجھے پہچانا ہوتا ناں تو گھر سے نکالتا ہی نا۔“

”کہاناں نہیں نکالا مجھے کسی نے، میں سوئی کے خوف سے خود ہی گھر سے نکلا تھا کہ تم چڑیلوں نے پکڑ لیا اور میں.....“

شرجیل نے عقارت سے دائیں بائیں نادارہ، عاصمہ کو گھورا اور رونے لگا۔  
 ”اچھا چل مان لیا کہ تو خود گھر سے نکلی پھر ایک بات میری بھی ملے سے باندھ لے۔ انہوں نے شکر کیا

ہوگا کہ اچھا ہی ہوا اس چیز سے خود ہی جان چھٹ گئی اب جائے گی ناں تو اول تو تجھے کوئی پہچانے گا ہی نہیں، پہچان بھی لیا تو اب قبول نہیں کریں گے۔ آخر ان کو اس معاشرے میں رہنا ہے تم ہمارے پاس رہ کر جاؤ گی تو

لوگ ان کو طعنے مار مار کر تجھے گھر سے خود نکالنے پر مجبور کر دیں گے اور اگر انہوں نے خود تجھے گھر سے نکالا تو بہت برا ہوگا۔ تم اپنی نظروں میں بھی گر جاؤ گی۔ بولو تم اپنے والدین کی بدنامی کا سبب بن کے خوش رہ سکتی ہو.....؟

ارے.....! یہ لوگ جو خود کو نارمل اور مکمل انسان سمجھتے ہیں ناں اول درجے کے احمورے اور ایب نارمل ہوتے ہیں۔ میری مان جا، ضد نہ کر، ٹوٹ جائے گی، اگر باپ نے پہچان سے انکار کر دیا تو.....“

”چپ رہو، بکواس بند کرو اپنی، وہ میرے پاپا ہیں مجھے پہچان لیں گے اور اپنے ساتھ لے کر جائیں



”کے۔“  
”یقین کے بادل برے بغیر گزر گئے تو کجنت ماری.....! ترستی رہ جائے گی، خشک بنجر زمین کبھی بھیگ سکے گی تو یہ دھکچھ سے برداشت نہ ہوگا۔“

”بکواس بند کرو۔“ وہ تینوں اسے طرح طرح کے ڈراوے دے رہی تھیں۔ وہ جس کے اندر یقین دہانی کی آندھیاں چل رہی تھیں ایک دم دھاڑا تو بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔  
”تم چڑیلوں میں یہ چاند کا کھڑا کہاں سے آگیا.....؟“

ایک خبیث خصلت آدمی شرجیل کو لپٹانے لگا تو اس نے پوری قوت سے مکاس کے جڑے پر سید کیا تو سب لوگ بھاگ گئے۔ نادرہ، عاصمہ، شنیوہم کر شرجیل کو دیکھنے لگیں اور شرجیل جو یہ حملہ کر چکا تھا یہ معرکہ سر کے ایک یقین کا پرسکون احساس اس کے اندر تک اتر کر اسے مزید ہمت دے رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
عاصمہ اور نادرہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جلدی سے اسے پکڑ لیا کہ کہیں فرار نہ ہو جائے۔

”شاباش.....! میری گڑیا رانی.....! شاباش، ایسے بد معاشوں کو ایسا ہی جواب ملنا چاہئے۔ بد معاش، بے غیرت، لوفرنہ ہوں تو، چل میری پری.....! بوتل پلاتی ہوں۔“  
”تم اپنی زبان بند کرو اور یہ گڑیا، پری رانی کہنا بند کرو مجھے۔ میں شرجیل ہوں، شرجیل کہو ورنہ تمہارا بھی ایسا ہی حشر ہوگا۔“

آواز میں مردانگی، لہجے میں مردانگی، انداز میں مردانگی، عاصمہ اور نادرہ نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اعتراف کیا کہ شاید ہم نے اسے پہچاننے میں غلطی کی ہے مگر شرجیل ایسی چیز نہیں تھا کہ اسے گناہ دیتیں چنانچہ مصلحت پر اتر آئیں۔

”چلو اب غصہ تھوک دو میرے شہزادے.....! اور یہ لو بولیں پیو.....!“  
شنیوہم نے دکان سے اس کے لئے ٹھنڈی بوتل لے آئی تھی۔ شرجیل نے خوشی سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی حیثیت تسلیم کر لی گئی ہو۔

”تم.....! تم بہت اچھی ہو شنو.....! تمہیں یقین آگیا ناں میں ماہم کا بھائی ہوں، اب دیکھنا میرے بھائی بھی مجھے اپنا بیٹا کہہ کر ساتھ لے جائیں گے۔ میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔“

اور اندر کا مرد پھر انجانے خوف کی لپیٹ میں آ کر اپنی مردانگی گنوا بیٹھا۔ آواز میں خوف آگیا، لہجہ بھیگ گیا اور وہ ڈری سہی لڑکی کی طرح سمٹ گیا اور یہ وہ اس کی کمزوری تھی جس کو وہ تینوں کیش کر رہی تھیں۔ عاصمہ اور نادرہ اس کی طرف جھپٹیں اور اس کے بازوؤں میں اپنے تیز ناخن گاڑ دیئے کہ وہ بلبلاتا تھا۔

”یہ جو تو نے باپ کی رٹ لگا رکھی ہے ناں ایک شرط پر ملاؤں گی۔“  
عاصمہ نے اپنی خوفناک شکل کو مزید بھیا نک بنایا کہ وہ بہم گیا۔

”مم..... مم..... مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ مصوم شرجیل بھول چکا تھا کہ اس وقت وہ جس حلیے میں ہے پچاس کو پہچان نہیں پائیں گے اور وہ تینوں اسی بات کا فائدہ اٹھا رہی تھیں کہ وہ پہچانا بھی نہیں جائے گا اور اس کے سامنے سچی بھی ہو جائیں گی تب وہ ان کی ہر بات ماننے کا پابند ہوگا۔

”ٹھیک ہے تو اپنے باپ کے سامنے جائے گی، بھیگ مانگے گی، اگر اس نے پہچان لیا تو پھر بات ہوگی اور خبردار جو تو نے پہچان کرانے کی کوشش کی ہو تو.....“  
بڑی بڑی سرخ خوفناک آنکھوں والی نادرہ نے کچھ ایسے کہا کہ وہ خوفزدہ ہو کر بہم گیا۔

”نن..... نہیں.....! مجھے کیا ضرورت ہے.....؟ لیکن اگر انہوں نے پہچان لیا (جس کا شرجیل کو یقین تھا) تو میں ان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔“  
”اور اگر انہوں نے نہ پہچانا تو..... تو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ سمجھی، بول منظور ہے.....؟“ تینوں چڑیلیں اسے گھیرے کھڑی تھیں۔

”مجھے..... من..... من..... منظور ہے۔“ حلق سے بمشکل منظوری ہوئی۔ پھر نماز ختم ہو گئی تھی۔ تقریباً سب ہی نمازی جا چکے تھے مگر واصف ابھی سجدے میں گرے خدا کے حضور گڑ گڑا رہے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ

جس کے لئے وہ تڑپ رہے ہیں، تڑپ کے اس سفر میں ان کا بیٹا بھی شریک ہے اور ان کا منتظر ہے۔ جانے کب تک تڑپتے رہے کہ دل میں اور دُائیں لگا۔ وہ اٹھ کر آہستہ قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھے۔ دوسری طرف بے تاب بیٹھا تھا، ان کی جھٹک نظر آتے ہی وہ آگے بڑھا، قدم من من بھر کے ہونے لگے۔ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھیں کہ وہ کہیں موقع پا کر فرار نہ ہو جائے۔ جب منزل قریب ہوتی ہے تو تھکن کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ شرجیل کی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا پاپا نہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے میں سالیں اور وہ اس

کڑی دھوپ میں جھلنے سے بچ جائے۔ اس کا دل بھی تو بہت زور سے دھڑکنے لگا اور کبھی بند ہو جاتا، آنسو تو اتر سے چہرے کے میک آپ کو اتر رہے تھے۔ بس چند قدموں کی تو بات تھی۔ واصف چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ شرجیل نے بمشکل اپنی ہچکچاہٹوں کو روکا، وہ اپنے سینے میں نہا چکا تھا۔ ایک دو تین اور اب وقت نے پھڑے ہوئے باپ بیٹے کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔ لمحے بھی جیسے سانس روکے اس ملاپ کو دیکھنے کے لئے ٹھہر گئے۔

”پپا.....!“ شرجیل کے لپ کپکپائے مگر آواز اندر ہی دب گئی ان تینوں کی وجہ سے۔  
”ٹھیک سے مانگو، جذباتی جال نہ پھنکنا۔“ عاصمہ نے قریب آ کر چٹکی بھری تو شرجیل کا دل ایک لمحے کے لئے بند ہو گیا۔ وقت اور حالات نے آج باپ کے سامنے بھکاری بنا دیا تھا۔ اندر طوفان اٹھا رہا تھا، آواز حلق میں پھنس گئی۔

”خدا کے نام پر صاحب جی.....! اللہ آ..... آپ کا بھلا لک..... کرے گا۔ ہم بے آسروں کو اللہ کے نام پر دے جائیں۔“

نجانے یہ چند الفاظ کیسے ادا ہو پائے۔ شرجیل کے جسم پر لرزہ طاری تھا، وہ بیہوش ہونے کو تھا۔ عاصمہ اور نادرہ نے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ باپ کے قدموں میں ڈیر ہو چکا ہوتا۔ ابھی آزمائش باقی تھی۔ واصف جس بیٹے کی جدائی میں دیوانے ہوئے پھر رہے تھے، وہ عجیب حلیے میں ان کے سامنے بھکاری بنا کھڑا تھا۔ بیٹے کا ہاتھ وقت نے بھکاری کی صورت باپ کے سامنے پھیلا رکھا تھا۔ واصف نے ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی۔ شرجیل تڑپ تڑپ گیا کہ پپا کہہ کر ان کے سینے سے جا لگے پھر چاہے وہ اسے دھتکار کر خود سے الگ کر دیں مگر سینے میں لگی آگ ایک بل کے لئے تو بجھ جائے۔ واصف نے جیب سے دوسرے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تو



جیسے وقت بھی رو پڑا۔

”تم لوگوں کی دعائیں بہت قبول ہوتی ہیں۔ دُعا کرو میرا سکون مجھے مل جائے، میرا پروردگار مجھ سے راضی ہو جائے اور..... اور.....“

واصف کے دل میں شدید درد اٹھا، وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے اور وہ بد نصیب طلب کا خالی کھنڈل لئے دُور تک ان کو دیکھتا رہا جن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے خالی کھنڈل میں ایک ہی لفظ گونج رہا تھا ”تم لوگوں کی دعائیں، تم لوگوں کی دعائیں، تم لوگوں کی دعائیں۔“

”نہیں!..... میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں پاپا!.....!“ وہ چلاتا رہا مگر وہ تینوں اسے گھسیٹ کر لے گئیں۔ پہچان، پرکھ کی وہ جنگ ہار چکا تھا اور اب اس کے ساتھ وہی ہو رہا تھا جو بارے ہوئے کے ساتھ ہوتا ہے۔

کھنڈل اگر ایک بیٹے کا خالی لوٹا تھا تو وصل کے سکے باپ کے کھنڈل میں بھی نہیں گرے تھے۔ دونوں ملن کے ایک موڑ پر مل کر پھر جدا ہو گئے تھے اور یہ احساس باپ کے دل میں درد کی صورت میں رہا تھا اور کرب کی صورت میں بیٹے کے دل میں، آج وہ اپنی آخری جنگ ہار چکا تھا مگر کون تھا جس کے شانے پر سر رکھ کر وہ اپنی ہار کا ماتم مناتا آج وہ اس قدر روپا تھا کہ وہ سب کی سب اس کے ساتھ مل کر روئی تھیں۔ شنیو نے تو شرجیل کے سارے آنسو اپنے آنچل میں جذب کر لئے۔ آج اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا، یوں لگتا تھا کہ دُور کہیں آس و امید کا جو ننھا سادیا تھا، باریک سا تارہ تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔

”کہا تھا ناں..... نہ مر، وہ تجھے پہچان کر بھی نہ اپنائیں گے۔“

”تم میرے گھر میں پیدا ہی نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ شرم آتی ہے مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے ایب نارل۔“

کبھی عاصمہ اور نادرہ کے، کبھی پاپا کے الفاظ ہتھوڑے بن کر اس کے دماغ پر برس رہے تھے تو آنسوؤں کو روکنا، ان پر ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ سب لوگ اب اسے اچھی لگنے لگی تھیں، پیار کرتی تھیں، آج کوئی اپنے دھندے پر نہیں گئی تھی، صرف اس کی دلجوئی میں لگی رہیں اور اب سب کے خزانے فضا کے سکوت کی چادر کو تار تار کر رہی تھیں اور اس کی سسکیاں چپ چاپ گزرتے لمحوں کی پلکیں غم کر رہی تھیں۔

”میں..... میں ایسا کیوں ہوں.....؟ میں مرد ہوں.....؟ ہاں مرد ہوں، پھر یہ لوگ تسلیم کیوں نہیں کرتے.....؟ مگر مجھے اب یہ تسلیم کروانا ہے، منوانا ہے کہ میں انسان ہوں، مرد ہوں۔ مجھے اپنی پہچان کروانی ہے، ہاں ہر صورت، ہر حال میں۔“

وہ اپنی چار پائی پر لیٹا آسمان پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا پھر اسے لگا جیسے رگوں میں خون کی بجائے آگ بھر گئی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ اسے ارد گرد ان سب سے گھن آنے لگی، بدبو آنے لگی، اس نے بازو سے ناک بند کر لی۔

”اے حسینہ!..... لے سگریٹ پیئے گی.....؟“ راشدہ اسے بیٹھے دیکھ کر سگریٹ سلا کر لے آئی تو اس نے سختی اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے تو عورت ہے ورنہ مرد تو سگریٹ جھٹ پی لیتا ہے۔ لے اگر مرد ہے تو پی

کر دکھا۔“

راشدہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ شرجیل کو دیکھ کر یوں دل بہلانے اس کے پاس آ کر الٹی سیدھی ہانکنے لگی تو اس کی ناک سے لکڑا دھواں شرجیل کے حلق کو کڑوا کر گیا۔ اگر سگریٹ اس کی مردانگی کا ثبوت دیتا ہے تو وہ ایسا ہر زہر پینے کو تیار تھا۔

”ہاں!..... میں پیوؤں گا۔ بول شرط لگا۔ میری مردانگی ثابت کرنے کے لئے کتنے سگریٹوں کا دھواں کافی ہوگا.....؟“

اور پھر وہ جوش میں ایک ساتھ کئی سگریٹ پی گیا اور پیتا ہی چلا گیا تو راشدہ خوفزدہ ہو گئی اور سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور مسل کر پھینک دیا۔

”بس!..... بس!.....! بس مان لیا تو مرد ہے۔“

”کیا.....؟ کیا تو.....؟ تم نے مان لیا ناں میں مرد ہوں.....؟“ اس کی بے یقینی کے نقل ٹوٹنے لگے۔

راشدہ تو خوفزدہ ہو کر کہیں جا چھپی کیونکہ اسے نہیں معلوم تھا کہ انجانے میں اس نے اسے کس راستے پر ڈال دیا ہے۔ اس کی گشہ منزل کا پتہ دے دیا ہے۔ پھر وہ لیٹا سوچتا رہا، بہت سی نئی نئی باتیں، نئے نئے رازوں کی گھٹیاں کھلتی چلی گئیں۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ کب اٹھا، اندر گیا اور اپنے کپڑے جو اس نے بڑے سنبھال کر رکھے تھے، پہنے۔ جب اس نے ان کا لباس اُتار تو لگا اس نے اپنی بے یقینی، بزدلی کو اتار پھینکا ہے۔ سب بے سدھ سو رہی تھیں۔ وہ قدم اٹھاتا رہا، روشنی ہو سکتی رہی۔

”یا اللہ مرد.....!“ اس نے پورے یقین کے ساتھ اللہ کو پکارا اور دیوار کو دگیا اور پھر رات کی تاریکی اس کے شعور کی روشنی میں اپنا وجود مٹاتی چلی گئی۔ وہ بس بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ ایک عجیب خوف تھا کہ کوئی اسے پکڑ نہ لے یا عاصمہ اور نادرہ نہ آن دیو جس دروازے پر وہ آ کر کر گرا وہ اللہ کے گھر یعنی مسجد کا گیٹ تھا۔ کون تھا جو اللہ کا ورد کرتا بھاگا چلا جا رہا تھا اور جس دروازے پر وہ آ کر کر گرا وہ اللہ کے گھر یعنی مسجد کا گیٹ تھا۔ کون تھا جو اللہ کے گھر میں آنے سے روکتا۔ وہ واش روم میں گھس گیا، غسل کر کے باہر نکلا تو وہ نکھر چکا تھا۔ بے یقینی کا آسیب پیچھا چھوڑ چکا تھا۔ اتنے میں فجر کی اذان ہونے لگی تو وہ صفیں سیدھی کرنے لگا، وضو کر کے گیٹ پر نظریں جمائے پاپا کا انتظار کرنے لگا مگر کبھی کبھی انتظار کسی ظالم دیو کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شرجیل کی بری حالت تھی۔ انجانے خوف اور خدشات سے دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

”پاپا!..... آجائیں پلیز!.....! لیکن اگر عاصمہ کی بات درست ہوئی انہوں نے پہچان کر نہ..... نہیں۔“

اس خیال سے جوش کے اُبال کم ہونے لگے، خون پھر جمنے لگا، اس کی آنکھیں پتھر اُگئیں مگر واصل طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں آ سکتے تھے اور شرجیل کے انتظار کے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی آنکھوں کے رانے ہوتے ہوئے اس کے گریبان میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ اٹھ کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ اللہ کے ذکر سے سکون اندر تک اُترنے لگا تو اس نے دامن پھیلا دیا۔

”میرے پروردگار.....! اب تو میری خطا معاف فرما، تو نے مجھے مرد پیدا کیا ہے تو یا اللہ!.....! میری مدد فرما۔“

• • •



”عطیہ خاتون.....! ہم پاکستان کیوں جا رہے ہیں.....؟ آپ کو اور بابا کو ہارون سے میرا بات کرنا ناپسند تھا ناں، وہ تو اب ختم ہو گئی، اب ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔“

خولہ بہت بکھری ہوئی، ٹوٹی ہوئی، محبتوں کو ترسی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ اس حد تک کمزور تھی کہ تکلف کو بھی اخلاص سمجھ کر جاٹا کر دیتی تھی اور ہارون کو تو وہ نجات دہندہ سمجھتی تھی مگر اس کے رویے نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دوسرا وہ اس ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔ اب نئے ماحول میں وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک تو ہارون کے رویے سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی، رورور کر اس نے اپنی آنکھیں سو جالی تھیں۔

”تم پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتیں بیٹا.....؟ پاکستان ہمارا ملک ہے، تم نے ابھی دیکھا نہیں، وطن کی محبت کو محسوس نہیں کیا، کر لو گی ناں تو کبھی کسی اور ملک میں رہنے کا تصور بھی نہیں کرو گی۔“

اس کے سوال کو نظر انداز کر کے عطیہ خاتون نے اس کی متورم آنکھیں صاف کر کے پیار سے سمجھایا۔

”اگر اپنے وطن کی محبت میں اتنی ہی طاقت تھی تو بابا نے پاکستان کیوں چھوڑا.....؟“

اس کے اندر کی بغاوت سوال بن کر سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس کے اس چپے سوال پر عطیہ خاتون خاموش سی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ انہوں نے گہرا سانس لیا اور اٹھ کر الماری میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔

”ہوں گی کچھ مجبوریاں تمہارے بابا کی۔“

”مجھے میری ماما سے الگ کرنا بھلا اس سے بڑی ان کی کیا مجبوری ہو سکتی تھی۔“

خولہ سب کچھ جان گئی تھی، سمجھ گئی تھی اور اب تو اسے اپنے بابا سے چلے ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی ایب نارمل زندگی کا ذمہ دار صرف ان ہی کو سمجھتی تھی۔ اس کی اس حقیقت پر یہی بات پر عطیہ خاتون نے چونک کر اسے دیکھا۔

سچائی بھی تو یہی تھی جواب کیا دیتیں۔

”دیکھو خولہ.....! والدین کی مجبوریوں کو سمجھنا چاہئے، ہو گی ان کی کوئی مجبوری اور ہے اب کوئی مجبوری کہ تمہیں پاکستان بھی رہے ہیں۔“

عطیہ خاتون نے حسب سابق شہباز کا کھوکھلا دفاع کیا اور دفاع کی اس کمزور دیوار کو خولہ نے ایک جھٹکے سے گرا دیا۔

”آئی تو عطیہ خاتون.....! نہ اس وقت ان کی کوئی مجبوری تھی نہ اب ہے۔ یہ صرف بابا کی خود پسندی ہے۔ وہ اپنی ہر سوچ، ہر دلیل کی جنگ جیتنا چاہتے ہیں۔ خواہ اس کے لئے ان کو اپنی بیٹی کے احساسات کو چکھنا پڑے یا بیوی کے۔ ان کو تو بس جیتنا ہے۔“

دو مختلف سوچیں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو ان کے درمیان آنے والی تیسری شخصیت منتشر ہو جاتی ہے اور خولہ نے جب شعور کے سن میں قدم رکھا تھا تب سے وہ بابا کے ہر فیصلے اور سوچ سے اختلاف رکھتی تھی مگر اس میں اظہار کی جرأت نہیں تھی۔ یہ سب تو ہارون کی دوستی کا فیض تھا کہ اس سے اپنی سوچ کا اظہار کرنے لگی تھی۔ بغاوت کے اظہار کے طریقے معلوم ہو گئے تھے اور شہباز اس سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ مگر شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ اندھیرے کو ننگے کے لئے روشنی کی ٹمٹمی سی کرن بھی کافی ہوتی ہے۔

”خولہ بیٹی.....! دیکھو والدین اپنی اولاد کے لئے جو فیصلہ کرتے ہیں بہترین ہی کرتے ہیں۔“

عطیہ خاتون خولہ کے اس بدلے ہوئے انداز اور سوال کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔

”جی ہاں.....! وہ والدین اور ہی ہوں گے جو اپنی اولاد کی خاطر اپنے اختلافات بھلا کر ان کی زندگی اور مستقبل کے لئے ایک ہو جاتے ہوں گے۔ مگر میرے والدین نے کیا کیا میرے لئے۔ اپنی اپنی انا کی جنگ اپنے کے لئے مجھے داؤ پر لگا دیا۔ عطیہ خاتون.....! آپ بتائیں میں ایسی ندی ہوں کہ نہیں جس کے ماں باپ کناروں کی طرح ساتھ ساتھ چل رہے ہیں مگر مل نہیں سکتے کیوں ایسا کرنے والے والدین نے کبھی اپنی اولاد کے اندر ہوتی توڑ پھوڑ کو محسوس کیا ہے۔ نہیں کرتے ناں تب ہی تو توڑ دیتے ہیں۔ ایسے والدین اولاد کو ڈیکوریشن بن سکتے ہیں جہاں دل چاہا اٹھا کر رکھ دیا عطیہ خاتون.....! مگر میں اب ڈیکوریشن پیش نہیں بن سکتی۔“

خولہ فٹ کر کھڑی تھی۔ عطیہ خاتون خوفزدہ ہو گئیں کیونکہ وہ شہباز کو بھی جانتی تھیں۔ وہ کوئی بھی سخت ایکشن لینے سے نہیں بچ سکتیں گے۔

”خولہ.....! تم جو کہہ رہی ہو وہ درست ہے لیکن سو فیصد درست نہیں۔ دیکھو بیٹی.....! اب ماضی میں کیا ہوا، کس کا قصور تھا، یہ تو ہم نہیں جانتے۔ جان.....! ایسا کرتے ہیں ہم ایک سائیڈ یعنی تمہارے بابا کو تو کچھ نہ کچھ سمجھ ہی گئے ہیں ان کو ہم ٹوٹی راگ نہیں کہہ سکتے۔ اب ہمیں دوسری سائیڈ کو جاننے کے لئے تصویر کے پیچھے تو ہمانا پڑے گا ناں اور اس کے لئے ہمیں پاکستان جانا پڑے گا وہاں جا کر ہم تمہاری ماما سے ملیں گے۔“

”عطیہ خاتون.....! ہم پاکستان جائیں گے ضرور مگر میں اپنی ماما سے ہرگز نہیں ملوں گی۔“

بچپن کی تمام محرومیاں خولہ کے لہجے میں آئیں۔ اس نے بھیکے کناروں کو سختی سے رگڑا اور باہر نکل گئی۔ اسی وقت شہباز اندر آئے۔ انہوں نے پلٹ کر خولہ کو جاتے دیکھا۔

”عطیہ خاتون.....! کیا کہہ رہی خولہ.....؟“ ان کا انداز نا معلوم سا اندیشہ لئے ہوئے تھا۔ عطیہ خاتون نے ان کی طرف دیکھا۔ بہت کچھ تھا ان کی خاموش گہری نظر میں جسے شہباز نہیں سمجھ سکے۔

”کیا کہہ رہی تھی معلوم نہیں شہباز صاحب.....! کبھی کبھی ہمیں لفظوں کی بازگشت اتنی دیر میں سنائی دیتی ہے کہ پلٹ کر دیکھنا پکارا ہوتا ہے کیونکہ نہ لفظ ہوتے ہیں نہ لفظ ادا کرنے والا، صرف گونج باقی ہوتی ہے۔ بہر حال وہ پاکستان جانے پر راضی ہو گئی ہے۔“

عطیہ خاتون نے بمشکل اپنی زندگی آواز میں قابو پایا اور سامان پر ایک نظر ڈالی۔ سب کچھ تیار تھا اس وقت ایئر پورٹ پر کھڑے شہباز کے دل میں عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اک انجانا خوف تھا کہ کہیں خولہ ماں کو ڈھونڈ کر اس کے پاس نہ چلی جائے۔ ہر چند کہ انہوں نے عطیہ خاتون کو بے شمار ہدایات کر دی تھیں کہ خولہ کو اس کی ماں کے سائے سے بھی دور رکھا جائے۔ تب اک بہت کر بناک سی مسکراہٹ عطیہ خاتون کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ اس وقت عجیب گھبراہٹ بیٹی کی جدائی اور بہت سے واہیات تھے جو ان کو گھیرے ہوئے تھے۔

”خولہ.....! میری جان.....! میری بچی.....! تم میری عمر بھر کی جمع پونجی ہو، میرا مان ہو، تمہیں اندازہ نہیں تم مجھے کتنی عزیز ہو، میں مانتا ہوں کہ بسا اوقات میں زیادتی کر جاتا ہوں لیکن یہ بھی محبت کا ایک روپ ہے۔“

وہ اس کا سرد ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لئے کپکپاتے لہجے میں بول رہے تھے۔ وہ خشک آنکھیں لئے



اپنے بابا کو دیکھ رہی تھی۔ اس آخری جملے پر ایک تلخ سلگتی مسکراہٹ آگئی۔

”بابا.....! محبت کا کوئی خوبصورتی روپ بھی ہے۔“

اس کے زندہ ہونے لہجے میں ڈھلا یہ چھوٹا سا جملہ اس کی زندگی بھر کی محرومیوں کا ترجمان بن گیا۔ شہباز لا جواب ہو کر اسے دیکھے گئے۔ عطیہ خاتون سب کچھ سمجھ کر خولہ کا ہاتھ تھامے شہباز کو خدا حافظ کہہ کر اندر لاؤنج میں چلی گئیں۔ جہاز نے فیک آف کیا تو شہباز کو اپنا دل نکلتا محسوس ہوا۔

”بھلا اس سے بڑھ کر محبت کا کون سا خوبصورت روپ ہو سکتا ہے بیٹا.....؟“ انہوں نے آسمان کی بلندی پر پرواز کرتی بیٹی کے سوال کا جواب دیا اور لوٹ آئے۔

لاہور آئے ان لوگوں کو ایک ماہ ہو چلا تھا۔ خولہ کو پسند تو آیا تھا مگر دل کی بے قراری کو قرار نہیں تھا۔ بوریٹ کا شکار تھی زندگی۔ اپنی بڑی خوبصورت بچی کوٹھی میں دُم گھٹنا اس کا۔

”بی بی.....! باہر کوئی صاحب آئے ہیں آپ سے ملنے کو کہتے ہیں۔“ ملازم کے کہنے پر عطیہ خاتون نے گیٹ تک آگئیں اور آنے والے کو اجنبی نظروں سے دیکھا۔

”محترمہ خاتون.....! میرا نام ظفر ہے۔“ آنے والے نے اپنا تعارف کروایا۔

”جی.....!“ یہ نام، یہ چہرہ عطیہ خاتون کے لیے قطعی انجان تھا اور وہی اجنبیت ان کی آنکھوں اور لہجے

میں تھی۔ وہ جی کہہ کر ان کا تعارف حاصل کرنا چاہ رہی تھیں اور ظفر یہ بات سمجھ چکے تھے۔

”بات یہ ہے محترم خاتون.....! کہ میں چند ماہ قبل ہی کینیڈا سے پاکستان شفٹ ہوا ہوں اور آپ کے گھر

کے عقب میں جو کوٹھی ہے اس میں اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر ہوں لیکن اب کینیڈا.....“

”ظفر صاحب.....! یوں گیٹ پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں اس لیے آپ اندر تشریف لائیے

اور بات کر لیتے ہیں۔“ ظفر بھرت اچھے اور محرز انسان ہیں یہ جان لینے میں عطیہ خاتون کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ درم کوڑ رہا تنگ روٹھنے کا اشارہ کر کے آگے چل پڑیں۔

”جی.....! تو اب فرمائیے آپ کیا کہہ رہے تھے.....؟“

ملازم کو چائے لانے کا اشارہ کر کے خود ان سے مخاطب تھیں۔

”شکریہ محترمہ.....! جی تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم بڑے سکون سے رہ رہے تھے مگر اچانک مالک مکان کو

ضرورت پڑ گئی ہے، وہ اپنی کوٹھی نکال رہا ہے اور خریدار خود آکر رہنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں دیس سے نکالنے کا حکم

باری کر دیا گیا ہے۔“

”ظفر صاحب.....! میں کچھ سمجھ نہیں پائی کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں.....؟“

عطیہ خاتون واقعی اُلجھے لہجے میں بولیں تو ظفر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”آپ سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کوٹھی کا ایک پورشن ہمیں کرائے پر دے دیجئے

ایک آدھ سال کے لیے، اس دوران ہم اپنا گھر تیار کر لیں گے میری ایک بیٹی زوہا ہے اور ایک بیٹا نعمان اور بیگم

البین جائے آپ کو کسی سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

آفر کافی مختلف تھی۔ انہوں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ کوٹھی کرائے پر دیں گے لیکن ظفر صاحب انہیں

معتول انسان لگے تھے اور مشکل میں تھے مگر جب ان کے پاس مالکانہ حقوق ہی نہیں تھے پھر وہ کوئی فیصلہ کیونکر کر

سکتی تھیں۔



”مترم خاتون.....! آپ فکر مند نہ ہوں اگر آپ دینا نہیں چاہیں تو زبردستی نہیں۔ وہ دراصل میری اور بیگم کو آپ لوگ بہت اچھے لگے۔ جب آپ لوگ شفٹ ہوئے تو ہم نے دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہا مگر آپ بٹی نے ہمارے ملازم کو ڈانٹ دیا تب ہم خاموش ہو گئے، جیسے آپ کی مرضی۔“

ظفر دُکھوں کے وسیع صحرا سے گذر کر آئے تھے اور خاموشیوں کی زبان کو بہت اچھے طریقے سے سمجھتے تھے اس لیے عطیہ خاتون کی خاموشی کو سمجھتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو عطیہ خاتون چونک سی گئیں۔ شہباز کی کوشی بہت بڑی تھی اور ان دونوں کے زیر استعمال فقط ایک چھوٹا سا پورشن تھا اور اگر ظفر صاحب اور ان کی ایک پورشن دے دیا جاتا تو سناٹوں میں کمی ہو سکتی تھی مگر وہ مختار کب تھیں کہ کوئی فیصلہ کرتیں۔ ہاں شہباز سے بات تو کی جاسکتی تھی تب ہی انہوں نے ظفر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ارے ظفر صاحب.....! آپ تشریف رکھیے، آپ ہمارے مہمان بھی ہیں اور پڑوسی بھی، پہلی بار آ رہے ہیں، چائے پیجیے۔ دراصل میں شہباز کی بیٹی خولہ کی گارجین ہوں اس لیے میں خود سے تو کوئی بات کہہ نہیں سکتی۔ ضرور ہے کہ جیسے ہی شہباز صاحب کا فون آتا ہے میں ان سے بات کر کے آپ کو بتا سکتی ہوں۔ آپ اپنا فون دے دے سکتے ہیں.....؟“

”اوہ.....! تو وہ آپ کی بیٹی نہیں، شہباز صاحب کی ہے۔ اپنی ویز.....! آپ میرا کارڈ رکھیے ان سے بھی بات ہو مجھے مطلع کر دیجئے گا۔“ ظفر نے اپنا وزیننگ کارڈ نکال کر عطیہ خاتون کی طرف بڑھایا۔

”جی ضرور.....! ویسے ظفر صاحب.....! آپ اپنی بیگم اور بچوں کو لے کر آئیے گا، خولہ بھی پہلی بار پاکستان آئی ہے ناں تو ذرا اجنبیت اور تنہائی فیل کر رہی ہے۔“ ظفر عطیہ خاتون کی ممانعت اور رکھ رکھاؤ کی داری سے بہت متاثر ہوئے ورنہ ملازم نے جو خولہ کے غصے کا نقشہ کھینچا تھا اس سے تو وہ گھبرا ہی گئے تھے۔

”جی ضرور.....! اور آپ بھی آئیے گا۔“ ظفر کپ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

”انشاء اللہ.....!“ عطیہ خاتون ان کو رخصت کر کے اپنے کمرے کی طرف جاری تھیں کہ خولہ نے آیا۔ خولہ پھری ہوئی تھی، اسے سخت چڑ ہو رہی تھی ماما، پاپا، عطیہ خاتون سے، خود سے، پاکستان سے اور اپنے ماحول سے، اس خوبصورت کوشی سے جو اس کے بابا نے صرف اس کے لیے بڑے چاؤ اور محبت سے سرشار ہو کر بنوائی تھی اور گیٹ پر سنہری حروف میں اس کا نام کندہ کر دیا تھا جس کو دیکھ کر خولہ کو شدید غصہ آ گیا تھا۔ تب اس نے زبردستی لہجے میں عطیہ خاتون سے کہا تھا۔

”یہ محبت کے قاتل، محبت کا مقبرہ بڑا خوبصورت بناتے ہیں، ہے نا عطیہ خاتون.....!“ اس کے اندر اُٹھتے طوفان کی تباہ کاریاں اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھیں۔ لہجہ اتنا تلخ کہ عطیہ خاتون اس کی کڑواہٹ محسوس کرتی رہیں اور اس وقت بھی وہ عطیہ خاتون کے سامنے آن کھڑی ہوئی جو اس سے بچ کر گزر جانا چاہتی تھیں۔

”ایک بات تو بتائیں عطیہ خاتون.....! میں اس دُنیا میں اپنی مرضی سے آئی ہوں.....؟ یا آ کر میں نے کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے.....؟ یا دُنیا میں آ کر مجھ سے ایسا جرم سرزد ہو گیا ہے کہ اس کی سزا مجھے ملتی رہنی چاہیے.....؟ بتائیے عطیہ خاتون.....! کیوں، کیوں.....؟“ تھا ہوا طوفان بند توڑ چکا تھا، رُخساروں کی زمین

اب کرتا ہوا اس کے وجود کو تر کر رہا تھا، اسے جھٹکے لگ رہے تھے، اس کے فطر کے تیروں نے عطیہ خاتون کے دل میں گویا زخم کر دیئے تھے، اس کے لہجے اور آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ عطیہ خاتون کو اپنا وجود جھلٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”کم آن بے بی.....! یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے.....؟“

ان کو اس سے محبت بھی بہت تھی۔ وہ اسے دُکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”خولہ.....! مائی ڈیر بے بی.....! بتاؤ کیا بات ہے.....؟ کیوں اتنی پریشان ہو.....؟ اب کوئی نئی بات ہو گی ہے.....؟“ انہوں نے اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں تو وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ وہ دُکھ اور حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”عطیہ خاتون.....! میں نے آپ کا اور بابا کا آخر کیا بگاڑا ہے.....؟ آپ کیوں مجھے سکون سے جینے نہیں دیتے.....؟“ وہ جھٹکے سے بیٹھ کر دھاڑی۔

”میں سمجھی نہیں بیٹا.....! یوں تو وہ اس کے دل پر گزرنے والی ہر کیفیت کو سمجھ ہی جایا کرتی تھیں مگر اس وقت وہ کچھ جان نہیں پار ہی تھیں۔

”کیوں آیا تھا یہ شخص.....؟“ عطیہ خاتون سمجھ گئی اور ساری بات بتادی۔

”امپا سبل.....! آپ ان لوگوں کو ہرگز کراہنے پر پورن نہیں دیں گی، سمجھیں آپ.....! کیوں آپ دونوں میرا سکون بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں.....؟ تنہائی، عطیہ خاتون.....! یہ تنہائی مجھے بہت پیاری ہے اور یہ وہ سنتی ہے جو میں کہنا چاہتی ہوں، میں اس سے سارا وقت اپنے دل کی باتیں کرتی ہوں مگر مجھے اس نے کبھی لو کا نہیں کہ یہ بری بات ہے یہ نہ کہو، وہ بری بات ہے وہ نہ کہو، لوگ کیا کہیں گے، یہ میری دوست ہے، میرے دل کی باتیں سنتی ہے اور اپنے ساتھ لگا کر پیار بھی کرتی ہے اس لیے سوری.....! میں اپنی تنہائی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی، سمجھ گئیں آپ.....!“

وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی، ایک ایک لفظ اس کی محرومیوں کی اُداس، ویران تصویر بناتا چلا گیا، اتنی واضح کہ انجان بندہ بھی اس کی کہانی جان جاتا کہ وقت اور حالات نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، رشتوں پر اس کا اعتبار اُٹھا تو کیوں اُٹھا۔ ماں نے اسے چھوڑ کر باپ کے سپرد کیوں کیا، باپ نے اسے اپنا کر، اس کی روح کو مار کر، اس کی ماں کی بے وفائی میں منہ چھپا لیا اور ہارون جس نے اس کے گھر اپنے قیام کو رنگین بنانے کے لیے اس کی زندگی کے پھیکے خاکے میں اپنی پسند کے رنگ بھر لیے، انجوائے کیا اور جب اس نے ان رنگوں کو اپنانا چاہا تو اس نے بے وفائی کے چھینٹوں سے سارا کینوس اُجاڑ کر رکھ دیا، رہ گئیں عطیہ خاتون تو وہ اپنی خادمانہ محبت میں ہر وقت اسے سمیٹ لینے کو تیار رہتیں مگر اسے کہا! تسکین مل سکتی تھی، کسی نے کب اس کا خیال کیا تھا، اس کی خوشی کے ننھے منے جگنو راتے بھول گئے تھے، اس کی خواہشوں کے دیے بجھ چکے تھے اور اب تو اس کے اندر اس قدر اندھیرا اور سناٹا تھا کہ نہ اسے روشنی کی طلب تھی نہ کسی آہٹ کو اپنی سماعتوں کے بند کواڑ کھولنے کی اجازت دے سکتی تھی اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی تنہائی کو کوئی مرتعش کرے۔

”مگر کیوں بیٹا.....! اتنا بڑا گھر ہے، اچھا ہے وہ آجائیں گے تو ہم بھی بے فکر ہو جائیں گے ورنہ کیلے ذرا



خوف سا محسوس ہوتا ہے۔“

”خوف.....؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولتی ان کی طرف مڑی۔

”کیوں عطیہ خاتون.....! یہ تو ہمارا اپنا ملک پاکستان ہے، ہم یہاں بہت محفوظ ہیں، یہاں آپ کو خوف

کیوں آنے لگا کہ آپ کو کسی دوسرے سہارے کی ضرورت پڑ گئی.....؟“

اس کا لہجہ ہر میں بجھا ہوا تھا، نتھنٹھنے غصے سے پھول رہے تھے، ہونٹ سکڑے ہوئے تھے۔

”کبھی کبھی سہارا ہماری کوئی مجبوری نہیں ہوتا بیٹا.....! کبھی کبھی ازراہ ہمدردی ہمیں دوسروں کا ہاتھ تھا۔“

پڑتا ہے۔ ظفر صاحب بہت مجبور ہیں، کینیڈا سے شفٹ ہوئے ہیں، ان کی بیگم بیمار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ.....“

”لو کھڑاتے سہارے بے کار ہوتے ہیں عطیہ خاتون.....! میں نے کہہ دیا کہ اس گھر میں ہمارے سوا

کوئی نہیں رہ سکتا۔“

چڑھا ہوا سمندر اترنے لگا تھا، چہرے کی سختی کم ہونے لگی تھی، ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر خولے ہوئے چپکے

گئی۔ عطیہ خاتون اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلاتی رہیں۔ انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں بالا تھا، صرف جنم ہی نہیں دیا تھا

ورنہ تو ان کی ممتا کے خزانے پر خولہ کا بلا شرکت غیرے قبضہ تھا۔ وہ ان کو جان سے بھی زیادہ پیاری تھی، اس کی

نفسیات کو اچھی طرح جانتی تھیں۔

”عطیہ خاتون.....! آپ کو معلوم ہے کہ میری ماما کیسی اچھی کہہ رہی.....؟“

خولہ کے اندر طوفان موجزن ہونے لگا تھا پھر سے اسے تو رشتوں نے روپ بدل بدل کر دکھ دیئے تھے

کہ وہ خود کو کھلونا سمجھنے لگی تھی، کہنے کو وہ بابا کی خوشیوں کا، محبتوں کا مرکز تھی مگر کس قدر اندھیر اور سناتا تھا اس

اندھیر۔ وہ اپنی سوچوں میں ابھی ایسے ہی بے سائل سوال کرتی رہتی اور وہ اپنی محبت سے جواب سے مطمئن

کی کوشش کرتیں۔

”نہیں جان.....! میں آپ کی ماما کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی دیکھا ہے مگر اتنا مجھے یقین ہے

کہ وہ بہت بہت اچھی خاتون ہوں گی۔“

ہمیشہ کی طرح عطیہ خاتون نے سادہ سا جواب دیا تو خولہ ان کو بخوردی کھینچتی ہوئی بیٹھ گئی۔

”عطیہ خاتون.....! میری ماما بھی بہت اچھی خاتون ہوں گی اور بقول آپ کے مجھے بے پناہ چاہتی ہوں

گی اور اپنے بابا کی محبت کا ڈرامہ تو میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں مگر..... مگر عطیہ خاتون.....! ان دونوں کی محبتوں

کے خزانوں میں کیا میرے نام کا ایک سکہ بھی نہیں جس پر صرف میرا نام درج ہو.....؟ جس سے میں اپنی زندگی کی

خوشیاں خرید سکوں.....؟ کتنی کنگال ہوں ناں میں، ان دونوں کی زندگی میں ایک لمحہ بھی میرے نام کا نہیں جو

انہوں نے صرف اور صرف میرے لیے جیا ہوا، انہوں نے جی تو اپنی محبت جی، انہوں نے جی تو اپنی نفرت جی،

بیٹی تو کہیں ہے ہی نہیں ان کی زندگی میں۔“

ایک ایک کر کے سارے ہی زخم ادھڑ گئے تھے، درد جاگ اٹھا تھا، وہ پھر رونے لگی کتنی، ویران اور بے

رنگ زندگی تھی، اب ان باتوں کا عطیہ خاتون کے پاس کبھی کوئی جواب نہیں ہوتا، وہ چپ چاپ اپنی محبتوں کے

بھاہے اس کے زخموں پر رکھتی چلی جاتیں تو ایسے میں خولہ کو دنیا میں صرف وہی اچھی لگتیں، انہی سے پیار محسوس

تھی۔

”عطیہ خاتون.....! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ میری سگی ماما ہوتیں، بابا نے آپ سے شادی کیوں نہیں

کی.....؟ اگر ایسا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا عطیہ خاتون.....! آپ میری اپنی سگی ماما ہوتیں۔ آپ کے تمام وقت پر،

تمام جذبول پر صرف میرا حق ہوتا۔ آپ اب بھی تو کتنی یک اور حسین ہیں، اب بھی تو بابا آپ سے شادی کر سکتے

ہیں ناں.....! ہیں عطیہ خاتون.....! پلیز.....!“

بولتے بولتے خولہ کے لفظوں اور سوچ کا رخ ایک عطیہ خاتون کی طرف مڑ گیا۔ وہ ان کے مقابل بیٹھ کر

بنور ان کو دیکھنے لگی جو پینتالیس سال کی عمر میں بھی حسین عورت تھیں۔ دین سے محبت اور لگاؤ نے ان کو تقدس

بخش دیا تھا۔ آج یوں اچانک خولہ نے درد دل پر دستک دی تو وہ چونک پڑیں۔ اس بستی کو اُڑے ہوئے ایک

زمانہ بیت گیا تھا، دل، احساس و دھڑکن، خواب، خواہش محض الفاظ تھے ان کے لیے، ہزار ہا معنی رکھنے کے

وجود بے معنی۔ انہوں نے لرزتی پلکیں اٹھا کر اس پیاری لڑکی کو دیکھا جس کو انہوں نے شہباز کی نہیں اپنی اولاد

بجھ کر پالا تھا۔ آج اس نے ان کے ماضی کی ورق گردانی شروع کر دی تو وہ پریشان ہو کر اُچھ گئیں۔

”واٹ ریش خولہ.....! یہ خیال تمہارے ذہن میں آیا بھی کیسے.....؟ آئندہ سوچنا بھی مت۔“

نجانے کس راز کی پردہ پوشی کے لیے وہ سامنے دیکھنے لگیں ورنہ ان کو اس کی ذہانت سے خدشہ تھا کہ وہ بن

کے ساری کہانی سمجھ سکتی تھی۔

”کیوں.....؟ کیا بابا اچھے آدمی نہیں.....؟“ خولہ کو خود کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اتنی بے نیکی باتیں کیوں

کر رہی ہے۔ عطیہ خاتون نے چونک کر اسے دیکھا اور کڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہو خولہ.....! تمہارے بابا بہت اچھے ہیں مگر.....“

وہ بات اُدھوری چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں اور خولہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

شہباز نے روتی بلکتی ہوئی خولہ عطیہ خاتون کی گود میں ڈال کر کہا تھا۔

”عطیہ خاتون.....! میں لیلیٰ آپ کی گود میں ڈال رہا ہوں مگر مجھے عطیہ خاتون چاہیے۔“ کتنا اچھا لگا تھا

شہباز کے ہونٹوں پر یہ جملہ ”مجھے عطیہ خاتون چاہیے۔“ وہ اس جملے کے معنی اور مطلب اچھی طرح جانتی تھیں اور

انہوں نے سر توڑ کوشش بھی کی مگر وہ خولہ کے اندر پیدا ہوتی اور اس کے ساتھ پروان چڑھتی خود سری، محرومی اور

ہٹ دھرمی کو سندھانہ گئیں۔ وہ شہباز اور خولہ کے بیچ پس کر رہ گئی تھیں۔ ان کو بہت سی باتوں سے شہباز سے

اختلاف ہوتا تھا، وہ اعتدال پسند تھیں جبکہ شہباز شدت پسند۔ محبت ہو یا نفرت، شدت پسندی نے ان کی، لیلیٰ کی

اور خولہ کی زندگی تباہ کر دی تھی۔

”اوہ.....! کتنی دیر سے فون کی بیل ہو رہی ہے۔“ وہ جو بہت پیچھے چلی گئی تھیں ایک دم بیل کی آواز پر

چونک کر اُٹھیں۔ دوسری طرف شہباز ہی تھے، روز فون کرنا ان کا معمول تھا۔

”خیریت عطیہ خاتون.....! آپ لوگ سو گئے تھے کیا.....؟“

”جی نہیں تو..... بس.....“ اب عطیہ خاتون کیا بتائیں کہ وہ کہاں تھیں۔

”اچھا خیر.....! کہاں ہے خولہ.....؟ وہ سیٹ تو ہے ناں.....؟ آپ کو تنگ تو نہیں کر رہی.....؟ کچھ آپ



سیٹ سی رہتی ہے۔

”ہونہہ..... کیا خوب ادا ہے کہ مارے بھی اور تڑپنے بھی نہ دے..... خیر اسے چھوڑیے آج ایک صاحب آئے تھے۔“ اور عطیہ خاتون نے ساری بات بتادی۔

”ضرور ضرور عطیہ خاتون.....! مجھے آپ پر اعتماد ہے اگر آپ کو وہ لوگ اچھے لگے ہیں تو یقیناً ہوں گے۔ آپ ان کو ضرور رکھ لیجئے، ایک تو آپ لوگوں کی تنہائی دور ہو جائے گی دوسرا ان کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔“ شہباز نے جھٹ اجازت دے دی۔

”مگر خولہ کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی ہماری تنہائی میں ٹل ہو۔“

”عطیہ خاتون.....! آپ وہ کیجئے جس کو آپ مناسب سمجھتی ہیں، وہ بچی ہے، آپ ظفر صاحب کی بات سے بات کروادیں اور رکھ لیجئے، میں خولہ کی پسند کا پابند نہیں۔“

”پابند تو آپ صرف اپنی پسند کے ہیں شہباز صاحب.....! کوئی کیا چاہتا ہے.....! کوئی کہہ رہی ہے۔“

ایک کسک عطیہ خاتون کے دل میں اٹھی اور ریسور رکھ کر واش روم میں چلی گئیں۔ نماز کے بعد وہ لاؤنڈری میں آگئیں تو ڈکھ اور حیرت زدہ چہرے کے ساتھ وہ خولہ کو دیکھے گئیں جو ایزل پر کینوسی سجائے جو بنا رہی تھی وہ اس کی ڈپٹی کنکشن اور الجھاؤ اور بغاوت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ ایک بیہودہ سی تصویر بنا کر اس میں اُلٹے سیدھے اسٹروکس لگا رہی تھی۔ عطیہ خاتون غصے سے آگے بڑھیں۔ یہ تصویر ان کی تربیت کے منہ پر ٹھانچ رہی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تختی سے پکڑ لیا۔

”واٹ آر یو ڈوینگ خولہ.....! واٹ از دس.....! عطیہ خاتون کو تصویر سے گھن آرہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ان کو خولہ پر شدید غصہ آیا تھا۔ وہ پہلی بار اس چلائی تھیں۔

”دس از آرٹ عطیہ خاتون.....! آرٹ.....! خولہ انتہائی بے تحاشی سے ہلٹی، برش سے اپنے خوبصورت بالوں کو پیچھے کیا۔

”دس از ناٹ آرٹ.....! دس از نیوڈ آرٹ.....! انڈراشینڈ.....! اور میں نہیں یہ کام کرنے نہیں دوں گی سمجھیں۔“

عطیہ خاتون کے اندر جیسے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تو خولہ کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

”عطیہ خاتون.....! اپنی اوقات میں رہیے۔“

● ● ●

”مما.....! لیجئے میں آپ کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے ملک ٹیک بنا کر لائی ہوں۔“

”ہوں.....! تو اس کا مطلب ہے بیٹا.....! کہ ہم کو جو کھانا ملتا ہے وہ کسی اور کے ہاتھوں کا ہوتا ہے۔“

زوہا ماما کے لیے ملک ٹیک لے کر آئی تو ظفر بیٹی کو چھیڑنے لگے۔

”آپ جیلس کیوں ہوتے ہیں ماں بیٹی کے پیار سے.....؟“

”ہمیں بھی اگر ایک گلاس مل جاتا تو شاید ہمارے حسد کی آگ قدرے ٹھنڈی پڑ جاتی۔“

”آپ کو اور نچ جوس پسند ہے پاپا.....! یہ لیجئے۔“

زوہا نے اور نچ جوس کا گلاس پاپا کی طرف بڑھایا تو وہ کچھ کھیانے ہو کر کان کھانے لگے۔

”مما جان.....! ملک ٹیک اچھا بنا ہے.....! اور پاپا.....! اور نچ جوس پر فیکٹ بنانا.....! یہ تو زوہا.....!

”تمہارا میگو ٹیک۔“ نعمان ہاتھ میں دو گلاس لیے اندر آ کر ماں اور باپ سے پوچھنے لگا تو دونوں نے زوہا کو دیکھا جو شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

”اوہ.....! تو زوہا بیٹا.....! یہ ہیں تمہارے اپنے ہاتھ.....! تب ہی میں کہوں کہ تم نے ملک ٹیک بنایا کیسے.....! تمہیں تو وہ ہم ہی اتنے آتے ہیں کہ ہاتھ دھو کر گھسا دیتی ہو۔“

”تو کیا ہوا پاپا.....! بھائی کے اور میرے ہاتھوں میں کوئی فرق ہے.....؟“ وہ بھائی کے شانے سے جھول سکی۔

”ہاں.....! بہت فرق ہے.....! کہاں ایک چڑیل کے ہاتھ کہاں ایک خوب رو اسارٹ نو جوان کے ہاتھ۔“ نعمان نے اس کے بڑھے ہوئے ناخنوں کی طرف اشارہ کیا تو اس سے پہلے کہ زوہا کے تیز ناخن نعمان کے چہرے پر نشان چھوڑتے ملازم نے باہر کسی کے آنے کی اطلاع دے کر نعمان پر ممکنہ حملے کو روک دیا۔

”جی.....! میں معذرت چاہتا ہوں ظفر صاحب.....! مگر وہ لوگ بھی بہت مجبور ہیں، ان کو یہ گھر بہت جلدی چاہیے۔ دراصل انہوں نے اپنے بچوں کی شادیوں کرنی ہیں تو اسی گھر میں آ کر کرنا چاہتے ہیں تو میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا کہ آپ جلد ہی کوئی آرٹسٹ کر لیں تو بہتر ہوگا۔ دراصل میں رقم لے چکا ہوں اور اب مکان ان کو خالی کر دیا، صاف کر دیا کر دینا بھی میری ذمہ داری ہے۔“

”صابر صاحب.....! آپ درست کہہ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں بھی بہت جگہ کہہ چکا ہوں لیکن ابھی تک کوئی مناسب انتظام ہو نہیں سکا۔ آپ سے زیادہ میں پریشان ہوں، میری وائف بیمار بھی ہیں اور اس پچویشن نے ان کو ڈپٹی کوفٹ میں جلا کر رکھا ہے۔“ ظفر کے لہجے میں پریشانی بھی تھی اور کوفت بھی۔

”معذرت چاہتا ہوں ظفر صاحب.....! مجھے پورا احساس ہے آپ کی مجبوری کا، میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ آپ میرے گھر میں میرے ساتھ شیئر کر لیجئے۔“ خود صابر صاحب بھی نا دم تھے۔

”نہیں صابر صاحب.....! یہ بات قطعی مناسب نہیں، آپ کی اپنی فیملی ماشاء اللہ بڑی ہے یوں بھی.....! آپ ایسا کیجئے اگر کوئی اور بندوبست ہو سکے تو.....“

”ویسے ظفر صاحب.....! آپ کی بیک سائیڈ پر جو خولہ کاٹج ہے، سنا ہے دونوں ماں بیٹی اکیلی رہتی ہیں، چلے ہم دونوں مل کر ان سے بات کرتے ہیں۔“ صابر صاحب اپنے طور پر بڑے خوش ہو گئے۔

”نہیں صابر صاحب.....! میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی وہاں گیا تھا مگر وہ خاتون اس لڑکی کی گارجین ہیں، ماں نہیں، دوسرا اس کوٹھی کے اوپر شہباز صاحب لندن میں ہوتے ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ ان سے بات کر کے بتائیں گی، فون کرنے کا بھی کہہ رہی تھیں، تا حال تو نہیں کیا فون انہوں نے بہر حال آپ فکر نہ کریں میں ہفتہ بھر

اپنا کام کر رہی ہوں۔“

”مما.....! لیجئے میں آپ کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے ملک ٹیک بنا کر لائی ہوں۔“

”ہوں.....! تو اس کا مطلب ہے بیٹا.....! کہ ہم کو جو کھانا ملتا ہے وہ کسی اور کے ہاتھوں کا ہوتا ہے۔“

زوہا ماما کے لیے ملک ٹیک لے کر آئی تو ظفر بیٹی کو چھیڑنے لگے۔



میں یہ گھر خالی کر دوں گا۔“

”میں واقعی بہت نادوم ہوں ظفر صاحب.....! کہ آپ جیسے اچھے اور شریف لوگوں کو تنگ کر رہا ہوں۔“

”ارے صابر صاحب.....! میں سمجھتا ہوں، اگر ہم ایک دوسرے کی مجبوریاں نہیں سمجھیں گے تو زندگی مزید مشکل ہو جائے گی جو کہ میں نہیں چاہتا۔ میں تو خود شرمندہ ہوں کہ اپنی نااہلی کی وجہ سے صرف خود کو بلکہ آپ لوگوں کو بھی مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ ظفر صاحب واقعی شرمندہ تھے کیونکہ وہ آصفہ کی بیماری کی وجہ سے اپنے گھبرائے کہ بغیر کسی بندوبست کے پاکستان شفٹ کر گئے تھے اور اب ان کو بہت مسئلہ ہو رہا تھا۔

”اچھا.....! پھر اجازت دیں ظفر صاحب.....! معذرت کے ساتھ۔“

صابر صاحب چلے گئے تو ظفر متفکر چہرہ لیے اندر آ گئے۔

● ● ●

عطیہ خاتون کل سے بالکل خاموش تھیں۔ انہوں نے خولہ سے نہ تو اس کے چلنے پر باز پرس کی تھی نہ نکلنے کا اظہار کیا تھا، بس کسی اُداس ویران شام کی طرح چپ تھیں۔

”عطیہ خاتون.....! اپنی اوقات میں رہیے۔“ ایک چھوٹا سا جملہ تھا کہ ہم، جو ان کے اندر پھٹ کر ہر جذبے، ہر احساس کو مٹا گیا تھا۔ ان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب اندر اک جینے کی جو ذرا سی آرزو تھی وہ بھی مر گئی ہو۔ انہوں نے خولہ کی صورت میں زندگی کا دوبارہ ارادہ کیا تھا، اس کی معصوم محبت میں اپنی محبت کو چھپا کے وہ نئے انداز میں جینے لگی تھیں۔ یوں ساکت حیات رواں ہو گئی تھی مگر خولہ نے ان کو آسمان سے زمین پر بھیج دیا تھا۔ ان سے محبت کے سارے حقوق چھین لیے تھے۔ ہر چند کہ وہ جانتی تھیں کہ خولہ فرسٹیشن کا کارکن ہے۔ اس نے ارادہ کیا جملہ نہیں کہا ہے مگر اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا اور ٹوٹے ہوئے آئینے میں عکس بد نما ہی نظر آتا ہے۔ وہ اپنا عکس بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

نماز کے بعد وہ اپنے وظائف میں مصروف تھیں، آنسو بڑے چپکے سے دل پر گر رہے تھے مگر خولہ کو کسی پل قرار نہیں تھا، اک جملہ زبان سے پھسل کر اسے بے وقعت کر گیا تھا۔ ایک تو وہ اپنی حرکت پر بھی شرمندہ تھی لیکن وہ اس وقت ذہنی طور پر اتنی آپ سیٹ تھی کہ اس کے ذہن میں جو شیطانی خیال آیا اس نے اسے ایسے رنگوں کی صورت ظاہر کر دیا۔ شیطانی خاکے میں رنگ بھرے تو خود عطیہ خاتون کی نظروں سے گر گئی۔ انہوں نے نوک کا تو وہ بد تمیزی کر گئی اور اب اسے اپنی حرکت پر ندامت اور عطیہ خاتون سے بد تمیزی پر اس قدر ٹینشن ہو رہی تھی کہ اس کا دماغ گھومنے لگا تھا، چاروں طرف آنندھیاں چلنے لگیں، دائرے بننے لگے اور وہ مرکز سے بچھڑ گئی، طوفان بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

”آپ اوقات میں رہیے۔“

”نیوڈ آرٹ.....! اس کا مطلب ہے میں..... میں بھی بری لڑکی ہوں کہ اس طرح کی تصویر بنائی، شیطانی خیال کو پینٹ کیا، یہ میں نے کیا کیوں.....؟“

خولہ کے دماغ میں اٹھتے طوفان میں گلدان اس کے ہاتھ میں آ گیا اور اس نے اپنی ذریعہ تک ٹھیل پر

گلدان دے مارا۔ اسے اپنی صورت سے نفرت ہو رہی تھی۔

”مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے۔“ اس نے ٹوٹا ہوا شیشے کا ٹکڑا پکڑ لیا جو اس کے نرم نازک ہاتھ کو بری طرح زخمی کر گیا۔ عطیہ خاتون اور خولہ کے کمرے کے درمیان فاصلہ کافی تھا کہ آواز سنائی نہیں دی مگر عطیہ خاتون کے اندر کچھ ہوا تھا کیونکہ وہ محسوس کر چکی تھیں کہ خولہ کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہے اور وہ بار بار معافی کی عرض سے دائیں بائیں منڈلائی بھی تھی، کبھی کھنکھار کر، کبھی بغیر آہٹ کے مگر پھر بھی جانے کس شرم، کس رکاوت نے رستہ روک رکھا۔ ایک تو اپنی حرکت پر ندامت، دوسرا عطیہ خاتون سے گستاخی، یہ سب باتیں آنندھیاں بن گئیں تو وہ لہو لہان ہو گئی۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ جنم نہ دے کر بھی ممتا کی گود کی گرمی دے کر پالنے والی ماں بے خبر راتی، زخم اس کے ہاتھ میں آیا، تڑپ ان کے دل میں اٹھی تھی۔ وہ بھاگیں تو سامنے کے منظر نے ان کی جان اکال دی۔

”خولہ.....! خولہ میری بچی.....! میری لاڈلی.....! یہ کیا کیا تم نے.....؟“

خولہ نے اپنی کلائی کاٹ ڈالی تھی اور اب بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ وہ تو اس کی آنکھ نم نہیں دیکھ سکتی تھیں، اس کا خون کیسے برداشت کرتیں، بری طرح حواس باختہ ہو گئیں۔

”آ..... آ..... آئی ایم سوری.....! عطیہ خاتون.....! سوری.....!“

عطیہ خاتون کی گود میں سر رکھ کر اس نے ایک بار کہا اور بے ہوش ہو گئی تو ان کی جان پر بن آئی، دل بری طرح دھڑک اٹھا کسی خوف ناک اندیشے سے۔

”خولہ.....! میری جان.....! ہوش میں آؤ پلیز.....! دیکھو میں تم سے خفا نہیں ہوں، بالکل بھی نہیں ہوں اور سوچو بھلا کبھی مائیں بھی بچوں سے ناراض ہوا کرتی ہیں.....؟ میں..... خولہ.....! یا اللہ.....! مدد فرما، تنہا عورت کیا کروں.....؟“ عطیہ خاتون کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے، خولہ کا خون، اس کی بے ہوشی نے ان کو تو پاگل سا کر دیا، ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سامنے پڑے ظفر کے کارڈ پر ان کا فون نمبر دیکھ کر ان کو بلا لیا۔ ظفر اور نعمان بھاگے آئے، ان کی مدد سے فوری طور پر عطیہ خاتون کو ہاسپٹل لے گئیں۔

”بہن جی.....! آپ پریشان نہ ہوں، ایسی کوئی بات نہیں، ڈاکٹر سے میری بات ہوئی ہے وہ اب ٹھیک ہے۔“

ظفر مسلسل ان کو دلا سے دے رہے تھے۔

”آنتی.....! یہ میڈیسن وغیرہ ہیں۔“

نعمان نے میڈیسن اور پرچی عطیہ خاتون کی طرف بڑھائی تو وہ نادوم ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ اپنی پریشانی میں سب بھولے ہوئے تھیں، سارے ڈیوس ظفر نے اور ان کے بیٹے نے ادا کر دیئے اور اب وہ میڈیسن لے آیا تھا۔

”سوری بیٹا.....! میں اپنی پریشانی میں یہ سب تو بھول ہی گئی تھی۔“

انہوں نے شرمندہ نظر اس پر ڈالتے ہوئے بیک سے پیسے نکالے مگر ظفر نے منع کر دیا۔

”کمال کرتی ہیں بہن آپ.....! بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں، وقت اور حالات نے گو کہ بہت بے حسی بھر دی



”کیوں.....؟ کیوں تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ گے.....؟“

”ہاں بھئی.....! ہمارے مالک مکان کو گھر چاہیے اور اپنا ہمارا ابھی بنا نہیں، کہیں نہ کہیں تو ہمیں رہنا ہے

اں.....؟“

”کہیں کیوں.....؟ ہماری کوشی ماشاء اللہ اتنی بڑی ہے، آپ لوگ ہمارے ساتھ آ جائیں ناں.....! اندر

ہاں میں عطیہ خاتون سے بات کرتی ہوں۔“

خولہ ننگے پاؤں لان کی گھاس پر چلتی زوہا کا ہاتھ تھامے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

”انکل.....! آنٹی.....! زوہا نے بتایا ہے کہ آپ لوگ کہیں اور شفٹ ہو رہے ہیں۔“

وہ براہ راست ظفر سے مخاطب تھی۔ عطیہ خاتون نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی بات سن کر وہ بے تاثر

پھر لیے آصفہ سے بات کرتی رہیں۔

”جی بیٹا.....! جب تک اپنا نہیں بن جاتا تو تب تک تو خوار ہونا ہی پڑے گا ناں.....؟“

”ہرگز نہیں.....! آپ لوگ کہیں جائیں گے اور نہ ہی خوار ہوں گے بس.....“

”اچھا.....! پھر کہاں رہیں گے بیٹا.....؟“

”آپ لوگ یہاں ہمارے ساتھ رہیں گے، ہمارے پاس۔ ہے ناں عطیہ خاتون.....؟“

خولہ نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے عطیہ خاتون کو دیکھا جو مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔ اسی کے خوف

سے انہوں نے شہباز کے کہنے کے باوجود ظفر صاحب کو یہاں شفٹ ہونے کا نہیں کہا تھا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے

ایسا ایسا ہو گیا کہ وہ خود خوشی سے لڑکھڑکھ رہی تھی اور نہ شاید ان کی اور شہباز کی چڑ میں وہ ایسا ہرگز نہ کرتی۔

”بوسہ لیں ناں عطیہ خاتون.....! ان سے کہیں اور کہیں نہ جائیں، ہمارے پاس آ جائیں پلیز.....! وہ بچہ

بنی اصرار کر رہی تھی، وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”بیٹا.....! مجھے کوئی اعتراض کیوں ہونے لگا.....؟ میرے خیال میں تمہارا کہنا ہی کافی ہوگا ان کے

لیے۔“ انہوں نے ساری ذمہ داری ظفر پر ڈال دی۔

”بیٹا جی.....! جتنے زیادہ سے آپ کہہ رہی ہوں ناں ہم ابھی آ جاتے مگر گڑیا.....! ہم نئے مالک مکان کو

ایڈوانس دے چکے ہیں۔“

”تو کوئی بات نہیں، آپ واپس لے لیجئے ناں، پلیز انکل.....! میں اور زوہا کتنے اچھے دوست ہیں اگر

آپ مجھے بھی اپنی بیٹی سمجھتے ہیں تو پلیز.....! ہمارے پاس آ جائیں۔“

خولہ کے خوبصورت چہرے پر لجاجت سی اتر آئی تھی۔ عطیہ خاتون محبت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ظفر بھائی.....! ہماری بیٹی اتنے پیار سے کہہ رہی ہے، مان جائیے۔“

”اوکے بھئی.....! خولہ کو اپنی بیٹی ثابت کرنے کے لیے ہمیں نئے مالک مکان کو ناراض کرنا ہی پڑے گا۔

نعمان بیٹا.....! چلو ابھی ان سے بات کر لیتے ہیں۔ آصفہ.....! آپ اور زوہا آپ لوگ ان کے پاس بیٹھو ہم ان

سے بات کر کے آتے ہیں۔“

ظفر اور نعمان جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تو خولہ حیرت زدہ سی ان کے قریب آ گئی۔

ہے انسان میں مگر اب ایسا بھی کیا۔“

”ظفر بھائی.....! میں تو اس بات پر بھی نامدم ہوں کہ بلا سوچے سمجھے آپ کو بلالیا۔ نجانے کیوں میں

آپ کو فون کر دیا پریشانی گھبراہٹ میں.....؟“

عطیہ خاتون واقعی اس بات پر حیران تھیں کہ انہوں نے ظفر ہی کو کیوں بلایا جبکہ اور بھی شہباز کے

دوست اور رشتے دار بھی تھے مگر انہوں نے ظفر ہی کو فون کیا۔

”اِس ویری سہل بہن صاحبہ.....! کہ مشکل میں اللہ کے بعد بہن بھائی ہی کو یاد کرتی ہے اور مجھے آپ

نے یہ عزت ابھی ابھی دی ہے بھائی کہہ کر۔“

”بہت شکریہ بھائی.....!“ عطیہ خاتون سر منون سی نظر ان پر ڈالی اور خولہ کو دیکھنے لگیں جو دوا کے

سے سو رہی تھی۔ وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں، اس وقت ان کو اس پر پیار کے ساتھ

سے ترس آ رہا تھا۔ ماں کو ترسی، بابا سے خائف یہ لڑکھاٹھ سی گئی تھی۔

”بھائی صاحب.....! آپ لوگ جائیں میں اس کے پاس۔ بلا وجہ آپ لوگ بھی پریشان ہو رہے

ہیں۔“ عطیہ خاتون شرمندہ ہو رہی تھیں، وہ خولہ کے پاس بیٹھی تھیں، وہ دونوں باپ بیٹا کھڑے تھے اور یہ

ایک بااخلاق وضع دار خاتون کو گوارہ کب تھی۔

”آنٹی.....! میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسی کوئی خاص چوٹ نہیں آپ ان کو ایسی

گھر لے جاسکتی ہیں۔“

”اچھا.....! ذرا ہوش میں آ جائے تو چلتے ہیں۔“ نعمان کی اطلاع پر عطیہ خاتون خولہ کو دیکھنے لگیں جو

کسمار ہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ ظفر اور نعمان نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کوریڈور میں

آ گئے۔

”سوری.....! سوری.....! عطیہ خاتون.....! سوری.....! سوری.....!“

خولہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے، چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ عطیہ خاتون پکھلے لگیں۔

”خولہ.....! میری جان.....! میں تم سے خفا کب ہوں.....؟ کس بات کی سوری.....؟ میری جان.....!

میری گڑیا.....! وہ چھکیں تو خولہ جھٹکے سے اٹھی اور ان سے لپٹ گئی اور کتنی ہی دیر دونوں روتی رہیں۔

کے بادل چھٹ گئے تھے۔

”عطیہ خاتون.....! آ.....! آپ کو میری سگھی ماں ہونا چاہیے، کیوں نہیں ہیں آپ میری ماں.....؟ جب

آپ میں ظفر ماں جیسا ہے تو ماں کیوں نہیں.....؟“

وہ بغور ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ انہوں نے سر ہکا بین چرائیں پھر وہ لوگ ظفر کے ساتھ واپس آ گئیں۔ اس

کے بعد آصفہ اور زوہا بھی خولہ کا حال معلوم کرنے آئیں تو خولہ ان میں خوب گھل مل گئی۔ نعمان سے بھی گپ

ہونے لگی تھی۔

”دیکھو.....! تو اب ہماری دوستی ہوئی ہے اور اب ہم یہاں سے شفٹ کر جائیں گے۔“ اس روز زوہا نے

اطلاع دی تو خولہ گھبرا گئی۔



”کیا.....؟ کیا آپ نے میری بات مان لی انکل.....! میری بات پر آپ نے اپنا فیصلہ بدل لیا.....“  
اس قابل ہوں کہ..... کہ کوئی میری بات مان لے.....؟“  
اس کے لہجے میں عجیب سی بے اعتمادی تھی، اپنی بات مانے جانے پر آنکھوں میں حیرت تھی جس سے سوائے عطیہ خاتون کے سب کو سوالیہ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ ظفر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ کچھ اُلجھی نظروں سے عطیہ خاتون کو دیکھا جنہوں نے شہباز کی زندگی کا بھرم رکھنے کے لیے نظریں چرائیں۔  
”ہاں.....! کیوں نہیں بیٹا.....! آپ تو اتنی پیاری بیٹی ہو، کون آپ کی بات ٹال سکتا ہے.....!؟“  
وین.....! بقیہ باتیں بعد میں، ہم ابھی آتے ہیں۔“  
ظفر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ گئے۔

• • •

”پلیز اللہ میاں جی.....! آپ بتائیے ناں میں کیا کروں.....؟ میں تو ماہم کا بھائی ہوں.....!؟“  
نادرہ کیوں مجھے حسینہ کہتی ہیں.....؟ اللہ میاں جی.....! مجھے ان چڑیلوں کے پاس نہیں جانا۔ اللہ میاں جی.....! آج پچا کیوں نماز پڑھنے نہیں آئے.....؟ کیوں اللہ میاں جی.....! پچا کو بلا دیں ناں پلیز.....! ورنہ..... ورنہ..... دونوں چڑیلیں آکر مجھے لے جائیں گی اور وہ گرو..... نہیں.....! اللہ میاں جی.....! پلیز ہیلپ می.....! ماہم کے پاس، ماما کے پاس پہنچا دیں۔“  
اور شرجیل جو اپنے دونوں ہاتھوں کو کھنکھول بنائے مانگ رہا تھا، اس کا بدن کانپ رہا تھا، لہجہ رور رہا تھا، اشکوں سے شرٹ بھیگ چکی تھی۔ ایک ہی دُعا اندر بدل کر نکلنے لگی تھی۔ لہجے میں ڈھل کر لیں۔ آکر دم توڑ رہی تھی۔ پھر لہجہ ڈوب گیا، لب خاموش ہو گئے، اٹھتے ہوئے ہاتھ گھمکے تھے اور اس کا پورا منہ شاخ کی طرح اپنے قریب بیٹھے ڈاکٹر عرفان کی گود میں جا کر۔ وہ جو نماز سے فراغت کے بعد جا رہے تھے کہ شرجیل کی رقت اور تڑپ نے قدم روک دیے۔ وہ وہیں بیٹھ کر اللہ سے اس کے بندے کی التجا سنتے رہے اور چاہتے تھے کہ جب وہ اپنی طلب کا کھنکھول بھر کر پلٹے تو وہ کچھ سوال اس سے کریں مگر اب وہ بیہوش ان کی گود میں تھا۔ اس کے دُعاؤں سے جو کہانی بنتی تھی اس کے مطابق یہ ایک بے گھر ہوا، شکستہ ہوا حساس آدمی تھا۔ انہوں نے دو آدمیوں کی مدد سے اسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور اپنے گھر لے آئے۔ اپنی بیگم عالیہ سے ساری بات کہہ کر انہوں نے شرجیل کو گیسٹ روم میں سلا دیا اور خود باہر آ گئے۔  
”عرفان.....! آپ بھی ناں کمال کرتے ہیں۔ کیا ضرورت تھی ایک انجان اجنبی کو گھر اٹھا کر لانے کی.....؟“

عالیہ کو شوہر کی اسی عادت سے چڑھتی۔ باہر جس کسی سے ہمدردی ہوتی اٹھالاتے۔  
”اب یہ چیز اٹھالائے ہیں آپ.....! گھر میں جو ان بہن ہے آپ اور.....“ حسب عادت عالیہ شوہر سے اُلجھی ہوئی تھیں۔ عرفان نے ان کو دیکھا، نظروں میں تاسف اور افسوس تھا۔  
”عالیہ بیگم.....! زندگی میں انسان کو کوئی کام انسانی فلاح کے لیے بھی کرنا چاہیے۔ ابو بن اوصم والا قصہ یاد ہے ناں کہ ان کا نام انسانی ہمدردی اور محبت کی بناء پر ان لوگوں کی فہرست میں ٹاپ پر تھا جن کو خود اللہ تعالیٰ

ہمدرد بنا ہے اور ہمارا خالق مالک جو اس قدر نوازنا ہے اگر ہماری ذرا سی سیٹی کے عوض میں اپنے خالق و مالک کی پسندیدگی اور نظر رحمت حاصل ہو جائے تو میں تو جان بھی دے دوں اللہ کی رضا کے لیے، یہ تو ایک بھٹکا ہوا نود اپنی تلاش اور پہچان میں گمشدہ نوجوان ہے اور بحیثیت سائیکا ٹرسٹ میرا یہ فرض ہے کہ اس کا علاج کروں۔“

”اچھا چلیں ٹھیک ہے مگر یہ ہے کون.....؟“ حسب عادت شوہر کے لیکچر کے بعد عالیہ راہ راست پر آتی ہوئی بولیں۔

”ابھی تو اس سے بات نہیں ہوئی ہے، میں مسجد سے لے کر آیا ہوں، ایسا کرونا شہ تیار کر کے بھیج دو، میں ہا کر اسے دیکھتا ہوں۔“ عرفان عالیہ کو ناشتے کا کہہ کر دوبارہ گیسٹ روم میں آئے تو شرجیل نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔

”میری بات مانو نادرہ.....! میں..... میں ماہم کا بھائی ہوں اور بھائی تو مرد ہوتا ہے ناں.....؟ میں مرد

ہوں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، مجھے اس جگہ سے تم لوگوں سے گھن آتی ہے، میں نہیں جاؤں گا، میں تمہارا روتوڑ دوں گا اگر مجھے حسینہ کہا تو، میں شرجیل ہوں، میں شرجیل ہوں۔“ وہ گہری نیند میں چلا رہا تھا، اس کے سر پر اضطرابی کیفیت تھی، جسمانی اعضا میں ہوتی ہلچل اس کی ذہنی کشمکش کو ظاہر کر رہی تھی۔ عرفان احمد سائیکا ٹرسٹ تھے، وہ بغور اس کی حرکتوں اور باتوں کا جائزہ لیتے رہے اور وہ اپنی باتوں اور حلیے سے کسی اچھے گھر کا لڑکا لگ رہا تھا۔ وہ ایک ایک لفظ پر غور کر رہے تھے اور یہ الفاظ ہی وہ سیڑھی تھے جن پر چڑھ کر وہ اس کی ذات کے اندر جھانک سکتے تھے۔ وہ اسی طرح چلا رہا تھا کہ ملازمہ ناشتہ لے آیا۔

”تم جاؤ رشتی.....!“ عرفان کے اشارے پر رشتی باہر نکل گیا اور وہ خود بخود اس کا جائزہ اور مطالعہ کرنے لگے۔ اس کے لفظوں میں چھپی کہانی، اس کے لہجے کی بے یقینی ان کو بہت دور تک لے گئی اور ان کی پندرہ سالہ پیشہ ورانہ مدت میں ایسا کیس پہلی بار آیا تھا اس لیے وہ اس پر خاص توجہ دے رہے تھے۔ اتنا اسمارٹ، خوب رو نوجوان اتنی بے یقینی میں مبتلا ہو تو درپردہ وہ کہانی کیا رہی ہوگی، یہی نقطہ تھا جس پر ان کا علم چکر لگانے لگا تھا۔ شرجیل کی ایک ایک حرکت اور بات ان کو سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”نہیں.....! میں..... میں گرو کے پاس نہیں جاؤں گا، مت کہو مجھے حسینہ، میں..... میں شرجیل ہوں، تم لوگ مانتی کیوں نہیں ہو.....؟ میں شرجیل ہوں۔“ وہ ابھی تک اسی ٹرانس میں تھا اور عرفان چاہتے تھے کہ وہ خود ہی اس ٹرانس سے واپس آئے مگر شرجیل کی حالت سحر زدہ انسان کی سی تھی یا پھر ایسے جیسے کسی کو پہنا نا ز کر دیا گیا ہو۔ لہذا عرفان آگے بڑھے اور شرجیل کا شانہ ہلایا۔

”شرجیل.....! شرجیل صاحب.....! اٹھئے ناشتہ کر لیجئے۔ شرجیل صاحب.....!“

ایک تو ایک عرصے کے بعد اس کی سماعتوں میں اپنے نام کی گونج سنائی دی تھی اور دوسرا کون ایسا تھا جو اسے صاحب کہہ رہا تھا مگر شرجیل خمار کی سی کیفیت میں آنکھیں کھول کر اس آواز پر غور کرنے لگا اور اس شخص کو دیکھنے لگا جس نے اسے شرجیل صاحب کہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صاحب تھا صاحب نہیں، شرجیل تھا حسینہ نہیں مگر اس کا یقین کیسے کیا جائے۔ اس نے گہرا سانس ایسے لیا جیسے بے بسی سے وہ عاصمہ، نادرہ کے حوالے خود کو کر رہا کرتا تھا۔ عرفان سمجھ گئے۔

Postd by Sanyoo



”شرجیل میاں.....! اٹھئے بھئی.....! گیارہ بج گئے ہیں، اتنی دیر سونا مناسب نہیں، اٹھ جائیے وردا! آپ کے ساتھ مجھے کئی کرنی پڑے گی۔“

آواز مختلف تھی، الفاظ مختلف تھے، اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی مختلف جگہ پر تھا، اس کے دل و دماغ کے پردے پر صرف عاصمہ، نادرہ، راشدہ کی تصویریں ٹھہر گئی تھیں۔ اس نئی آواز پر وہ ہڑا کر اٹھا تو وہ واقعی ہی اٹھا میں تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ گروڈیرے سے بھاگا تھا اور مسجد میں پناہ لی تھی اور خدا کے حضور گڑ گڑا تھا کہ وہ ہوش و حواس کی دنیا سے بے بہرہ ہو گیا تھا۔ اب ہوش کی دنیا میں لوٹا تو ایک چالیس کے قریب شخص ہر سال چہرہ، آنکھوں میں پیار اور لہجے میں حلاوت لیے قریب ہی موجود تھا۔ اسے یہ بھی نادرہ، عاصمہ کی چال لگی۔

”کک..... کک کون ہیں آپ.....؟ آپ عاصمہ.....! نہیں.....! وہ تو بری عورت..... لیکن..... وہ تھی.....؟ مگر میں..... میں شرجیل ہوں..... حسینہ نہیں ہوں..... آپ کیوں شک کی نظر سے مجھے دیکھ رہے ہیں.....؟ پلیز بلیو می.....!“

وہ بے نیکی باتیں کر رہا تھا۔ عرفان بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”شرجیل میاں.....! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں.....؟ آپ شرجیل ہیں، مرد ہیں، حسینہ کہوں گا میں آپ کو.....؟“ عرفان صاحب نے ملائمت سے کہا تو شرجیل کی آنکھوں میں جفا خون بے یقینی سے رواں ہونے لگا۔ وہ ان کے قریب آ گیا اور بغور ان کو دیکھنے لگا جیسے یہ یقین کر لینا چاہتا ہو کہ وہ کہیں جھوٹ تو نہیں کہہ رہے۔

”آپ.....! آپ کو یقین ہے کہ میں شرجیل ہوں.....؟“ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی مگر اب تو لگتا تھا کہ یقین کو جرح مل ہی جائے گی۔

”ارے شرجیل صاحب.....! اس میں بے یقینی کی بات کیا ہے.....؟ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مرد بنایا ہے، آپ حسینہ نہیں ہو، ماہم کے بھائی ہو۔“

”جی.....؟ جی کیا کہا آپ نے.....؟ میں..... میں ماہم کا بھائی ہوں مگر آپ ماہم کو کیسے جانتے ہیں.....؟“

شرجیل کی آنکھوں کے ڈوبے تارے روشن ہونے لگے تھے، مرجھائے چہرے پر رنگ اترنے لگے تھے، مارے خوشی اور جوش کے اس کے جسم پر لرز طاری ہونے لگا تھا۔ اس کی ذات، اس کی پہچان کے بارے میں آج تک اتنے یقین سے یا تو ماہم نے کہا تھا یا یہ صاحب کہہ رہے تھے۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”بھئی.....! عجیب لڑکے ہو تم.....! ظاہر ہے ماہم تمہاری بہن ہے، تم اس کے بھائی ہو۔“

عرفان احمد پیار سے اسے دیکھتے ہوئے اس کو سمجھا رہے تھے اور وہ حیرت زدہ خوشی سے ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ وہ اسے عجیب لڑکا کہتے رہیں، کہتے رہیں یہاں تک کہ بے یقینی کو ساحل مل جائے۔

”آپ.....! آپ بہت اچھے ہیں لیکن آپ وعدہ کریں مجھے ان آنٹیوں کے پاس تو نہیں لے کر جائیں گے.....؟ اور مجھے بتائیں گے کہ میں کون ہوں.....؟“

عرفان احمد کا پیشہ ہی یہ تھا اس لیے اس پر خاص توجہ دے رہے تھے اگر نہ بھی ہوتے تب بھی وہ شرجیل کے

لے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے۔ انہوں نے ایک عمر وطن سے دور گزاری تھی اور اب وہ ملک میں آئے ہی ملک و قوم کے لیے، انسانیت کے لیے کچھ کرنے کے لیے تھے اور شرجیل تو اپنی تلاش میں بھٹکا ہوا وہ راہی تھا کہ اب تک وہ ملک ہی رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے اس گھٹا گھوپ اندھیرے میں اک کرن نظر آئی تھی اور منہی سی یہ کرن دینے والا ابھی دور تھا، ایک جھپ میں اس کو حاصل نہیں کر سکتا تھا اور یہ بات ماہر نفسیات ڈاکٹر عرفان احمد سمجھ گئے تھے۔

”شرجیل میاں.....! میں تمہاری ان آنٹیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ جانتا چاہتا ہوں۔ البتہ مجھے تمہارے بارے میں بات ضرور کرنی ہے لیکن آج نہیں پہلے آپ آؤنا شہ کرتے ہیں۔“

عرفان احمد نے اٹھ کر واش روم کا دروازہ کھولا تو شرجیل جو خود کو اور ہی دنیا میں محسوس کر رہا تھا، خواب اک سی کیفیت میں عرفان کو دیکھتا ہوتا مسکراتا واش روم میں گیا اور شاہد کھول کر کپڑوں سمیت نہانے لگا۔ اک لمب سی کیفیت تھی۔ وہ شرجیل ہے یہ مان لیا گیا تھا۔

”شرجیل صاحب.....! ناشتہ ٹھنڈا ہو چکا ہے اور مجھے کلینک بھی جانا ہے، باہر آؤ۔“ دروازے کی دستک شرجیل کو اپنے دل پر ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا تو عرفان احمد اسے کپڑوں سمیت بھیگا دیکھ کر اپنے کمرے میں گئے اور اپنا شلوار سوٹ لے آئے۔ سفید کلف شدہ لباس میں وہ بہت چمپے لگا۔ عرفان احمد اسے دیکھتے رہے۔ شرجیل کا انداز، اس کا طریقہ، اس کی تعلیم اور اچھی فیملی سے ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔ آج ایک مدت کے بعد ڈھنگ کا ناشتہ، صاف ستھرا ماحول، نہ بدلتی، نہ میک آپ کی چیزیں، نہ پان کی پیک، نہ ہی دوران کھانا طرح طرح کے بدبودار ڈکاروں کی آوازیں جو ایک کی بن جایا کرتی تھیں، اس کے سامنے ایک نفیس سا شخص کھانا سلاش پر جیم لگا کر کھا رہا تھا۔

”آپ.....! آپ کون ہیں سر.....!“ شرجیل کی آواز میں جانے کہاں سے اعتماد اور مردانگی آ گئی۔ سوال کی جرأت نے راستہ مزید صاف کر دیا۔ عرفان احمد نے ملائمت سے نظر اس پر ڈالی اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ کپ رکھ کر انڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”میرا نام ڈاکٹر عرفان ہے۔ سائیکا ٹرسٹ ہوں اور مسجد میں نماز فجر کے بعد تمہیں خدا کے حضور روتے، گڑ گڑاتے سنا تو اپنے گھر لے آیا۔“

”آپ.....! آپ سائیکا ٹرسٹ ہیں پھر تو پلیز.....! آپ میرا علاج کر دیجئے، مجھے بالکل لڑکا بنا دیں۔“

نادرہ، عاصمہ، راشدہ مجھے حسینہ نہ کہہ سکیں۔ پلیز سر.....!“

اس کے لہجے میں لجاجت اتر آئی۔ عرفان احمد نے ناشتہ مکمل کر کے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا۔ ساری کہانی تو وہ سمجھ ہی گئے تھے۔

”ہوں.....! اس کے لیے تمہیں میرے پاس رہنا ہوگا۔ خیر ابھی تو مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے۔ میں دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیل بجادینا ملازم آ جائے گا۔“

”جی اچھا.....! لیکن عرفان بھائی.....! پلیز.....! پلیز نادرہ، عاصمہ، شہینا کو مت بتائیے گا ورنہ..... ورنہ میں خود کشی کر لوں گا۔ وہاں گروڈیرے نہیں جاؤں گا۔ میں مرد ہوں، لڑکا ہوں، شرجیل ہوں تو پھر کیوں وہ مجھے حسینہ کہتی ہیں.....؟ لڑکی مانتی ہیں.....؟ اگر ان کو بھنگ بھی پڑ گئی کہ میں یہاں ہوں، وہ مجھے لے جائیں گے،



”لڑکا.....! لڑکا.....!“ نئی سحر پھوٹنے لگی، دل کی بستی میں بہار آگئی، رنگ برنگے پھول کھلنے لگے۔ وہ مہم جھوم گیا تھا، آج اسے اس کی پہچان مل گئی تھی۔ وہ ناچنے لگا، اس کا دل چاہا زور زور سے گیت گائے، وہ خوشی سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

”میں نادورہ ہوں۔“ اسے زور سے ٹھوکر لگی۔ باہر سے آنے والی آواز نے جیسے روح قبض کر لی۔

”یا اللہ.....! پسا کوزندگی عطا فرما دے۔ یا اللہ.....! میرا بچھڑا بھائی ملا دے۔ یا اللہ.....! پسا کوزندگی عطا فرما دے۔“

واصف کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور اس وقت وہ آئی سی یو میں بیہوش پڑے تھے۔ باپ اور بھائی کے لیے مائیں کرتی ماہم ہاسپٹل کے فرش پر ایک طرف سجدے میں گری گڑ گڑا رہی تھی، آمنہ کی آنکھوں کے سوتے ملک ہو چکے تھے، ان کی زندگی تو دکھوں سے عبارت تھی، بیٹے کی جدائی اور شوہر کی بیماری نے ان سے ان کے اس چھین لیے تھے۔

”چچی جان کی حالت بہت خراب ہے تیمور.....! میرا خیال ہے تم ان کو گھر لے جاؤ۔“

”ماتق بھائی.....! کئی بار کہہ چکا ہوں مگر وہ نہیں مانتیں۔ چچا جان کے لیے بہت پریشان ہیں۔ اللہ تعالیٰ چچا جان کو صحت دے۔“

”اچھا.....! ٹھیک ہے، رہنے دو، گھر جائیں گی تو واہموں کی وجہ سے ان کی طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔ یہ ٹا کہاں ہے.....؟ ماہم اکیلی بیٹھی ہے گھر کی کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں آئی.....؟“ ثاقب کو اپنی بہن ثنا منہ آگیا جس کو باہر لان میں مولیٰ نے روکا ہوا تھا۔

”شنا.....! تم اب تک مجھ سے خفا ہو اور کیا تمہیں یقین ہے کہ شرجیل میری وجہ سے گھر چھوڑ کر گیا ہے.....؟“ ثنا واقعی موبی سے سخت خفا تھی کہ اس کی باتوں کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر گیا ہے اور آج ان سب کا یہ حال ہے۔

”موبی.....! مجھ سے بات مت کرو، میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی اور اگر تمہیں اس بات کا پروف دے دوں گا کہ میں جیل تھریل کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گیا ہوں تو میں پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہتی ہوں۔ اگر چچا جان کو درخواستہ کچھ ہوا تو میں یہ بات چیخ چیخ کر گھر میں سب کو بتا دوں گی کہ ان لوگوں کی تباہی کے صرف اور صرف تم مددگار ہو اور اب جبکہ چچا جان آئی سی یو میں موت و حیات میں ہیں اور تمہیں میری ناراضگی کی پڑی ہوئی ہے.....؟ کس قسم کے انسان ہو تم.....؟“ شاہت اچھی، حلیم، نرم مزاج، نرم خول کی تھی مگر موبی نے جو ماہم، شر جیل کے ساتھ کیا اس کی وجہ سے اسے سخت چڑھ گئی تھی موبی سے۔

”ٹٹا.....! شاتم یہاں کیا کر رہی ہو.....؟ تمہیں اس وقت ماہم کے پاس ہونا چاہیے۔“

”جی بھائی.....!“ تیمور کی ڈانٹ پر وہ کوئی بھی بات کیے بغیر اس خیال سے آگے بڑھ گئی کہ اگر تیمور کو وہی کے بارے میں بتایا تو ہاسپٹل میں کوئی ہنگامہ ہو جائے گا۔ شاید قدم اٹھاتی کوریڈور سے گزرتی ہوئی ان لوگوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ موبی کا انداز وہی تھا بدتمیز اکھڑ سا۔

میں مرجاؤں گا مگر اب وہاں نہیں جاؤں گا، میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں پلیز.....!“

لحوظ میں تاریکی چھا گئی، چہرے پر کھنڈروں کی سی ویرانی آ گئی، آواز کی مردانگی دب گئی اور باریک کی لڑکیوں جیسی آواز اس مردانہ حلق سے نکلی تو عرفان احمد نے اسے ساتھ لگالیا۔ اس کا کرب ان کو کوئی کر گیا۔

”تمہیں پتہ ہے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے اتنا مضبوط اور قوی بنایا ہے کہ وہ ہر مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے۔ خواہ کتنی بڑی ہو مرد کبھی بھی مصیبت سے مسائل سے گھبرایا نہیں کرتے اور یہ جو چشموں کا نمکین پانی ہوتا ہے۔ ناں.....! یہ صرف عورتوں کی آنکھوں میں اچھا لگتا ہے، ہم مردوں کی آنکھوں میں نہیں اور یہ جو مرد کے ہاتھ ہیں ناں.....!“ حذب سے بولتے بولتے عرفان احمد نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ الگ کیے۔

”مرد کے یہ ہاتھ جوڑنے کے لیے نہیں ظلم اور زیادتی کے ہاتھ توڑنے کے لیے ہیں۔ ہم مرد ہیں اور  
آنسو آج کے بعد نہیں۔ اوکے.....!“

”جی.....! جی بھائی.....!“ آواز میں یک دم مردانگی عود آئی۔ آواز کی لڑکھرائٹ، کھیراہٹ، یلہ دم غائب ہو گئی۔ پیشانی پر آپا پسینہ مٹ گیا۔

”گڈ.....! ویسے تم نے مجھے بھائی کہہ کر میری دیرینہ خواہش پوری کر دی ہے کہ میرا کوئی چھوٹا بھائی ہو۔ چلو پھر ملاقات ہوگی، چلتا ہوں خدا حافظ.....!“ عرفان چلے گئے تھے اور شرجیل سرشاری کی کیفیت میں جھوم اٹھا تھا۔

”اللہ میاں جی.....! آپ بے حد اچھے ہیں، آپ نے میری دُعا سن لی ہیں، آپ بہت پیارے ہیں، بے حد پیارے ہیں، شکریہ اللہ میاں جی.....!“

وہ سجدے میں گرا اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا تو آنسو آپ ہی بہہ رہے تھے۔ اللہ نے اس کو تادیرہ، سالہ

سے نجات دے دی تھی اس سے بڑی کیا بات تھی۔ وہ سرشاری میں کھڑکی کھولے لان میں پھولوں کو دیکھنے لگا۔  
 ”بھابھی جان.....! میری ڈائری نہیں مل رہی۔ آپ کے لاڈ لے نے گیٹ روم میں پہنچا دی ہوگی۔“  
 باہر عرفان کی چھوٹی بہن ہادیہ بول رہی تھی۔

”یہ بچے میرے نہیں بلکہ تمہارے لاڈ سے بگڑے ہیں۔ اب بھگتو، ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔“

”ارے نہیں بھابھی جان.....! آپ بیٹھی رہیے میں خود جا کر دیکھ لیتی ہوں۔“ ہادیہ بولتی ہوئی گئی۔

روم کی طرف بڑھی۔ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہاں کوئی نوجوان موجود ہے اور نہ ہی عالیہ کو بتانا یاد رہا۔ ہادیہ دھیانی میں اندر آئی، ڈائری تو سامنے پڑی مل گئی۔ جب وہ لے کر واپسی کے لیے پلٹی تو شرجیل کی موجودگی بے نیاز ہادیہ خوفزدہ ہو کر باہر کی طرف بھاگی۔ شرجیل بھی خوفزدہ سا ہو گیا۔

”کیا ہوا ہادیہ.....؟“

”بھابھی جان.....! اندر کون لڑکا ہے۔“ ہادیہ کی حیرت زدہ آواز اُبھری، شرجیل کے کانوں میں اُتری

جیسے شرجیل زندہ ہونے لگا۔ ایک لفظ کی بازگشت ہونے لگی۔

”کون لڑکا.....؟“ آنکھوں میں تاروں کا شہر سجے لگا۔

”کون لڑکا.....؟“ چاند مسکرانے لگا، بادلوں کے پیچھے سے سورج چمکنے لگا۔



”تمہیں لگتا ہے تاپا ابو سے زیادہ ان کی بیٹی کی فکر ہے.....؟“

”خدا کا شکر ہے.....! فکر کا کوئی روزن تو ہے میرے دل و دماغ میں جہاں سے روشنی آسکتی ہو۔ تمہاری طرح بے حسی کی قید میں نہیں ہوں۔ دو لوگ ایک ہی کھڑکی میں کھڑے ہوتے ہیں مگر دونوں کی نظریں مختلف نظر دیکھ رہی ہوتی ہیں، ایک کی نظر آسمان کے تاروں پر ہوتی ہے اور دوسرے کی نظر زمین کے کچھڑ پر۔“

”تیور.....! موبی.....! جلدی آؤ وہ چچا جان.....!“ ثاقب نے دُور سے آواز دی تو کچھ دیر کے بعد دونوں کے دل کسی خوف ناک خبر کے خیال سے مٹھی میں آ گئے۔

● ● ●

وردہ کے بھاری جھلملاتے دوپٹے کو ایک ہاتھ میں لیے وہ بڑی گہری پراسرار نظروں سے دیکھتا ہوا اس دھیمے لہجے میں بولا تو وردہ کی نظریں اس کے زخمی ہاتھ پر جا ٹھہریں۔ اس نے اس روز جان بوجھ کر اس کا ہاتھ دروازے میں دیا تھا مگر وہ نہ تو غزین سے متاثر تھی نہ ہی خوفزدہ۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہتی تھی اس لیے اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ اس نے جھٹکے سے دوپٹہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہونٹ بھینچ کر اس پر بے ہتھ کر کھڑی ہو گئی۔

”بس.....! اتنی برداشت ہے.....؟ اتنی دلیری ہے کہ ذرا سی چوٹ پر بلبل اٹھے ہیں موصوف.....! ہمارے والے تو جگر آزماتے ہیں تیر نہیں۔“

وردہ کا ایک ایک لفظ غزین کو تپا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وردہ کو دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ جتنی حسین لگ رہی تھی کوئی اور وقت ہوتا اور غزین کے دل میں اس کی محبت ہوتی، پسندیدگی کی کوئی کرن ہوتی تو وہ کچھ نہ کچھ اطمینان بات ضرور کہہ جاتا مگر وقت اور حالات نے ایک عجیب سا رشتہ بنا دیا تھا اس کے اور وردہ کے درمیان۔ وہ اتنا اس کے قریب آ گیا جتنا وہ دُور ہٹتی تھی۔

”او کے.....! تو آج سے ہم جگر آزمائیں گے اور آپ میرا آزمائیے گا۔ دیکھتے ہیں ہمارا جگر جلدی بھالی ہوتا ہے کہ آپ تھک جاتی ہیں۔ آپ کے علاقے میں تو داخل ہو ہی گئے ہیں ہم۔“

غزین نے ذرا جھک کر اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پھونک مار کر ہٹایا تو وہ سر تاپا سلگ اٹھی، بجلی کی طرح پیچھے ہٹی اور غرائی۔

”مستر غزین.....! اپنی مکاری سے آپ نے اس گھر میں تو جگہ بنالی ہے مگر کبھی اپنی حد کراس کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ حد کراس کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔“ وردہ نے گری ہوئی موم بتیوں کو پھر ترتیب سے رکھ کر جلانا شروع کیا تو وہ بھی نیچے اس کے قریب بیٹھ کر اس کی مدد کرنے لگا۔

”ابھی تو صرف آپ کے گھر میں جگہ بنائی ہے ابھی تو مجھے آپ کے دل میں جگہ بنانی ہے۔“

غزین نے ایک موم بتی جلا کر اس کے چہرے کے قریب کر کے کہا تو وردہ شعلہ بن گئی۔ اس نے اپنی مہندی بھری کلائی سے جلتی موم بتی بجھادی۔

”انسانی دل اور علاقے ریاست میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے غزین آفاق.....! فتح علاقے بھی کیے جاتے ہیں اور دل بھی مگر مختلف ہتھیاروں سے انسانی دل فقط ایثار، محبت اور عزت سے جیتے جاتے ہیں دھونس اور

علاقے سے نہیں اور پھر یہ میرا دل ہے، وردہ وجاہت کا دل جس میں آپ جیسے اس کے دروازے کے سامنے سے گزر بھی نہیں سکتے۔“ اس کے دل کی سختی غزین سے نفرت لفظوں میں سمٹ کر وردہ کے حسین چہرے پر اتر آئی تو غزین اک ادا سے ہنس دیا۔ جانے کو پلٹا، وردہ نے بھی غنیمت جانا اور اسی کے پیچھے ایک قدم بڑھایا کہ وہ برق رفتاری سے پلٹا۔ موم بتیوں کا تھال قریب تھا کہ کارپٹ پر اُلٹ جاتا، غزین نے کمال ہوشیاری سے تھال سنبھال لیا۔

”او کے.....! اٹس چیلنج.....! آپ کے دل کے دروازے پر غزین آفاق کے نام کی نیم پلیٹ نہ لگا دوں جب تک سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔“ اس کے لہجے کی مضبوطی سے اس کے ارادوں کا عزم جھانک رہا تھا۔ وہ کھول اٹھی۔

”امپائل.....!“ وہ کترا کر گزرنے لگی تو وہ سامنے آ گیا۔ اس کے وجہ چہرے پر عجیب سی سختی آ گئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

”تھنک از امپائل.....! ایڈرا سٹینڈ.....!“ وہ اس کی بات سے اتنا سلگ اٹھا تھا کہ ابھی اس کا پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو عفت بیگم آئیں، دونوں کو وہاں اکیلے دیکھ کر ٹھنک گئیں کہ غزین وردہ کے پاس تنہائی میں کیا کر رہا ہے۔ پھر خیال آیا دونوں ساتھ پڑھتے ہیں ہو کی کوئی بات، اس خیال نے انہیں مطمئن کر دیا۔

”ارے غزین میاں.....! تم یہاں.....! ارمغان تو باہر ہے۔“

”جی آنٹی.....! ارمغان یہیں سے گیا ہے، ہم دونوں یہاں سے گزر رہے تھے کہ وردہ نے روک لیا۔“ اس کے سفید جھوٹ اور مکاری پر وردہ کھول گئی۔ دل چاہا کہ گرم گرم موم اس پر گرا دے مگر وہ چاہنے کے باوجود ایسی کسی بھی کارروائی کو سرانجام نہ دے پائی مگر غزین نے اس کو نہیں بخشا تھا، بولے جا رہا تھا۔

”یہ لڑکیاں بھی ناں آنٹی.....! جب ڈاکٹر بننے لگتی ہیں تو ہر جگہ کو ہاسپٹل بنا لیتی ہیں۔ اب انہوں نے روک لیا اور لگیں پوچھنے کہ انسانی دل کیا چیز ہے.....؟ انسان کی ساری زندگی اس دل کے تابع کیوں گزرتی ہے.....؟ میں سمجھا رہا ہوں کہ انسانی دل ہے کوئی علاقہ یا ریاست نہیں کہ جو فتح ہو سکے۔“

وہ اس کے دل میں اٹھنے شعلوں کی تپش، اس کے سرخ پڑتے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ نجانے کیوں جتنا وہ جلتی تھی اسے سکون ملا۔ وہ کن انکھیوں سے اسے مسلسل دیکھ رہا تھا جس کے زخماں شدت ضبط اور غصے سے دہک رہے تھے۔

”اچھا بیٹی.....! چھوڑو.....! ہر وقت پڑھائی.....! چلو باہر.....!“

”اور نہیں تو کیا آنٹی.....! میں بھی ان سے یہی کہہ رہا تھا کہ گھر اور ہاسپٹل، لیکچر روم میں فرق ہونا چاہیے اور پھر میں کون سا ان سے بہت سینئر ہوں فقط ایک جماعت تو آگے ہوں مگر وردہ صاحبہ میری قابلیت کی بہت معترف ہیں اور پھر.....!“

اب حد ہو گئی تھی، وردہ کی برداشت کے بند ٹوٹ گئے۔ اس نے جلتی ہوئی موم بتی اس طرح عفت بیگم کی نظریں بچا کر غزین کے سینڈل سے نظر آتے پیروں پر پھینکی کہ کچھ دیر کے لیے پگھلے ہوئے موم نے غزین کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا کر دیا۔ جلن اور غصے کی آگ نے مل کر اس کے اندر قیامت برپا کر دی۔ اس کے



چہرے پر موجود درد و تکلیف نے وردہ کے اندر بھڑکتے شعلوں کو قدرے کم کیا۔

”وردہ جان.....! چلو مہندی کی رسم ہونے والی ہے۔“ عفت کے کہنے پر وہ تیزی سے ان کی طرف بھاگی اور قریب تھا کہ وہ ان سے پہلے کمرے سے نکل جاتی، غزین تیزی سے آگے بڑھا، اس کی کلائی پکڑ کر یوں کھینچا کہ وہ ساری کی ساری اس کی طرف گھوم گئی۔ اس وقت غزین کے چہرے پر بڑے خوف ناک تاثرات تھے۔ آنکھوں میں انجانا سا طوفان تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سہم گئی۔

”زخم اتنے ہی لگاؤ و درد و جاہت.....! جتنے زخموں کا تم حساب دے سکو کیونکہ اپنے زخموں کا حساب میں بے باق کر کے رہتا ہوں۔“

غزین نے اسی طرح جھٹکے سے اسے چھوڑا اور وہ چپ چاپ باہر نکل آئی پھر سارا وقت کھوئی کھوئی سی خوفزدہ سی رہی کیونکہ غزین کو وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

”اوہو.....! تم نے جو کیا وہی تمہیں کرنا چاہیے تھا اب اس طرح کیا چپ رہ کر اپنی کمزوری اور اس کی بہادری کا اعتراف کرو گی.....؟ جو بکواس اس نے کی اس کا یہی تو جواب بنتا تھا، وہ ہوتا کون ہے ہمارے گھر میں آکر تمہیں ذلیل کرنے والا.....؟ مجھے تو حیرت ہے کہ وہ نہ جانے کب سے اس گھر کے لوگوں سے اتنا مانوس ہے کہ گھر کے فرد کی سی اس کی حیثیت ہے۔ تم نے تو پھر بھی لحاظ کر دیا، میں ہوتی ناں تو منہ نوچ لیتی اس خبیث شخص کا۔ یہ ہوتا کون ہے تم سے ایسی باتیں کرنے والا.....؟“ وردہ نے ساری بات علیزہ کو بتادی تھی اور اب وہ آگ بگولہ ہو رہی تھی۔

”آہستہ بولو علیزہ.....! کوئی سن نہ لے، شادی کا موقع ہے کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے۔“ وردہ خوفزدہ تھی۔

”علیزہ کو منع کیا۔“

”ہاں.....! بس تم اسی طرح ڈرتی رہنا، دیکھ رہی ہو ناں کس طرح گھل مل گیا ہے سب میں اور یہ جو ارمغان صاحب ہیں ناں.....! علیزہ نے غصے سے ارمغان کو کوسا..... اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ان ہی کی طرف آ رہا ہے۔“

”جی فرمائیے.....! کیا حکم ہے.....؟“ وہ علیزہ کے حسن کی تابانیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

”ویسے یہاں ہو کیا رہا تھا.....؟ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے میں آج ماشاء اللہ نظر لگ جانے کی حد تک خود بخود اسماٹ لگ رہا ہوں مگر یوں چھپ چھپ کر تعریف کیوں کر رہی ہیں.....؟ ہم ہمہ تن گوش ہیں، اک بار کہو کہ تم.....“

لہجہ گہرا ہو گیا، آنکھوں میں جگنو رقصاں ہونے لگی۔ وہ علیزہ کی طرف جھکا تو اس نے قہر بارنگاہ اس پر ڈالی۔

”ڈائیلاگ بولنے کا اتنا ہی شوق ہے تو معیاری فلمیں دیکھا کیجئے۔“ علیزہ کو اس وقت جو غزین پر غصہ تھا وہ ارمغان پر اس لیے اتار رہی تھی کہ اسی کی دوستی کی وجہ سے وہ سارے گھر پر چھا گیا تھا۔

”اوکے.....! لیکن شاید آپ جانتی نہیں معیاری فلمیں کی ہیروئن بن کے سب کچھ سمجھ جایا کرتی ہے۔ یہاں ہم بچپن سے آپ کے سامنے بین بجا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ سمجھ کی دنیا سے بہت دور ہیں۔“ ارمغان کا

لہجہ ادب سا گیا۔

”ارمغان.....! کیا ضرورت تھی غزین کے بچے کو انوائٹ کرنے کی.....؟“

”ارے.....! نہیں بھئی وردہ.....! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے، ہم نے غزین کے بچے کو نہیں خود غزین کو انوائٹ کیا ہے۔ دیکھ لو وہ اکیلا آیا ہے۔“

ارمغان نے کچھ اتنی بر جستگی سے کہا کہ ہلکی سی مسکراہٹ علیزہ کے ہونٹوں پر چپکے سے نمودار ہوئی اور غائب ہو گئی مگر اس لمحے کو ارمغان نے اپنی آنکھوں میں قید کر لیا۔ بارات کی آمد کا استقبال یہ تھا، لڑکیاں پھولوں کے ہار لیے کھڑی تھیں، لڑکے شرارت سے جہاں لڑکیوں کی تعداد ہوتی وہیں جاتے۔ ارمغان اور غزین لڑکے والوں کے ساتھ آ رہے تھے، وردہ اور علیزہ بھی ہار لیے کھڑی تھیں۔ ارمغان نے سبز لباس میں نئی سنوری علیزہ پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کے سامنے سر جھکا دیا کہ ہار ڈالے گی مگر علیزہ نے دنیا کو ہار دیا اور آگے بڑھ گئی۔ یوں دو دنیا

تھیں ارمغان کی گردن کا بھرم رکھ لیا۔

”تیری یہ ادب بے رحمی ہے کہ جیافصلہ کون کرے علیزہ.....! کچھ بھی کر تو تمہیں پانا ہے ضرور۔“ دل میں اٹھتی لک کے ساتھ ارمغان نے علیزہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر زیر لب کہا تو اسے اپنی پشت پر غزین کی آواز سنائی دی۔

”ارے بھئی.....! تمہارے گلے میں ہار ڈال دیا گیا ہے اب ہمارے لیے جگہ بناؤ۔“

غزین ارمغان کو کھسکا کر خود وردہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس نے نخوت سے غزین کو دیکھا اور پھیلا ہوا ہار سمیٹ لیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو جوتیوں کا ہار ڈالتی اس کے گلے میں، وہ جو گرے ڈنر سوٹ میں بہت جچ رہا تھا اور اس وقت وردہ کی کیفیت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”ارے بھئی.....! ہار ڈال لیے ہم دولہا والے ہیں، دولہن لینے آئے ہیں، دولہن چھوڑ گئے تو بہت برا ہوگا۔“ وہ اس کے قریب سر جھکائے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جہاں اس کے لیے چڑ اور نفرت تھی اور یہی تو اس کے انجوائے کرنے کی چیز تھی۔ وہ جتنا جلتی اسے اتنا سکون ملتا۔

”ارے خاتون.....! جلدی کیجئے۔“ غزین نے اسے یاد دلایا کہ وہ ابھی بھی اس کے قریب گردن جھکائے کھڑا ہے اور اس کی یہ حرکت بہت سے فسانے جنم دے سکتی تھی۔ وردہ پھٹکاری۔

”جودلہن لے کر جائے گا اسے ہار پہنائے جا چکے ہیں۔“

دولہن تو مجھے بھی لے کر جانی ہے۔ لہذا اس ہار مگر ہار نہیں اس جیت پر میرا بھی حق ہے۔“ پھر غزین نے کمال جرأت سے اس کے ہاتھوں سے ہار پکڑ کر اپنے گلے میں ڈالا۔ اسی وقت کمرے کی روشنی ہوئی اور اس منظر کو ایاز نے اپنے کمرے میں قید کر لیا۔ روبی اور سعود کی شادی میں کئی اور نئے جوڑے بن گئے تھے۔ عفت نے شہلا سے وردہ کو بعد اصرار مانگ لیا۔

”بھابھی جان.....! مجھے کب اس رشتے سے انکار ہے.....؟“

”تو نند صاحبہ.....! تم نے اس رشتے کا اقرار بھی تو نہیں کیا۔ بس میں کچھ نہیں جانتی، میں وردہ کو اپنے ارمغان کے نام کی انگوٹھی پہنانا چاہتی ہوں۔ ارے بھئی.....! میرے شہزادے میں کوئی کمی ہے جو تم ایسے کر رہی ہو.....؟“



”جی بھابی جان.....! ہے ناں کی آپ کے شہزادے میں۔“ شہلا بھابی کو چڑانے لگیں۔ وہ غصے سے ان کی طرف گھومیں۔

”کس بات کی کمی.....؟“

”سینگوں کی.....!“ شہلا نے برملا کہا تو عفت ہنسنے لگیں۔

”ارے.....! داماد بنالو پھر بھلے سینگ لگوانا یا دم کٹوانا۔ بس میں باقاعدہ کوئی تقریب کر کے اس رشتے کا اعلان کرنا چاہتی ہوں۔“

”بھابی جان.....! آپ وردہ کو اتنا چاہتی ہیں.....؟“ شہلا نے غور سے ان کو دیکھا۔

”ہاں.....! اتنا کہ خیر باتوں میں مجھے مت اُلجھایا کرناؤ میں کب انگوٹھی لے کر آؤں۔“

”ٹھیک ہے بھابی جان.....! میں وردہ سے بات کر لوں تو پھر آپ اپنی مرضی سے جو کرنا چاہیں کریں، مجھے ارمغان جیسا داماد مل جائے اس سے بڑھ کر اور مجھے کیا چاہیے۔“ اور اسی رات شہلا نے وردہ کو اس فکر میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ چپ سی ہو گئی تھی۔

”بیٹا.....! یہ زندگی بھر کا ساتھ ہے، تمہارا فیصلہ جو بھی ہوگا میرے لیے محترم ہوگا۔“ شہلا نے اس کے چہرے پر اُلجھن کو دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئیں۔ وہ رات وردہ پر بہت بھاری تھی، گزرتے ہوئے ایک ایک لمحے کو سوچ رہی تھی، ارمغان اس کا کزن تھا، بہت اچھا دوست، بہت اچھا انسان، جو ہر مشکل وقت کی دھوپ میں اس کا سایہ بن گیا تھا لیکن اس کے دل میں ارمغان کے لیے نہ تو کوئی لطیف جذبہ تھا، نہ نرم گوشہ تھا، نہ آنکھوں میں اس کے نام کے خواب تھے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بزرگ ان دونوں کی شادی کے بارے میں سوچ بھی سکتے ہیں۔ آج یوں اچانک ارمغان اور وہ..... اسے عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔

”نہیں.....! ہرگز نہیں.....! نہ تو میرے دل میں ارمغان کے لیے ایسی کوئی بات ہے اور نہ ہی میں نے کسی ارمغان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا۔ نہیں.....! یہ ماما اور مائی کو کیا ہو گیا ہے.....؟ ہم اچھے دوست تو ہو سکتے ہیں مگر نہیں.....! اس سے آگے سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“ ٹپٹپٹے ٹپٹے وہ تھک کر لیٹ گئی مگر پھر اٹھ بیٹھی۔

”دلہن تو مجھے بھی اس گھر سے لے کر جانی ہے، تمہارے دل کے دروازے پر اپنے نام کی نیم پلیٹ نہ لگا دوں تو کہنا۔“ غزین کی آواز کا شعلہ بھڑکا جس نے وردہ کو راگھ کر دیا۔

”میرے دل کے دروازے پر تمہارے نام کی نیم پلیٹ.....؟ مپا بل.....!“ وہ فیصلہ کن انداز میں باہر نکلی، کوریڈور میں آئی، اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ دو متضاد راستے تھے، وہ کسی ایک پر بھی چلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ غزین سے خوفزدہ ہو کر کوئی کمزور اور غلط فیصلہ بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”ماما.....! میں آپ کی بات کا جواب دینے آئی تھی۔“ وہ اب ماما کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ شہلا کا دل دھڑک اٹھا۔

”آؤ میری جان.....! بیٹھو کہو کیا بات ہے.....؟“

”ماما مجھے یہ کہنا تھا کہ.....“



وردہ جب سے ارمغان کے بارے میں سوچ رہی تھی، جب سے شہلا نے اسے عفت کی پسندیدگی اور خود ارمغان کے لیے اپنی پسندیدگی کی سند دے کر فیصلے کا حق اسے دے کر اسے عجیب کشش اور اُلجھن کا شکار کر دیا تھا۔ ارمغان اگر ان کا حتمی فیصلہ ہوتا اور وہ اسے جبراً مان لیتے پر مجبور کرتیں تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مان کر ہمیشہ کی طرح ماما کی محبت اور فرمانبرداری کا تاج سر پر رکھ لیتی مگر انہوں نے اپنی عفت ماما جنہوں نے ہمیشہ اسے ماں کی طرح چاہا تھا، کی پسند بتا کرنا چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے فیصلے کا پابند کر دیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے علیزہ کو اس پر بوزل کے بارے میں بتایا تو وہ کسی سے یوں اُچھلی جیسے کرنٹ لگا ہو۔

”کیوں، کیوں آخر.....؟ یہ ڈاکٹر شہلا، ہم سے کیا خراج وصول کرنا چاہتی ہیں.....؟ اگر ہمیں پال کر اپنا حق یوں وصول کرنا چاہتی ہیں تو نیور وردہ.....! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ خبردار جو تم نے ہاں کی ہو تو۔“

ارے.....! وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا غیر سنجیدہ شخص زندگی کی حقیقی خوشیاں دینے کی صلاحیت ہی کہاں رکھتا ہے.....؟ آئی ہیٹ ہم اور تم انکار کرو گی وردہ.....! ورنہ.....“

علیزہ بڑے کڑے تیور لے کر وردہ سے انکار کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وردہ نے اسے دیکھا۔ مارے غصے سے اس کا چہرہ لال۔ بھوکا ہو رہا تھا اور ہولے ہولے کانپتے وجود سے ارمغان سے نفرت جھلک رہی تھی۔ وردہ خوفزدہ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ علیزہ کچھ بھی کر گزرے گی اگر اس نے انکار نہ کیا اور اس کے بات کرنے کا انداز وہ جانتی تھی اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی وہ اس معاملے میں بولے۔ یوں بھی ارمغان اسے ناپسند نہیں تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے کبھی اس کے حوالے سے نہ خواب مگر آباد کیا تھا نہ دل کا شہر اس کی باتوں کے تاروں سے سجایا تھا۔ وہ تو اسے ایک دوست اور کزن کے حوالے سے جانتی تھی۔ شادی، اس سلسلے میں تو اس نے یوں بھی کوئی خواب نہیں دیکھا تھا تو ارمغان کے بارے میں فیصلہ، وہ اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

”وردہ.....! تم نے اگر کسی دباؤ یا محبت میں آ کر قربانی دی اور یہ زہر کا پیالہ پینے کا فیصلہ کیا تو دیکھنا میں کچھ کر گزروں گی۔ بولو تم انکار کرو گی یا میں خود جاؤں ماما کے پاس۔“ علیزہ نے وردہ کو یوں سوچ میں کم دیکھا تو پھر چپنی۔ تب وردہ خوفزدہ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی علیزہ جو کہہ رہی ہے، کر گزرے گی اور وہ کسی صورت



میں مہمانی کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”ڈونٹ وری علیزہ جان.....! میں کوئی ننھی بچی ہوں کہ وہ لوگ میری مرضی اور پسند کے خلاف زبردستی نکاح پڑھوادیں گے.....! ارے بھئی.....! ابھی تو میری رائے پوچھی ہے ممانے اپنا فیصلہ صادر نہیں کیا اور میں مجھے ان کا فیصلہ پسند ہی نہیں تو تم پریشان نہ ہو علیزہ.....! میں سمجھدار ہوں، سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کروں گی۔ میری زندگی کا ساتھی کوئی بھی ہو مگر ارمغان نہیں ہو سکتا۔“

وردہ اس وقت کچھ تو ابھی ہوئی تھی غزین کی وجہ سے، ماما اور عفت کی محبت سے، ارمغان کی اچھائی اور خود علیزہ کے خوف سے، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن اس کے لفظوں کی پھوار نے علیزہ کے سلگتے دل پر ٹھنڈا چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ اسے وردہ سے ایسے ہی فیصلے کی توقع تھی۔

”ڈن.....؟“ وہ وردہ کے ہاتھ تھامے یقین دہانی چاہ رہی تھی۔

”ڈن.....!“ وردہ نے بھی یقین کی مہر ثبت کر دی۔

”اوکے.....! مجھے تم پر پورا اعتماد ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔“

”تم بے فکر ہو کر لاہور جاؤ میں بفضل تعالیٰ سب کچھ ہینڈل کر لوں گی۔“

اور یوں وردہ کی اتنی یقین دہانیوں کے بعد علیزہ لاہور چاہنے پر تیار ہوئی تھی۔ علیزہ اور ارمغان تو لاہور پڑھائی کی غرض سے گئے ہی تھے، جو اب بھی ارمغان کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے کر چلا گیا تھا۔ وہ لوگ جا چکے تھے تب ہی وردہ مسلسل ارمغان کے بارے میں اور غزین کے رویے کے بارے میں سوچ سوچ کر بے حال ہو گئی تھی۔ شاید وہ غزین سے خوفزدہ تھی تب ہی وہ ارمغان کو اپنی ڈھال بنانا چاہتی تھی مگر اپنی غرض کے لیے ارمغان کو ڈھال بنانا یا ماما اور مامی کو جھوٹی خوش دینا اسے بہتے گلیاں بات لگتی تھی۔ تب ہی وہ بہت سوچ بچار کے بعد ماما کی عدالت میں آتو گئی مگر اب بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی جبکہ اب شہلا اس کے جواب کے انتظار میں کتاب بند کر کے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سوچنا کی تحریر اور انگلیوں کا آپس کا الجھاؤ اس کے اندرونی خلفشار کو واضح کر رہا تھا۔ وہ کافی حد تک اس کا فیصلہ جان چکی تھیں۔

”وردہ جان.....! تم کچھ کہنے آئی تھیں.....؟“ وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئیں تو وہ نظریں چرا کر کھڑکی کی طرف رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”ماما.....! میں..... میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ میرا فیصلہ، میری محبت، میری فرمانبرداری سے مشروط تو نہیں ہے۔“

اس کی بات پر شہلا مسکرا دیں اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

”نہیں میری جان.....! تمہارا کوئی بھی فیصلہ نہ تو میری محبت سے مشروط ہے اور نہ ہی فرمانبرداری سے، بلکہ تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو اور تمہارا کیا فیصلہ ہے میں سمجھ گئی ہوں۔“

شہلا کا لہجہ گہرا سا ہو گیا کیونکہ عفت وردہ کو بہت چاہتی تھیں بچپن ہی سے تو انہوں نے اسے مانگ رکھا تھا۔

”تھینک یو ماما.....! مگر وہ مامی.....؟ میں جانتی ہوں آپ تو ماں ہیں مجھے انڈر اسٹینڈ کریں گی مگر مامی

بہت ہرٹ ہوں گی۔“

وردہ کے انکار کے راستے کی سب سے بڑی چٹان مامی کی محبت تھی جو وہ اسے بچپن ہی سے دیتی آرہی ہیں۔ اس کی بات پر شہلا بھی اُداس ہو گئیں کیونکہ وردہ اتنا نہیں جانتی تھی جتنا وہ بھابھی کی محبت کو جانتی تھی۔ ایک لمحہ سا احساس اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”جو لوگ محض اپنی پسند اور خوشی کے فریم میں اپنی پسندیدہ تصویر سجالتے ہیں یہ جانے بغیر کہ تصویر ان کی محبت کے سنہری فریم میں فٹ بھی ہونا چاہتی ہے یا نہیں وہ لوگ بہت ہرٹ ہوتے ہیں۔ مگر اس میں نہ ان کا قصور ہے اور نہ ہی تصویر کا۔ بس ایک تکلیف دہ احساس دونوں کا مقدر بن جاتا ہے مگر بیٹا تم خود پر کوئی بار نہ لو میری ہان.....! کسی مشین کو تو اپنی مرضی کے مطابق آن آف کیا جاسکتا ہے مگر انسانی دل کو نہیں، ڈونٹ وری.....!“

”آئی لو یو ماما.....! آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کتنی اچھی ہیں، آپ میری ماما ہیں، آپ کو معلوم ہے

ماما.....! میں کتنی آپ سے پیٹ رہی ہوں۔“

وردہ ان کے گلے کی محبت سے رو دی۔ اسے علیزہ پر غصے آنے لگا جس نے ہمیشہ ماما کو خود غرض اور غلط سمجھا تھا۔

”ماؤں کے دل سمندر سے زیادہ وسیع اور گہرے ہوتے ہیں بیٹا.....! اللہ تعالیٰ نے ممتا کی آنکھوں میں ایسی دُور بین فٹ کر دی ہے جو اپنی اولاد کے اندر تک دیکھ لیتی ہے۔ تم نے ناحق اتنے دن لگا دیے سوچنے میں، میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی جب میں نے تمہیں ارمغان کے بارے میں کہا تھا۔“

”ماما.....! ارمغان بہت اچھا ہے، میرا بہت اچھا دوست ہے بلکہ میں جب بھی ان سے پوچھ کر رہی ہوں میں اسے اپنی ڈھال بنا لیتی ہوں مگر..... مگر شادی.....؟“

کبھی کبھی انسان بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ وردہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ شہلا سے شرمندہ بھی تھی۔ کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ لالچ کی خوشی کی خاطر جان بھی دے دیتی مگر ارمغان سے شادی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

”وردہ.....! میری جان.....! میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں اپنی بیٹی کو مگر اب اس دیوانی کا کیا علاج کیا جائے جو تمہارے عشق میں مبتلا ہے۔“

”دیوانی.....؟ کون دیوانی ماما.....!“ وردہ واقعی سمجھ نہیں پاتی۔

”ارے.....! بھابھی جان اور کون.....؟ جب تم پیدا ہوئی تھیں ناں بھابھی جان نے تمہیں ارمغان کے لیے مانگ لیا تھا یہ تو میں نے ہی ان کی منہ زور محبت کے آگے بند باندھا ہوا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا ناں تو اب تک تمہارا نکاح بھی ارمغان سے کرا چکی ہوتیں۔“

”ماما.....! بس انہی کی وجہ سے تو مجھے افسوس ہو رہا ہے، ایسا کیا کریں کہ مامی بھی خفا نہ ہوں.....؟ کیا کہا جائے.....؟ میں ارمغان سے بات کرتی ہوں، اب وہ لاہور بھی چلا گیا ہے۔ چلیں فون پر بات کر لیتی ہوں۔“

”ہاں.....! یہ ٹھیک رہے گا اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن ابھی تو وہ یونیورسٹی میں ہوگا رات میں فون کرنا۔“



مگر رات میں فون کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ارمغان کسی بہت ضروری کام سے کراچی آگیا تھا۔  
 ”ارمغان.....! سچ کبھی کبھی تو دُعائیں اتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں کہ بعد میں افسوس ہوتا ہے کہ کاش کہل  
 اچھی دُعائی مانگ لی ہوتی۔“

وردہ کو اسے سامنے دیکھ کر زندگی میں پہلی بار اتنی خوشی ہوئی تھی کہ ارمغان بھی مٹھوک سی نظروں سے اسے  
 دیکھنے لگا۔ وہ اس کی مٹھوک سی پسند ہے یہ وہ جانتا تھا اور انہوں نے اور بھی بہت کچھ سوچ رکھا ہے یہ بھی معلوم تھا  
 مگر اس حوالے سے وردہ خوش ہو یہ اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھا تب ہی تو وردہ کی بات اس کے چہرے پر  
 ناگواری سی لے آئی۔

”اچھا.....! ایسی کون سی دُعا قبول ہوگئی ہے کہ اتنا خوش ہو رہی ہو.....؟ ہماری تو ابھی تک کوئی دُعا قبول  
 نہیں ہوئی۔ تمہاری کون سی مراد برآئی ہے.....؟“  
 ”تمہارے آنے کی دُعا قبول ہوگئی ہے۔“

”کیا تم نے میرے آنے کی دُعا کی تھی.....؟“ وہ ناگواری سے مڑا۔

”اور نہیں تو کیا.....؟ ارمغان.....! انسان کی زندگی میں خواہ مرد ہو یا عورت، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ  
 اسے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے اور اس کے لیے اسے ایک اچھے دوست اور مخلص ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور تم  
 میرے سب سے اچھے دوست بھی ہو اور ماما، ماما چاہتی ہیں کہ ہم دونوں.....“ وردہ ابھی کہنے ہی والی تھی کہ  
 ارمغان جھٹکے سے اٹھا۔

”ٹھہریے میڈم.....! اچھا ہوا جو بات آپ نے شروع کی، مجھے بھی اسی سلسلے میں تم سے کچھ کہنا ہے۔“  
 ارمغان آج وردہ کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ وردہ بہت اچھی لڑکی ہے وہ جانتا تھا۔ اس کی ماں اور گھر والے  
 اسے اس کی ذہن بنانا چاہتے ہیں یہ بھی جانتا تھا مگر خود اپنے دل کا کیا کرتا جہاں صرف اور صرف اس منکر، بے وفا  
 علیزہ کا راج تھا جو اپنے ظلم و ستم کے باوجود اس کے دل پر حکمرانی کر رہی تھی جس کی محبت کے دیے روشن تھے اس  
 کی پلکوں کی منڈیروں پر وہاں وردہ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ وردہ کو صاف صاف اپنے دل اور زندگی میں اس کی  
 حیثیت بتا دینا چاہتا تھا تب ہی اس نے درمیان میں وردہ کو ٹوکا تو وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول  
 پڑی۔

”پلیز.....! پلیز ارمغان.....! اب روایتی فلمی مکالمے نہ بولنا کہ وردہ.....! میں تمہیں شدتوں سے چاہتا  
 ہوں، تمہاری محبت میں بچپن ہی سے پاگل ہوں۔ وردہ.....! اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مرجاؤں گا۔ پلیز.....! ایسا  
 کچھ مت کہنا۔“

”ایکسکوز می محترمہ.....! یہ آپ ہیں کن ہواؤں میں.....؟ ارے.....! کون کہہ سکتا ہے کہ آپ ڈاکٹر  
 ہیں.....؟ اپنی حرکتوں اور باتوں سے اس وقت ایک ساتویں آنٹھویں فیل، غیر معیاری شاعری پڑھنے والی،  
 خوابوں میں رہنے والی، کوئی پسماندہ ذہن کی مالک لڑکی لگ رہی ہو، ہونہہ.....!“ ارمغان کو آگ ہی تو لگ گئی  
 تھی وردہ کی بات سن کر۔

”تو..... تو تم ایسا تو کچھ نہیں چاہتے ناں.....؟“ وردہ خوش ہوگئی۔

”چاہتا ہوں.....! بالکل چاہتا ہوں.....!“

”ایں.....؟“ وردہ بچھ گئی۔

”ہاں.....! چاہتا ہوں.....! بچپن سے چاہتا ہوں.....! دیوانہ ہوں، نہ ملیں تو پاگل تو کیا مرجاؤں گا،

اے شدتوں سے چاہتا ہوں مگر تمہیں نہیں..... علیزہ کو..... ہاں.....! میں علیزہ کو بچپن ہی سے چاہتا ہوں۔“

”تت..... تت..... تم ارمغان.....! تم واقعی پاگل ہو گئے ہو، تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا.....؟ تم

انہی سچ کہہ رہے ہوناں.....؟“

وردہ کو بڑی خوشگوار حیرت اور خوشی ہو رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ جس نے اب تک

علیزہ کی چاہت کو خود سے بھی چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ آج یوں وردہ کے سامنے بے نقاب کر کے جیسے شرمندہ سا ہو

گیا۔

”آئی ڈونٹ بلیواٹ ارمغان.....! کیا تمہیں اپنی ٹانگیں پیاری نہیں جو اس لڑکی سے عشق کرنے چلے

ار.....؟“

”ارے.....! جب دل جیتی دولت اس کے قدموں پر نچاؤ کر دی تو ٹانگوں کی کیا حیثیت.....؟ وہ میرا

مطلب ہے کہ..... لیکن یہ سچ ہے وردہ.....! کہہ آئی لو ہر.....! اور اگر وہ نہ ملی تو.....“

ارمغان کا لہجہ گہرا ہو گیا، اس کی نگاہوں میں علیزہ کا حسین روپ اتر آیا تو وردہ جو علیزہ کے لیے اتنے

اٹھے اور خود نو جوان کے دل میں محبت دیکھ کر بے حد خوش ہوگئی تھی۔ اسے ایک دم شرارت ہو گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو ارمغان.....! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم میری ہی بہن کو میری ہی رقیب بنا کر

سامنے لا کر اکڑو گے.....؟ ارمغان.....! تم صرف اور صرف میرا حق ہے، ماما مجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں

علیزہ کو نہیں، میں تمہیں بچپن ہی سے پسند کرتی ہوں اور تم کہتے ہو کہ تم علیزہ کو..... نہیں.....! میں یہ نہیں ہونے

واں گی، میں ابھی جا کر ماما سے کہہ دیتی ہوں کہ میں ان کی بہو بننے کو تیار ہوں۔“

ارمغان اس کی خوبصورت آنکھوں میں اپنے شوق جگنو نہ دیکھ سکا۔ سر تاپا سلگ اٹھا اور وردہ جو شوخی سے

دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا کہ جس سے وردہ کو ارمغان کی علیزہ

سے محبت کا یقین ہو گیا۔

”اگر تم نے مذاق میں بھی ایسی حرکت کر دی تو بہت برا ہوگا۔“ ارمغان شدید غصے میں تھا، اس کی سانس

پھول گئی، تنہے بھی پھول گئے تو وردہ اس کی اس حالت سے محفوظ ہونے لگی۔

”اچھا.....! آپ محبت کریں میری بہن سے، شادی کرنا چاہیں میری بہن سے اور اس کی عزیز از جان

بہن کے ساتھ بہت برا ہوگا۔ خیر منائے اپنی، اسے اگر یہ بات معلوم ہوگئی ناں تو آپ کا برا ہو جائے گا یعنی کہ حد

ہوگئی، بجائے میری خدمت کرنے کے، مک مکاؤ کرنے کے دھمکی دی جا رہی ہے۔ یاد رکھو لڑکے.....! اگر میں

نے گڑبڑ کر دی ناں تو.....“ ارمغان وردہ کی شرارت سمجھ کر پرسکون سا ہو کر مسکرا دیا۔

”اوہ.....! کہہ تو تم بھی ٹھیک رہی ہو اب تو مجھے تمہاری خدمت کرنی ہی چاہیے۔ کہو تو گلابا دوں.....؟“

وہ باقاعدہ اس کا گلابا بننے لگا تو وردہ ہنس دی۔



اس کی تھی کہ اس رشتے کا اعلان نہ ہو جائے۔

”بھئی ارمغان.....! سیدھی سی بات ہے۔ مائی مجھے بہت چاہتی ہیں، میں تو مان جاؤں گی۔“

”اور میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“ وردہ نے شوخی میں کہا تو ارمغان کو خصر آگیا۔

”ارمغان.....! تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ اللہ مالک ہے۔“ شہلا نے حوصلہ دیا۔

• • •

ظفر شہباز کی کونٹھی میں شفٹ ہو چکے تھے یوں خولہ کی تنہائی اور بوریٹ تو ختم ہوئی تھی خود عطیہ خاتون کو آصف کی صورت میں ایک ہمدرد دوست مل گئی تھی، ایک فیملی بن گئی تھی۔ عطیہ خاتون خوش تھیں کہ خولہ خوش اور مطمئن ہے۔ وہ نعمان اور زوہا کے ساتھ گھومتی پھرتی جو چاہتی کرتی۔ عطیہ خاتون نے کوئی غیر ضروری پابندی نہیں لگائی تھی اس پر تب ہی تو وہ ان سے بہت خوش تھی۔

”کتنی پیاری بچی ہے مگر دیکھئے تو والدین کی چپقلش نے اسے کتنا آپ سیٹ کیا ہوا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ خود سے کر ہی نہیں سکتی۔ اس روز کتنا خوش ہوئی تھی کہ انکل آپ نے صرف میری وجہ سے اپنا فیصلہ بدل دیا، کیا میں بھی اس قابل ہوں کہ کوئی صرف میری خاطر کوئی فیصلہ بدلے۔“

”بس آصفہ.....! یہ والدین جو اپنی اپنی انا کی جگہ لڑ رہے ہوتے ہیں وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس میں وہ اپنے بچوں کو ہار دیں گے.....؟ ان کی خوشیوں کو منہ سے ہٹا کر وہ شہلا کو روک دیتے ہیں جو نہ صرف اپنی زندگی بلکہ معاشرے کی زندگی کو تباہ کر سکتے ہیں جبکہ ان کی کہانی میں جہاں تک میں سمجھتی ہوں شہباز صاحب قصور وار ہیں۔“ عطیہ خاتون نے جو آج تک محسوس کیا تھا وہی کہا۔

”آپ خولہ کی ممانعت سے مل چکی ہیں.....؟“

”نہیں.....!“

”عطیہ خاتون.....! عطیہ خاتون.....! کہاں ہیں آپ.....؟“

خولہ ابھی کالج سے آئی تھی۔ اس نے این سی اے میں ایڈمیشن لے لیا تھا اور وہیں اس کی ملاقات علیزہ سے ہوئی تھی۔ علیزہ دو سال خولہ سے سینئر تھی مگر دونوں کے شوق، خیالات، مزاج میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ عمر کا فرق کلاس کا فرق مٹ کر بے تکلف دوستی میں بدل گیا تھا۔

”میں یہاں ہوں بیٹا.....! خولہ.....! کیا بات ہے.....؟“

”اسلام علیکم آنٹی.....!“ خولہ آصفہ کو دیکھ کر رازک گئی۔

”وعلیکم اسلام بیٹی.....! زوہا اور نوئی بھی آگئے ہیں کیا.....؟“ آصفہ بھی کھڑی ہو گئیں۔

”جی آنٹی.....! وہ لوگ بھی آگئے ہیں اور ابھی میں نے انکل ظفر کو بھی آتے دیکھا ہے۔“

”اوہو.....! پھر تو ایمر جنسی نافذ ہونے والی ہے۔ اوکے عطیہ.....! میں پھر چکر لگاؤں گی۔“ آصفہ یہ کہہ

کر اپنے پورشن کی طرف چلی گئیں تو عطیہ خاتون خولہ کی طرف گھوم گئیں۔ اس کے بالوں کو پیار سے کانوں کی

اوٹ میں اڑتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”جی.....! گلابا دو تا کہ ایک ووٹ جو تمہارے حق میں ہے وہ بھی نہ رہے۔“

”ارے بھئی.....! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ سوری.....! سوری ڈیر کرن.....!“

اب وہ اس کا ہاتھ تھامے سوری کر رہا تھا۔ اسی وقت کسی کام کے سلسلے میں عفت وہاں سے گزری تو ان دونوں کو یوں خوش دیکھ کر خود بھی بے حد خوش ہو گئیں اور جا کر شہلا کو پکڑ لائیں۔

”ارے بھائی جان.....! ہوا کیا ہے.....؟“ شہلا کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

”وہ دیکھو.....! ماشاء اللہ، چشم بد دور، دونوں کتنے خوش ہیں، چاند سورج کی جوڑی لگ رہی ہے ناں۔“

ارے.....! میرا بس چلے تو کل ہی قاضی کو بلا کر ان کا نکاح کر دوں۔“ عفت بہت خوش تھیں۔

”جی ضرور.....! مگر قاضی کو بلانے سے پہلے بچوں سے ضرور پوچھ لیں۔“ شہلا نے ایک نظر وردہ اور

ارمغان پر ڈالی۔ ان دونوں کے درمیان دوستانہ سی فضا کو وہی سمجھ سکیں۔

”کیوں.....؟ بچوں سے کیا پوچھ لوں.....؟“ عفت کو اب یہ پوچھ کچھ بے معنی لگی۔

”ارے بھئی.....! ہو سکتا ہے بھائی جان.....! کہ بچے آج ہی نکاح کرنا چاہ رہے ہوں.....؟“ شہلا

عفت کے عتاب سے اس جیلے کی آڑ میں بچ نکلیں۔

”ہائے.....! تمہارے منہ میں گھی شکر، خدا وہ دن تو دکھائے، دیکھنا گھی کے چراغ جلاؤں گی۔“

”جلس گئے نہیں.....!“ جانے کیسے شہلا کی زبان سے پھسل گیا تو عفت ان کو گھورنے لگیں۔

”وہ..... میرے کہنے کا مطلب ہے بھائی جان.....! کہ گھی کون سا اصلی ملتا ہے، ملاوٹ زدہ گھی

چراغ تھوڑی جلتے ہیں۔“

”شہلا.....! تم بھی ناں.....!“ عفت اور شہلا وہاں سے ہٹ گئیں۔ اسی رات وردہ نے شہلا کو ارمغان

کی خوشی اور خواہش کے بارے میں بتا دیا تو شہلا نجانے کیوں عجیب سی خوشی ہوئی کیونکہ ان کی شروع ہی سے

خواہش رہی تھی کہ علیزہ اور ارمغان کی جوڑی بنے۔ وہ چاہتی تھیں کہ بکھری بکھری سی اس پر یوں جیسی لڑکی کو کوئی

بہت ہی سچا اور مخلص ارمغان جیسا نو جوان ملے۔ ان کی خواہش تو بن گئے پوری ہو گئی تھی۔

”وردہ.....! میں بے حد خوش ہوں، تم دونوں میری آنکھوں کا نور ہو اور ارمغان کو میں اپنا ہی داماد بنانا

چاہتی تھی مگر جب تم نے انکار کر دیا تو ارمغان کو کھودینے کا احساس ہونے لگا تھا مگر آج میں بے حد خوش ہوں کہ

میری علیزہ کو اتنا اچھا نو جوان چاہتا ہے بلکہ میں تو شروع ہی سے یہی چاہتی تھی کہ علیزہ اور ارمغان جیون ساتھی

بنیں مگر اب پر اہم یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون.....؟“

”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا ماما.....! وقت آنے دیں، میں علیزہ کو منالوں گی، وہ دل کی بہت اچھی

ہے۔“

وردہ اچھی طرح جانتی تھی کہ علیزہ کے دل میں شہلا اور ارمغان کی کیا حیثیت تھی۔ پھر بھی اس نے اللہ کا

نام لے کر ہامی بھری۔ اب ان تینوں کی پارٹی بن گئی تھی اور طے یہ ہوا تھا کہ جب تک علیزہ کا دل نرم نہیں ہو جاتا

عفت کے سامنے ڈرامہ جاری رہے گا۔

”پھپھو.....! اور جو ممانعت کوئی عملی کارروائی شروع کر دی تو ہم کیا کریں گے.....؟“ ارمغان کو یہ فکر



”عطیہ خاتون.....! رات کو کھانے پر میرے دوست آرہے ہیں، اچھا سا ڈنر رینج کر دیجئے۔“

”اچھا.....! ڈنر میں کون کون سے دوست ہوں گے.....؟ آیا ہم بھی دوست کی فہرست میں ہیں؟“

”عطیہ خاتون.....! آپ تو میری جان ہیں۔“ خولہ نے عطیہ خاتون کو بھرپور انداز میں پیار کیا۔ سارا سکون، خوشی ان کی رگوں میں اتر گئی مگر یہ خیال اُداس کر گیا کہ وہ پالنے والی ماں ہیں تو بیٹی کی محبت کی اس کے لمس کی اتنی خوشی ہو رہی ہے تو سگی ماں تو کتنا ترپتی ہوگی اس کے لمس کو۔“

”کیا سوچ رہی ہیں عطیہ خاتون.....؟“ خولہ نے ان کی سوچ کو پڑھ لیا۔

”صرف یہ کہ آئی ایم لکی کہ تم جیسی بیٹی اللہ نے دی۔ خیر یہ بتاؤ کہ کتنے لوگ ہوں گے.....؟ علیزہ زوہا

علاوہ کون کون مہمان ہے.....؟“

”عطیہ خاتون.....! آپ کو کیسے بتا لگا کہ میرے یہی مہمان ہیں.....؟“

خولہ کو بہت حیرت زدہ خوشی ہوئی تھی جب عطیہ خاتون بن کہ اس کی بات سمجھ جاتیں۔

”ماں ہوں نا بیٹا.....! اس لیے تمہارے چہرے پر خوشی کا جوا آئینہ ہے اس میں تمہارے دوستوں کے

چہرے صاف طور پر نظر آرہے ہیں۔ یو ڈونٹ وری.....! دلے اگر میرے دو مہمان بھی آجائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔“

”انکل ظفر اور آنٹی آصفہ بھلا ان کے بغیر کوئی خوشی مکمل ہو سکتی ہے.....؟“

”ہاں.....! تو اب تم بتاؤ ناں تم نے کیسے جانا کہ میرے یہی دوست اور مہمان ہیں.....؟“

”ہوں.....! جواب کے لیے اپنا جملہ یاد کر لیجئے۔ میں علیزہ کو فون کرنے جا رہی ہوں کہ اپنے سسر

بھائی اور کزن کو بھی ضرور لائے۔“ خولہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

”خدا تمہیں ہمیشہ اسی طرح خوش رکھے خولہ.....!“

صدقی دل سے خولہ کو عادی وہ آصفہ کے پاس آگئیں تاکہ رات کو ڈنر کا انتظام دونوں مل کر کریں۔

● ● ●

”ہاں خولہ.....! ٹھیک ہے مگر میں اپنے بھائی اور کزن کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہو سکتا ہے ان کا کوئی اپنا

پروگرام ہو۔“

”نہیں علیزہ.....! میں چاہتی ہوں کہ سب لوگ آئیں، ذرا گیٹ ٹو گیدر رہے گی، لیٹ نائٹ رکیں گے،

کچھ ہلا گلا کریں گے۔ وہ لوگ ساتھ ہوں گے تو تم بے فکر رہو گی ورنہ بار بار جلدی جلدی جانے کا کہو گی جیسے اس

روز ہوا تھا۔“ خولہ اپنی زندگی کی تمام محرومیاں منادینا چاہتی تھی اور زوہا، نعمان کے بعد اسے علیزہ، ارمان اور

جواد اچھے لگے تھے۔ وہ ان سے دوستی بڑھانا چاہتی تھی۔

”اچھا خولہ.....! تم ہولڈ کرو.....! کیا کہہ رہی ہو.....؟ ارے بھئی.....! آواز نہیں آرہی.....

اُف کتنی اُونچی آواز کر رہی ہے ان لڑکوں نے ٹی وی کی۔ جواد.....! آواز آہستہ کرو، کچھ سنا ئی نہیں دے رہا۔“

علیزہ زور سے چلائی۔ ٹی وی پر اس وقت ابرار الحق کا گانا ”سانوں تیرے نال پیار ہو گیا“ لگا ہوا تھا اور

جواد، ارمان دونوں انجوائے کر رہے تھے۔ ارمان تو ساتھ خود بھی گارہا تھا اور نظریں اس کی علیزہ پر تھیں جو سامنے ہی بیٹھی فون پر بات کر رہی تھی۔

”جواد.....! میں کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں ٹی وی کی آواز آہستہ کرو مگر تم لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوتا۔“ وہ

چلائی تو جواد نے ارمان کو دیکھا۔

”ڈیزر آپی.....! ٹی وی کی آواز بالکل بند ہے۔ یہ تو ارمان بھائی گارہے ہیں۔“

”سانوں تیرے نال پیار ہو گیا، ساڈا دل بے قرار ہو گیا، پیسے نی سانوں تیرے.....“

”مسٹر ارمان.....!“ وہ غصے سے اس کی طرف گھومی تو وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا ہاتھ فضا میں

بلند کر کے بولا۔

”آں آں آں.....! آپ میرے دل کی آواز کو نہیں دبا سکتیں کیونکہ سانوں تیرے نال پیار ہو گیا، ساڈا دل

بے قرار.....“

علیزہ کو اس سے کوئی غرض تھی اور نہ اس کی بات کے معنی کو سمجھنا چاہتی تھی یوں بھی جب سے ارمان کا نام

وردہ کے ساتھ لیا جا رہا تھا اسے مزید بڑھ گئی تھی۔

”جواد.....! خولہ کا فون آیا ہے کہ.....“

”ہیں.....! سچ آپی.....!“ جواد ایک دم خوشی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟“ وہ کڑے انداز سے بولی۔

”کیونکہ لڑکوں اور بے نال پیار ہو گیا، ادا دل بے قرار ہو گیا۔ کیوں جواد میاں.....! ہم نے درست کہا

ناں.....؟“ جواد کی بجائے ارمان پھر گانے لگا تو علیزہ ہر تپا سا لگ اُٹھی۔

”سو فیصد درست.....! وہ.....! میرا مطلب ہے آپی.....! کہ.....“

”شٹ آپ.....! خراب صحبت نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے۔“

علیزہ نے ایک قہر آلود نگاہ ارمان پر ڈالی جو ہونٹوں پر شریں مسکراہٹ کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ہونہ.....!“ وہ تیزی سے پلٹی تو راستے میں رکھے فلور کشن سے ٹکرا کر گھوم گئی تو ارمان نے جلدی سے

اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ڈونٹ وری.....! میں تمہیں کبھی گرنے نہیں دوں گا۔“

”ہونہ.....! مجھے اس سہارے کی ضرورت نہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی تو وہ ٹوٹ سا گیا، چہرے پر شام اُتر آئی۔

”ڈونٹ وری.....! آپی کو اسی سہارے کی ضرورت پڑے گی۔“ ہمیشہ کی طرح جواد نے بہن کے لگائے

زخم پر اپنی محبت کا مرہم رکھا۔

”پتہ نہیں یار.....! کبھی کبھی تو ناؤ ڈوبتی نظر آتی ہے۔“

اک کک سی چپکے سے اندر اُتر گئی۔ جواد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”جواد.....! آج رات کہیں اور کا پروگرام نہ رکھنا، آج ہم خولہ کے گھر ڈنر پر جا رہے ہیں۔“ خولہ سے



جا کر لباس تبدیل کر لیں گی۔“

”اوہ.....! ہاں یار.....! کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ یار.....! یہ لڑکیاں بھی کتنا تیار ہو جائیں پھر بھی آپ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔“

وہ علیزہ کو قریب آتا دیکھ کر سیدھا ہو کر بلند آواز میں بولا۔ علیزہ نے نہ تو ارمغان کی ڈرینگ پر دھیان دیا نہ ہی بات پر اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ ڈنر پر سب کو بہت اچھا لگا تھا، نو جوانوں کی اس پارٹی کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے بزرگ پارٹی خود ہی الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ عطیہ خاتون خولہ کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ وہ دلی سے ہنس بول رہی تھی۔ شوخ لباس اور میک اپ میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی تب ہی تو جواد جا ہوا۔ کی گہری نگاہیں بار بار اس کے چہرے پر جا کر ٹھہر رہی تھیں۔ یہ لڑکی تو اسے پہلی ہی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔

”ہوں.....! اچھی ہے.....! بات کروں گا پھپھو سے۔“

ارمغان کو گو کہ اس نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر وہ خود اسی میدان کا کھلاڑی تھا، جواد کی نگاہوں کے فوٹس آتی خولہ کی اہمیت کو سمجھ گیا تھا۔

”جی ضرور.....! کر بھلا ہو بھلا.....!“ جواد نے بھی شوخی سے کہا اور خولہ کو دیکھا جو علیزہ کا ہاتھ پکڑے وہاں سے اٹھ رہی تھی۔

”یہ.....! آپ لوگ کہاں چلیں.....؟“ ارمغان نے علیزہ کے چہرے پر آئے بالوں کو دیکھا۔

”سوری گاڑ.....! میں ذرا علیزہ کو اپنی پیٹنگز دکھانے لے جا رہی ہوں اپنے کمرے میں۔“

”رنگوں کے بغیر تو ڈرائنگ بھی پھیکا ہی لگے گا۔“

ارمغان نے تو اپنے دل کی بات کہی تھی۔ جواد کو لگا جیسے اس نے اس کے دل کی بات کہی ہے اس لیے اس نے ممنون سی نظر ارمغان پر ڈالی۔

”جواد.....! میں ابھی آتی ہوں، تم حیف کو فون کر کے کہہ دو کہ کھانا کھا کر آرام کرے، اس کی طبیعت خراب تھی۔“

جواد کو ہدایات دے کر علیزہ خولہ کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ آج دونوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ ایک دوسرے کی زندگی کی کتاب کو کھول کر رکھ دیا تھا۔

”تو کیا یہ آئی تمہاری ممانہیں.....؟“ علیزہ کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ عطیہ خاتون جن کو وہ خولہ کی ماں سمجھتی تھی، وہ اس کی کیئر فیکر تھیں۔

”کاش کہ عطیہ خاتون میری سگی ممانہیں بٹ اپنی ویز.....! تم بتا رہی تھیں کہ تمہاری ممانہیں.....“ خولہ نے بات ادھوری چھوڑ کر باقی کی کہانی اسے مکمل کرنے کا کہہ دیا تو علیزہ نے شروع سے ساری بات اسے بتادی۔

”نہیں خولہ.....! وہ بالکل بھی اسٹیپ مدر نہیں ہیں۔ شی از سولوٹنگ مدر، انہوں نے کبھی کسی لمحے بھی ہمیں سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ انہوں نے تو ہمارے بابا سے شادی بھی ہماری وجہ سے کی تھی۔ آئی لو ہر سو جج.....!“ علیزہ کو اگرچہ شہلا سے بہت محبت تھی اسے بحیثیت ماں شہلا سے کوئی شکایت نہیں تھی مگر اتنی مہربان ہونے کے باوجود وہ ان کا یہ جرم معاف نہیں کر سکتی تھی کہ ان کی وجہ سے اس کے بابا گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے تب

اب تک وہ بابا کو ترس رہی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ جب تک اس کے بابا دوبارہ زندگی میں لوٹ نہیں آتے تب تک وہ اپنا انتقام جاری رکھے گی۔

”اگر وہ اتنی اچھی ہیں تو تم ان سے چڑتی کیوں ہو.....؟“

خولہ کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ سوتیلی ماں سگی ماں جیسی ہو تو پھر اس سے یہ نفرت، یہ کدورت بے معنی سی تھی۔

”صرف اس لیے خولہ.....! کہ ان کی وجہ سے میرے بابا ہماری زندگی سے چلے گئے۔ اب تک ان کی کوئی ٹر نہیں آئی ہے۔ وہ ہیں یا.....“

علیزہ کی آواز ڈب گئی اور آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ تب خولہ نے اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ درد کے اس موڑ پر دونوں ہم سفر ہو گئیں۔ وہ اپنے بابا کی جدائی میں ٹپ رہی تھی اور وہ خود اپنی ممانہ کی تلاش میں تھی۔

خولہ اور علیزہ کے شوخ اور مشاغل ایک سے تھے۔ زوہا ذرا مختلف گھریلو لڑکی تھی اس لیے کبھی کبھار ہی شریک ہوتی جبکہ نعمان کی ارمغان، جواد کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ انہی دنوں علیزہ کی زندگی میں طلحہ ابراہیم آ گیا، بوڑھا کلاس کا ماڈ اور بے باک نو جوان علیزہ کی طرف بڑھا تو علیزہ نے بھی ہاتھ بڑھانے میں دیر نہ کی۔ طلحہ ابراہیم کے والد بزنس مین تھے۔ ایک عمر امریکہ میں رہے اب ملک سیشنل ہو گئے تو طلحہ ابراہیم نے آتے ہی اپنا پروڈکشن ہاؤس بنالیا تھا اور اسی سلسلے میں وہ علیزہ کے کالج بھی آیا تھا اور وہیں اس کی نظر علیزہ پر پڑی اور چند ہی دنوں میں معمولی تعارف ایک تعلق میں بدل گیا۔

اس روز بھی وہ شام کو خوب تیار ہو کر طلحہ کا انتظار کر رہی تھی کہ اس وقت اس کی گاڑی کا ہارن بجا اور وہ جو بقراری سے اس کا انتظار کر رہی تھی اسی بقراری سے بیک اٹھا کر جانے لگی تو ارمغان اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”تم طلحہ ابراہیم کے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔“

اس کے انداز میں رعب، دھونس، حاکمیت وہ سب کچھ تھا جس سے علیزہ کو چڑ تھی۔

”میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی.....! ہو آریو.....؟“

وہ اسے پرے کرتی آگے بڑھی تو ارمغان نے اس کا ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

”جاننا چاہتی ہو کہ میں کون ہوں.....؟ تو سنو.....!“

● ● ●

”غزین صاحب.....! آفاق صاحب کی حالت اچھی نہیں۔ آپ ان کو باہر کیوں نہیں لے جاتے.....؟“

”اکثر موسیٰ، آفاق صاحب کو چیک کر کے باہر آئے تو غزین چونک کر ان کو دیکھنے لگا۔

”بائی پاس تو پاکستان میں بھی ہو جاتا ہے ڈاکٹر صاحب.....!“

اس کا لہجہ ہر قسم کی فکر سے آزاد اور پرسکون تھا۔ ڈاکٹر نے حیرت سے غزین آفاق کو دیکھا جو کبھی تو اپنے آپ کے لیے جان تک قربان کر رہا ہوتا اور کبھی اتالا پرواہ کر دیکھنے والے حیرت زدہ رہ جاتے۔



بات کر کے علیزہ نے صرف جواد کو بتایا۔

”کمال ہے یار.....! جب ہمارے پاس گاڑی ہے تو ہم ڈنر پر کیوں جائیں خولہ کے گھر.....؟“ ارمان کو علیزہ کو دیکھتے ہی شرارت سوچتی تو وہ خود پر اختیار نہ رکھ پاتا اور کوئی نہ کوئی بات کہہ ہی جاتا۔

”مسٹر ارمان.....! میں آپ سے نہیں اپنے بھائی سے مخاطب ہوں۔“ جاتے جاتے وہ پلٹ کر علیزہ سے بولی تو ارمان خوش ہو گیا۔

”اوہ.....! شکر ہے بھائی ہونے کی سزا جواد ہی کو ملی ہے۔“

”اوہ.....! آپ منہ دھور کیے میں آپ کو اپنی زندگی میں کوئی حیثیت، کوئی رتبہ نہیں دوں گی۔“ اس کے حسین چہرے پر نفرت کے سائے اترنے لگے تو کچھ دیر کے لیے اس کے چہرے کا تناؤ، لہجے کی کڑک لفظوں کی تپش سے ارمان کا سارا وجود سلگنے لگا۔ جواد نے محسوس کر لیا تھا تب ہی اس نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ دبا دیا اس دباؤ میں چھپی محبت، تسلی اور اُمید کی کرن ارمان کے دل کی گلیوں کو روشن کرتی ہوئی اس کے ہونٹوں پر شکر اُبھٹ بن کر آگئی۔

”ارے لڑکی.....! خدا کے غضب سے ڈرو جس دن اللہ نے مجھے تمہاری زندگی میں کوئی حیثیت، کوئی مرتبہ دے دیا ناں تو سوچو کیا ہوگا.....؟“

اب ارمان تو صرف اسی کے حوالے سے کہہ رہا تھا اور وہ نا سمجھ اس بات کو وردہ سے رشتے کے تناظر میں دیکھ کر غصے سے بھر گئی۔

”خبردار.....! خبردار جو آپ نے وردہ کا نام بھی لیا ہو تو.....“

”ہیں.....؟ کیوں.....؟ کیا ہوا.....؟ وردہ کا نام لینے سے زبان پر چھالے نکل آئیں گے کہ کانوں دھواں نکلنے لگے گا.....؟ یار.....! یہ وردہ ہم یا انجن، کیا ہوگی.....؟“

ارمان وردہ کے نام پر اُچھل کر صوفے پر چڑھ گیا اور خوف سے سہم کر کانوں کو چھونے لگا جواد مسکرا کر لگا مگر علیزہ بری طرح تپ گئی۔

”ہونہہ.....! آپ جیسے جو کر کا انتخاب کیا ہے ناں ماما صاحبہ نے وردہ کے لیے آخر کہیں نہ کہیں تو سوتیلے پن کا ثبوت دینا ہی تھا.....؟ لیکن کان کھول کر سن لیجئے آپ.....!“

”ایک منٹ.....! یار جواد.....! یہ لو چابی ذرا میرے کان کا تالا کھول دو۔ یہ محترمہ کچھ سنا نا چاہ رہی ہیں۔“ اسے درمیان میں روک کر ارمان اٹھا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابی اٹھا کر جواد کی طرف اُچھالی تو علیزہ غصے سے پھٹ پڑی۔

”آف.....! میں وردہ کے ساتھ یہ زیادتی ہرگز ہونے نہیں دوں گی۔“ علیزہ کا بس چلتا تو ارمان کا توڑ دیتی۔

”وردہ کو چھوڑیے، اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی، آپ اپنی خیر منائیے۔“ وہ تو دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور دل کی خواہش معنی خیز جملوں کی صورت لیوں پر آ جاتی۔ مگر بچپن سے اب تک وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا تھا۔ علیزہ تو اس سے اس قدر نفرت کرتی تھی کہ بھولے سے بھی اس کے بارے میں سوچنا گویا گناہ سمجھتی تھی مگر

وہ باز کب آتا تھا۔

”ہونہہ.....!“ وہ اس کی گہری نظروں اور باتوں کا مطلب سمجھے بغیر ہونہہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جواب ارمان نے بھی ہونہہ کہا اور اپنی الماری کی طرف مڑا۔

”ویسے ارمان بھیا.....! آپ میری اتنی پیاری آپنی کو بہت تنگ کرتے ہیں۔“

”اور آپ کی اتنی پیاری آپنی جو ہمیں اتنا ذلیل اور بے عزت کرتی ہیں اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے.....؟“

”یہ سب تو ان پر سوٹ کرتا ہے۔“ جواد محبت سے مسکرایا۔

”جی.....! ان پر سوٹ کرتا ہے.....؟ اچھا تو یہ بتائیے رات کے ڈنر کے لیے یہ سوٹ مجھ پر سوٹ کرے گا ناں.....؟“ ارمان سیاہ ڈنر سوٹ نکالے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”جواد کو ارمان بہت پسند بھی تھا اور عزیز بھی اور اپنی ماما کی طرح وہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں بہنوں میں سے کسی ایک کی شادی اس سے ہو جائے۔ تب ہی ارمان نے ایک روز خود ہی علیزہ کے لیے اپنی دیوانگی کا راز کھول دیا تو وہ خوشی سے اس سے لپٹ گیا تھا۔ تب سے وہ ان دونوں کی نوک جھونک سے محفوظ ہوا کرتا تھا۔

علیزہ لاہور این سی اے میں اس لیے بھی آئی تھی کہ اس کا شوق تھا، دوسرا وہ گھر سے دور ہاسٹل میں رہ کر زندگی کو اپنی مرضی اور پسند سے انجوائے کرنا چاہتی تھی مگر ارمان اس سے پہلے لاہور میں موجود تھا پھر جواد بھی اسی انجمن سرنگ پونڈوشی میں آ گیا تو شہلا نے فیصلہ کیا کہ یہ تینوں ایک ساتھ ہی رہیں گے تو ان کو تسلی رہے گی تب انہوں نے ڈیفنس میں واقع کوشی جس میں کرایہ دار تھے، ان سے خالی کرائی تاکہ یہ سب سکون سے وہاں رہیں اور پڑھیں اور یہاں گھر سے، شہر سے اتنی دور علیزہ بہت گھبرا جاتی۔ تب ارمان ہزار نفرتوں کے باوجود اسے مہربان سایہ نظر آتا۔ جواد اس کا چھوٹا بھائی تھا وہ اس کے لیے فکر مند ہوتی تو جواد ارمان کا ہاتھ تھام لیتا۔ احساس کے یہ ننھے منے جگنو اس کے قریب سے گزر جاتے اور کچھ دیر کے لیے سہی ارمان کی اہمیت جتا جاتے۔ اس وقت وہ دونوں تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جبکہ علیزہ ابھی تک برآمد نہیں ہوئی تھی۔

”یار.....! یہ لڑکیاں بھی کتنی غیر مطمئن قوم ہیں، قسم سے پوری میک اپ کٹ مکا کے بھی قرار نہیں آتا تو کسی گمشدہ کی کی تلاش میں گھنٹوں آئینے کی برداشت کا امتحان لیتی رہیں گی اور بھیا تک شکل لے کر آئینے سے پوچھتی رہیں گی کہ بول آئینے بول میں کتنی حسین لگ رہی ہوں۔ اب بیچارا آئینہ منہ چڑھانے کے سوا کیا کر سکتا ہے.....؟ اب ان محترمہ ہی کو لے آؤ، ہمیں تیار ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا اور..... اور.....“

پھر جیسے اس کی نظر پورچ میں داخل ہوتی علیزہ پر ٹھہری گئی جو اس بات سے بے خبر تھی کہ ارمان سیاہ ڈنر سوٹ میں بہت اسٹارٹ لگ رہا ہے۔ وہ بھی سیاہ ستاروں اور موتیوں سے سجے لباس میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ارمان تو پلکیں جھپکنا بھول گیا اور اس حسن اتفاق پر اندر خوشی کے جگنو رقصاں ہو گئے۔

”کیا حسن اتفاق ہے یار جواد.....!“ وہ بے خود سا بولا۔

”ارمان بھائی.....! سیدھے ہو جائیے اور دُعا کیجئے کہ آپنی اس حسن اتفاق پر توجہ نہ فرمائیں ورنہ ابھی



عزیزین میاں! آپ خود ڈاکٹر ہیں، آپ کو خود اندازہ ہونا چاہیے کہ آفاق صاحب صرف ایک پیشہ ور ہیں انہیں اس جہاں کے مریض بھی ہیں اور ان کے لنگو شاید ہی بائی پاس کا آپریشن انورڈ کر سکیں۔" آفاق نے تفصیل پر وہ بے دلی سے ہاتھ اچکا کر بولا۔

"پھر..... پھر ڈاکٹر! بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟ میں تو چاہتا ہوں کہ..... میرا مطلب ہے..... صاحب! آپ ایک بورڈ تشکیل دیں ڈاکٹر زکا جس میں ڈیڈ کی تمام بیماریوں کو ڈسکس کر کے بائی پاس کے لیے کوئی راستہ نکالا جاسکے۔"

عزیزین کے چہرے پر کربناک سائے پھیل گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر بے سدھ پڑے آفاق صاحب کی پیشانی پر پیار کیا۔

"چلے.....! دیکھتے ہیں، ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ دن بدن آفاق صاحب کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا بائی پاس جتنی جلدی ہو جائے ان کے لیے اچھا ہے۔" ڈاکٹر صاحب جاتے جاتے آفاق صاحب کی بی بی اور نبض وغیرہ چیک کر رہے تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے تو عزیزین ایک دم بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! بائی پاس سے صرف دل کی خرابی ہی دور ہو سکتی ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں عزیزین.....! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں.....؟"

"ڈاکٹر صاحب! بیٹا ہے ناں.....! اور انکل کی اتنی کڑی شکل حالت کی وجہ سے ذہنی طور پر بہت اسیٹ ہے۔ یونو.....؟"

اسد جو کسی نا صبح کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا تھا وہ سمجھ گیا تھا کہ اب عزیزین ڈاکٹر سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ اس نے پہلے تو اس کا شاناد باکر مزید کچھ کہنے سے روکا اور ڈاکٹر مڑی کا بیک پکڑ کر باہر نکل گیا۔ عزیزین نے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، طوفان اٹھ رہے تھے اور بیقراری، جنون کی سی کیفیت تو ہر وقت کی تھی جس نے اسے توڑ توڑ دیا تھا اور اس سب کا ذمہ دار یہ شخص تھا۔ آفاق احمد جس سے اسے جتنی محبت تھی اتنی نفرت تھی، اس شخص نے جو اس کا باپ تھا، زندگی خوبصورت انداز میں ایک حسین دلفریب رنگین پینٹنگ کی صورت دکھائی تھی مگر پھر اچانک حقیقت کی سچائی کی پھوار نے اس پینٹنگ کے سارے رنگ مٹا ڈالے اور وہ بن گیا جو نہیں بننا چاہتا تھا۔

"آئی ہیٹ یو ڈیڈ.....! آئی ریٹلی ہیٹ یو.....!" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ان کا ہاتھ زور سے بستر پر چٹا تو نجانے نفرت کی اذیت پہنچی تھی کہ کوئی اور درد اٹھاتا تھا، وہ کراہ کر رہ گئے۔

"عزیزین.....! عزیزین یہ کیا حماقت ہے.....؟ اتنی ہی نفرت ہے تو مر جانے دونوں ان کو.....؟ کیوں ان کی زندگی کے لیے دوا بھی کرتے ہو اور دوا بھی.....؟"

اسد کی اس سے یہی لڑائی رہتی تھی کہ اس نے محبت اور نفرت دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھے ہوئے تھے اسی لیے بیقراری کی کیفیت میں رہتا تھا۔

"کیا.....؟ کیا مر جانے دوں.....؟ تاکہ یہ تو ایک بار مر کر آرام سے قبر میں جا سوں اور میں جوان کی

ہم سے بل بل جتیا مرنے ہوں اس کا حساب کون دے گا.....؟ یہ..... یہ شخص ہی دے گا، اس کو میرے ایک ایک لمحہ کا حساب دینا ہوگا۔ اسد.....! جانتے ہو یہ جتنا تکلیف سے، درد سے ترپتے ہیں ناں مجھے..... قسم سے مجھے بالی ٹوٹی ہوتی ہے اور ایسی خوشی کو کبھی خوشی کہتے ہیں ناں جو کسی کو تکلیف میں دیکھ کر ہوتی ہے.....؟ تو یہ تو یہ بالی ہی میرے ان ڈیڈ کی دی ہوئی ہے۔ دوسروں کی تکلیف، دکھ، درد پر خوش ہونے کا وصف بھی اسی شخص کا دیا ہے۔ یا اسد.....! تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا ہے.....؟"

آفاق صاحب کے دونوں پاؤں چھو کر ان پر سر رکھ کر وہ شدتوں سے روتا رہا۔ اسد نے اسے رونے دیا۔ اس طرح تو غبار نکلے اور فضا نکھر جائے اندر باہر سے۔ اس خوبصورت نوجوان کے سارے دکھ وہ جانتا تھا اور اب جبکہ وہ اپنے زخموں کا، دکھوں کا حساب لینا چاہتا تھا تو وہ انسانیت کا درس جب دیتا تو عزیزین کو اسد سے بھی چڑھنے لگتی۔

"بجش دو، معاف کرو عزیزین.....! معافی کا مرہم دیکھنا انکل کو تو پرسکون کرے گا ہی تمہارے دکھوں کے دل میں چھٹ جائیں گے، انتقام کی آگ بجھ جائے گی تو تم دیکھنا تم بہت پرسکون ہو جاؤ گے، خوش ہو جاؤ گے۔" "شٹ آپ اسد.....! مت دو مجھے معافی تلافی کا درس۔ میں ان کو معاف کر دوں.....؟ یہ ظلم و ستم کر کے اپنے نفس کو خوش کر کے معافی نامہ لے کر خوش بھی ہو جائیں اور سرخرو بھی ہو جائیں اور میں جلتا رہا ہوں، اب بے کفن لاشا اپنے ہی شانوں پر لیے پھرتا رہوں.....؟ تو.....! نیو اسد.....! یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ ان کو اور ہٹا ہے اپنے ایک ایک ظلم کا حساب دینے کے لیے۔ میں ان کے زندہ رہنے کے لیے دوا بھی کروں گا اور ان کی.....! ابھی تو ان کو بہت کچھ دیکھنا ہے، میرے انتقام کا انداز بھی دیکھنا ہے اور ان سے کہہ دو ایک بس ایک بار یہ زبان کھول دیں صرف ایک بار.....! یو ورنہ میں....."

"عزیزین.....! دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....!"

عزیزین پر جنون سوار تھا، اس کا سارا بدن اسے ہی کی خشکی میں بھی سینے میں نہا رہا تھا، چہرے پر چٹانوں کی سی لہریں اور سانس تیز تیز چل رہی تھی، اس نے وحشی پن سے آفاق صاحب کو پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اسد نے اسے روک لیا۔

"سب.....! سب ہی میرے ساتھ ایسا کرتے ہیں تمہیں بھی انہی کی پرواہ ہے، میری کسی کو پرواہ نہیں، میرے سکون کی کسی کو پرواہ نہیں، میں تنگے پاؤں تپتی ریت پر چلتا ہی رہوں گا، چلتا ہی رہوں گا۔ پلیز.....! کم بیک..... کم بیک ڈیڈ.....! ایک بار زبان کھول دیں ڈیڈ.....! میں تھک گیا ہوں، اب مجھ سے اور کس چلا جاتا۔ پلیز ڈیڈ.....!"

عزیزین بے سدھ پڑے آفاق صاحب کے سینے پر سر رکھ کر شدتوں سے روتا رہا پھر اسد زبردستی اسے وہاں سے لے آیا۔

"اور اس روز تم کہہ رہے تھے کہ تم مسعود اور روبی بھابھی کی دعوت کرنا چاہ رہے ہو اس کا کیا ہوا.....؟" اس نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا تو کچھ دیر کے لیے عزیزین چونک کر اسے دیکھنے لگا جیسے کچھ یاد نہ ہو۔ پھر اس دم ہی رنگوں میں جھا ہوا خون رواں ہونے لگا۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش فضا میں چھوڑا تو کچھ دیر کے لیے



اسے لگا کہ اندر کی فضا بالکل صاف ہو گئی ہو۔ آسمان صاف ہو تو پرواز کرنے والوں کو سمت کا تعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور اسے بھی ایک دم ہی راستے نظر آنے لگے تھے۔

”صرف مسعود اور روبی بھابھی کی نہیں جس کی خاطر یہ سب ہو رہا ہے اس کا تو تم نے نام بھی نہیں لیا۔“

نظروں میں معنی خیزی لیے وہ اسد کی طرف گھوما۔

”وہ تو پھر بھی نہیں آئے گی۔“

”ڈونٹ وری.....! وہ آئے گی اور ضرور آئے گی۔ جب اس کے چمن کے چرند پرند دعوت میں شرکت ہوں گے تو وہ کیسے نہیں آئے گی.....؟ اسے آنا ہی پڑے گا۔“ اس کے چہرے کی سختی اس کے لہجے میں در آئی۔

”کیا مطلب.....؟“ اسد اس کی دوستی اور محبت میں بہت آگے نکل گیا تھا اور سو فیصدی اس کو جانا تھا کہ پھر بھی کبھی اس کی باتیں اس کے اوپر سے گزر جاتیں۔ تب ایک عجیب سی مسکراہٹ غزین کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔

”شہر کے فائو اسٹار ہوٹل میں اس کے پورے خاندان کی دعوت ہے اور اس کے انتظامات ہو چکے ہیں اور ان لوگوں کو ان کے شدید انکار کے باوجود اس دعوت میں شرکت کے لیے تیار کر لیا گیا ہے اور اب وہ لوگ مابعد ملت کے حسن اخلاق سے مرعوب ہو کر مقررہ دن اور مقررہ وقت پر پہنچ جائیں گے۔“

غزین نے سارے انتظامات کے بارے میں بتایا تو اسد حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”اور جس کے لیے تم نے یہ محفل سجاا ہے اس کا تو تم نے نام ہی نہیں لیا۔ اسے انوائسٹ کس ہے.....؟“

”اسے انوائسٹ ہم خود بنفس نفیس کرنے جائیں گے پھولوں کی کبھی سجا کر محبتوں کی کلیوں کی مہک ساتھ لینے جائیں گے۔“

نجانے کیا بات تھی کہ کچھ دیر کے لیے غزین کے چہرے پر رنگ بکھر گئے، لہجے میں انجانی سی ملاوٹ آ گئی۔ اسد نے بغور اسے دیکھا۔

”اوہ.....! جیسے وہ عروسی لباس میں تیار ہوگی اور تمہارے بڑھے ہاتھ میں اچھا چٹائی ہاتھ دے کر تمہاری محبت کی کبھی میں سوار ہو جائے گی.....؟ ڈیم اٹ یار.....! نہ تم ایسا کر سکتے ہو اور نہ وہ، دونوں اپنے اپنے نام ایک ڈھیٹ ہو، اول تو کچھ بھی ہو وہ نہیں آئے گی، تم خود انوائسٹ کرو یا کوئی اور، وہ کسی صورت بھی نظر نہیں آئے گی۔“

”اوہ.....! چلو یہ منظر بھی تمہیں دکھا دیں گے، کم آن.....!“

غزین نے آدھا سر گیٹ جوتے تلے مسلا اور گاڑی کے بونٹ سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔

آئینے میں اپنے بال وغیرہ درست کیے اور اسد کو دیکھ کر مسکرایا۔

”کیسا لگ رہا ہوں.....؟“ غزین نے اسد کو دیکھا۔

”زبردست لگ رہے ہو، ویسے ارادہ کہاں کا ہے.....؟“ اسد کچھ کہنے والا تھا مگر پھر اس کا موڈ خراب جانے کے خوف سے اس نے بات بدل دی۔

”کوئے جانا.....!“ غزین وردہ کا تصور کر کے ترنگ میں مسکرایا۔

”اوئے.....! مجھے پھر کھانے کا قطعی شوق نہیں۔ تم جاؤ، مجھے میرے گھر ڈراپ کر دو۔“

”یعنی کہ ثابت کر دیا کہ کہینے ہو.....؟“ غزین نے اسے گھورا اور گاڑی اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی۔

”جی.....! مجبوری ہے، سر پر بال ہی کم ہیں۔“ اسد اترتے ہوئے بولا۔

”بال کم ہوں یا زیادہ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن چلنے کے لیے ٹانگیں دو ہی اچھی، سمجھے.....؟ آئندہ ایسے کہینے پن کا مظاہرہ کیا ناں تو دو دو کی بجائے ایک پر کھڑے رہو گے۔“ غزین غصے میں آ گیا۔

”کیا کروں یار.....! دوست ہوں ناں تو محبوب کے ہاتھوں تجھے جوتے کھاتے نہیں دیکھ سکتا اس لیے نہیں جا رہا۔“ اسد شرارت سے ہنسا۔

”اوہ.....! مگر محبوب کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تو دیکھ سکو گے کہ وہ بھی نہیں.....؟“

”ایسا ہو نہیں سکتا۔“ اسد نے ملتی پرتیل ڈالا۔

”چلو.....! یہ بھی کر کے تمہیں دکھا دیں گے، خدا حافظ.....!“

غزین گاڑی لے اڑا اور اس وقت جبکہ شام کے دُھند لگے بڑھ رہے تھے، تھکی ماندی کرنیں افق کی گود میں آنکھیں موند رہی تھیں، وردہ اور موٹی بیڈنٹن کھیل رہی تھیں، شہلا پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔

”بس آئی.....! اب میں اور نہیں کھیل سکتی، میرا پروگرام آ رہا ہے ٹی وی پر۔“ موٹی ریکٹ درمیان میں پھینک کر لاؤنچ میں جا بیٹھی۔

”یہ لڑکی بھی ناں کبھی بڑی نہیں ہوگی، انٹر میں آگئی ہے اور بچوں کے پروگرام ابھی تک دیکھتی ہے۔“

وردہ نے ریکٹ اٹھایا اور اندر چلی گئی۔

”بیگم صاحب.....! وہ صاحب آئے ہیں۔“

”ارے.....! ارے غزین بیٹا.....! آؤ.....! گیٹ پر کیوں کھڑے ہو.....؟“

چوکیدار کی اطلاع پر شہلا نے پلٹ کر دیکھا تو غزین سامنے ہی کھڑا تھا۔ غزین نے اپنے اخلاق سے وردہ کے سارے خاندان کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور شہلا تو اچھی خاصی فین ہو گئی تھیں۔

”اسلام علیکم آئی.....!“ سعادت مندی میں وہ خود ہی بزرگوں کے سامنے اتنا جھک جایا کرتا کہ بزرگوں کو اس کے سر یا شانے پر پیار سے ہاتھ رکھنا ہی پڑتا۔

”وعلیکم اسلام بیٹا.....! آؤ ناں بیٹھو بلکہ یہاں نہیں، شام ہو گئی ہے ابھی چھپر یلغار کر دیں گے، اندر ہی چلتے ہیں۔“

شہلا پہلے تو لان میں بیٹھنے لگیں پھر اندر کی طرف بڑھ گئیں تو وہ بھی سعادت مندی سے سر جھکائے ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں لائٹ آف کیے وہ ذرا لیٹی ہی تھی کہ لائٹ آن ہونے پر چونک کر اٹھی۔

”ارے وردہ جان.....! دیکھو تو کون آیا ہے.....؟ آؤ ناں غزین.....!“ شہلا جو اندر کی کہانی قطعی نہیں جانتی تھیں ایسے خوش ہو کر اطلاع دے رہی تھیں جیسے غزین وردہ کے لیے کوئی بہت اہمیت رکھتا ہو اور وہ جو کچھ دیر



کے لیے لیٹی تھی، اُلجھے بالوں کے ساتھ دو پندرہ سو کرتی غزین کو گھور رہی تھی جو آج اچانک ان کے گھر تک آگیا تھا۔

”یہ ڈرامے باز اب میرے گھر تک آگیا ہے۔“ وردہ نے انتہائی نفرت اور حقارت سے اسے دیکھا اور اسے یوں اپنے گھر دیکھ کر اس وقت وردہ کو کتنا غصہ آ رہا ہے، غزین اس کی اندرونی حالت کو خود ہی سوچ کر مفلوج ہو رہا تھا اور جب اس نے شہلا کی نظر بچا کر وردہ کو آداب کیا تو اس کا جی چاہا کسی بھی بات کا لحاظ کیے بغیر ایل ٹرے اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارے مگر وہ اب جبکہ اس کا ساتھ ختم ہونے والا تھا اس کی شکایت کر کے کسی ہنگامے یا فسانے کو جنم دینا نہیں چاہتی اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

”وردہ.....! ارے بیٹا.....! ایسے کیا دیکھ رہی ہو حیرت سے.....! ارے یہ غزین ہے۔“

شہلا کو بھی وردہ کا انداز کچھ اچھا نہیں لگا۔ غزین بڑی گہری اور شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور مخالفت کے باوجود اس وقت دل میں اتر رہی تھی۔

”ارے نہیں آئی.....! ڈونٹ وری.....! میں وردہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور یوں بھی بندے کی جب بہت ہی شدید قسم کی خواہش یوں اچانک ہی پوری ہو جاتی ہے تو وہ یوں ہی بے یقینی سے دیکھتا رہتا ہے۔“

”اسلام و علیکم وردہ.....! کیسی ہیں آپ.....؟“ وہ دل اور جان جلانے کے سارے گر جانتا تھا اور اس میں بڑا کامیاب بھی تھا۔ وردہ اس کی بات اور ڈھٹائی پر سلگ سلگ گئی۔

”وعلیکم اسلام.....! تشریف رکھیے۔“ وردہ نے یوں لذت چٹا کر کہا گویا کہہ رہی ہو مر جاؤ۔ شہلا اس کی چائے کے انتظام کے لیے جا چکی تھیں۔

”تشریف.....! اوہ.....! اچھا.....! تشریف رکھوں.....! مگر کہاں.....؟“ وہ اس کی طرف جھکا جان جلا رہا تھا اس کی۔ وردہ بھی کوئی لحاظ رکھنے کی قائل نہیں تھی۔

”آپ کی جگہ تو قدموں میں ہے لیکن ہمارے ہاں مہمان کو صوفے، کرسی پر بیٹھایا جاتا ہے، اتنے بڑے ڈرائنگ روم میں چار صوفے سیٹ ہیں، کسی پہ بھی بیٹھ جائیں۔“

”ارے ڈاکٹر وردہ وجاہت.....! ہم تو دل و نظر میں بسائے جانے کے قابل ہیں، آپ صوفوں کی بات کرتی ہیں.....! اپنی ویز.....! قبل اس کے کہ آپ کی والدہ تشریف لے آئیں آپ یہ بتائیے کہ آپ اس روز پارٹی پر کس کلر کی ڈریسنگ کر رہی ہیں تاکہ ہم بھی میچنگ کا.....“

”شٹ آپ.....! جو ایک لفظ بھی کہا ہو تو۔ مسٹر غزین.....! میں اگر آپ کی بیہودہ حرکتوں اور باتوں پر چپ ہوں تو اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔“

وردہ کا لہجہ دبا ہوا اور دھیمہ ضرور تھا مگر اس کی نظروں کے شعلے غزین کو جھلسا گئے۔ وہ اس کے قریب آگیا اتنا کہ وردہ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

”وہ وجہ میں جانتا ہوں مس وردہ.....! بھلا محبت سے بڑی وجہ کیا ہو سکتی ہے.....؟“ غزین نے پھونک مار کر جو ہم پھینکا تھا وہ اس کی تباہ کاریوں سے بھی واقف تھا۔ وہ ہم وردہ کے دل کے اندر جا کر پھنسا تو قوت برداشت جواب دے گئی۔ شاید غصے اور صدمے نے کچھ دیر کے لیے اس سے قوت گویائی چھین لی۔ وہ اس کا

وردہ جیسے چہرہ نوج لیتا چاہتی تھی مگر ہاتھ ساکت رہے، وہ اسے بہت ذلیل کرنا چاہتی تھی مگر لفظ گو نگے ہو گئے۔ مگر اس کے چہرے پر آئے سپنے سے غزین اس کی اندرونی حالت کو محسوس کر کے مفلوج ہو رہا تھا۔ اسے بہت سکون مل رہا تھا وردہ کی حالت سے۔

”مسٹر غزین.....! کان کھول کر سنو.....! تم سے محبت، ہونہہ.....! تم دنیا کے آخری مرد ہوتے ناں تو اب بھی نہیں.....“ وہ بمشکل یہ لفظ ادا کر پاتی تو وہ ادا سے ہنسا۔

”چلو مان لیتے ہیں، مان لیتے ہیں لیکن تم بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہونا وردہ وجاہت.....! یہ سب معلوم ہے یہ سب میں کس کے لیے کرتا ہوں کیونکہ ان سب باتوں سے تمہیں اذیت ہوتی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ

میری زندگی میں دو انسان ایسے ہیں جن سے میں ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں اور ٹوٹ کر نفرت۔ ان دونوں کو ہی میں نے دیکھا ہے۔“ وہ اس کے قریب ہو کر سرگوشی میں بولا تو وہ خوفزدہ ہو کر ہٹی۔

”دوسری شخصیت تم ہو وردہ وجاہت.....! تم ہو.....!“

غزین نے اپنی مہمان کی حیثیت بھول کر وردہ کو شانوں سے پکڑا تو وہ جھٹکے سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ماما کے آجانے کسی ملازم کے دیکھ لینے کے خوف سے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

”غزین آفاق.....! تم ایک ذہنی مریض ہو۔“ ٹائٹ لاسٹ فرام مائی ہاؤس۔ تم سائیکو کیس ہو جاؤ، اپنا علاج کرو۔“ وہ اپنی اندرونی حالت خوف اور غصے پر قابو پاتی دبی دبی آواز میں بولی تو وہ زہر خندا انداز میں ہنستا ہوا پھر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

”چلو.....! تمہاری بات مان لی ہے کہ میں ذہنی مریض ہوں، تو تم ڈاکٹر کس لیے بن رہی ہو.....؟ ڈکھی انسانیت کی خدمت کے لیے ناں.....؟ ناؤ کم ان.....! تم کرو میرا علاج، مجھ سے شادی کرو، میرا علاج ہو جائے گا۔“

”غزین آفاق.....!“ اب برداشت کے بند ٹوٹے، ہاتھ فضا میں بلند ہوا قریب تھا کہ اس کے وجہ بہرے پر اپنی نازک انگلیوں کے نشان چھوڑنا کہ فضا ہی میں غزین نے اس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔

”مرد پر ہاتھ اٹھانے والی لڑکیاں تمہیں معلوم ہے بزدل ہوتی ہیں ان کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا اگر ہے تو سیدھے طریقے سے پارٹی پر آ جانا۔“ وہ اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے کہہ رہا تھا۔

”میں مرنے کو بھی نہیں آؤں گی۔“

اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کر کے نفرت سے کہا۔

”میں جانتا تھا تم ایسا کہہ ہی نہیں رہیں ایسا کر بھی سکتی ہو اس لیے میں آج آیا ہوں کہ تم اس روز پارٹی میں ضرور آؤ گی، نہیں آؤ گی تو یاد رکھو کیا ہوگا، تمہارا سارا خاندان ہوٹل پہنچے گا اور وہاں غزین آفاق کے نام کی کوئی پارٹی نہیں ہوگی۔ سوچو تب تمہارے خاندان کے اتنے معتبر بزرگ اور بنی سنوری لڑکیاں، شوخ و شنگ لڑکے کتنی

الت اور انس ملت محسوس کریں گے جب ان کو کہا جائے گا کہ غزین آفاق نے کوئی پارٹی نہیں دی۔ سوچو ذرا تب کیا



ہوگا.....؟ اور میں ایسا کر کے رہوں گا، سمجھیں.....؟ اب تم پر ہے، اپنے خاندان والوں کو سبکی سے پہاڑ چپ چاپ چلی آنا۔“

وہ جواب تک سلگ رہی تھی اب ایک دم سر دپڑ گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ غزین ایسا کر گزرے گا اور اس کے خاندان کی انسلٹ اس کی وجہ سے ہو، یہ وہ مرکز بھی ہونے نہیں دے سکتی تھی اور خود غزین نے اس کے خاندان میں جگہ بنائی تھی، اس گھر کے لڑکوں سے اس کی دوستی تھی، اس خاندان کی لڑکیوں کی وہ بہنوں جیسی عزت کرتا تھا۔ تب ہی تو سب اس کے دیوانے تھے اور ایسی ہی بے شماری باتیں سوچ کر وہ اس دعوت میں جانے کو تیار ہو گئی لڑکیاں لڑکے سب بہت خوش تھے، کیا بڑے کیا چھوٹے غزین کی تعریف کر رہے تھے اور کچھ ماؤں نے اسے داماد بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

سب لوگ ہوٹل کے اندر جا چکے تھے، سب سے آخر میں وردہ آئی، شہلا اور مونی تو عفت سے کچھ پہلے بھی چکے تھے اور ریشم پر کھڑے غزین کا دل نبھانے کیوں خوفزدہ سا ہو رہا تھا، کچھ بھی تھا وہ ایک اتنے خاندان کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی انسلٹ کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہی سوچ رہا تھا کہ اگر وردہ نہ آئی تو وہ اپنی بات گنوا بیٹھے گا۔

”غزین.....! وہ نہ بھی آئی تو تم ایسا کچھ نہیں کرو گے کہ ان لوگوں کی انسلٹ ہو۔“ اسد کو غزین نے ساری بات بتادی تھی اور وہ بھی غزین اور وردہ کی عادت کو جانتا تھا۔ دونوں ٹوٹ جانے کے قائل تھے جھکنے کے نہیں اور اسد کو اس وقت ان سب کی فکر ہو رہی تھی اور انہی لوگوں کی عزت وردہ کو گھسیٹ لائی تھی۔ اس نے بے دلی سے گرے کلر کا سوٹ نکالا اور لائٹ سامیک آپ کر کے آگئی اور غزین بھی اسی کلر کے فٹنس سوٹ میں بہت اساتھ لگ رہا تھا۔ اسد نے وردہ کو دیکھا تو غزین کے سینے پر ہلکا سا ہکا جڑ دیا۔

”ہوں.....! تو یہ ہے صورت حال یعنی کہ مجھے کہانی کچھ اور سنائی اور خود ریٹنگ بھی سیم کلر کی گئی ہے۔“ اسد کے پیار بھرے شکوے کی کرنوں کی اوٹ میں غزین نے وردہ کو دیکھا تو دل کچھ عجیب انداز میں دھڑکا۔ جی چاہا اسارا غصہ خفگی، انتقام بھول کر وردہ کو اپنائے اور آج سب کی موجودگی میں اسے پر پوز کر دے۔

”نہیں.....! بخدا.....! یہ محض اتفاق ہے۔ ویسے آج سب کے سامنے میں اس کو پر پوز کر دوں تو غزین کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ اس کی نظریں وردہ پر ہی جمی ہوئی تھیں جو ڈرائیور سے کچھ کہہ کر آ رہی تھی۔

”جناب غزین آفاق صاحب.....! آج اگر آپ کے یہ ارادے ہیں تو مجھے اجازت دیجئے۔ قسم تمہیں پٹا ہوا میں نہیں دیکھ سکتا۔“

”نہیں.....! آج تم یہ منظر بھی دیکھ ہی لیتا۔ وردہ.....! غزین نے وردہ کو آواز دی اور اس کی طرف بڑھا۔ اسد اس کے پیچھے بھاگا۔

● ● ●

”نن..... نن..... نادرہ.....؟ وہ یہاں بھی آگئی.....؟“

شرجیل کی توجہ جان ہی نکل گئی نادرہ کا نام سن کر۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، ٹانگیں کاپنے لگیں۔

”کہیں وہ اندر نہ آ جائے.....؟ میں..... میں دروازہ بند کر لیتا ہوں..... مر جاؤں گا مگر اب نادرہ کے

ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اللہ میاں جی.....! آپ تو بہت پیارے ہیں، آپ میری حفاظت کیجئے پلیز.....! نادرہ کو اندھا اور بہرہ کر دیں تاکہ نہ مجھے دیکھ سکے نہ میری آواز پہچان سکے بلکہ آپ اس کا ذہنی توازن بگاڑ دیجئے تاکہ قصہ ہی ختم ہو۔ پلیز اللہ میاں جی.....! میری حفاظت فرمائیے، میں نہیں جاؤں گا اس کے ساتھ پلیز اللہ میاں جی.....!“

خوفزدہ دھڑکنوں، پسینے اور لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ اس نے کمرے کے تمام دروازے، کھڑکیاں بند کر دیں اور ایک کھڑکی کے پاس پردے کے پیچھے چھپ کر نادرہ کو بددعا میں دیتا رہا کہ وہ اس تک نہ پہنچ پائے۔ اسے جتنی آیات یاد تھیں وہ پڑھ کر خود پر پھونک مارتا رہا اور اسی خوف میں جانے کتنا وقت گزر گیا۔ عرفان کئی بار دروازے پر دستک دے چکے تھے مگر شرجیل کی ساعتوں میں نادرہ کی آواز ہی فٹ ہو چکی تھی کہ کسی دوسرے کی کیسے پہنچ پائی۔

”شرجیل.....! شرجیل میاں.....! دروازہ کھولو بھی.....! میں ہوں عرفان.....! ڈاکٹر عرفان، جن کو تم بھائی کہتے ہو، دروازہ کھولو، دوسرے کی ضرورت نہیں، یہ میرا گھر ہے یہاں تم بالکل محفوظ ہو، دروازہ کھولو۔ کہیں بے ہوش تو نہیں ہو گیا.....؟“ عرفان کو فکر ہونے لگی تھی اس کی خاموشی سے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ شرجیل جو اس کی آواز تو سن رہا تھا مگر پھر یقین دے بیٹنی کے دوسرے صحن میں بھٹک رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا مگر اسے شک ہو رہا تھا کہ کہیں نادرہ ہی تو عرفان بن کر اسے بے وقوف نہیں بنائے۔

”شرجیل.....! بھی یقین کرو میں ہوں عرفان.....! تم نے جواب نہ دیا تو میں خفا ہو جاؤں گا۔“ اس بار عرفان نے ذرا غصے میں کہا تو شرجیل کو یقین ہو گیا۔

”آیا بھائی.....!“

اس نے اٹھ کر خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔

”کمال کرتے ہو شرجیل.....! یہ میرا گھر ہے، یہاں میرے سوا کون آ سکتا ہے.....؟“

”وہ..... وہ بھائی.....! ابھی نادرہ کی آواز آئی تھی۔ کہہ رہی تھی میں نادرہ ہوں۔“

”ہوں.....! سمجھ گیا.....! ابھی عالیہ.....! ذرا نادرہ کو لائیے۔“

کچھ ہی دیر بعد وہاں تیرہ سالہ لڑکی ہاتھ میں جھاڑو لیے آگئی تو عرفان نے اسے دیکھا۔

”کیوں.....؟ یہی وہ نادرہ ہے.....؟“ عرفان نے شرجیل کو دیکھا جس کے چہرے پر خوف کے جو سائے تھے وہ اس نادرہ کو دیکھ کر مٹنے لگے تھے۔

شرجیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پرسکون، بے خوف سا گہرا سانس لیا۔

”دیکھو شرجیل.....! نادرہ صرف وہی تو نہیں، یہ نام کئی لوگوں کا ہو سکتا ہے۔“

پھر عرفان اسے سمجھانے لگے۔ وہ اسے بہت اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے ایک ہی نشست میں اس سے اس کا ماضی حال پوچھ لیا تھا اور اسے اپنا اعتماد دے کر انہوں نے آہستہ آہستہ اس مردانگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ شرجیل نے زندگی میں پہلی بار ماہم کے بعد کسی دوست، ہمدرد کو پایا تھا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔



”ہوں.....! تو یہ ہے صورت حال۔ اب یہ بتاؤ کہ تم ابھی اس کنڈیشن میں اپنے گھر جانا چاہتے ہو یا تبدیل ہو کر۔“

عرفان نے شرجیل کے چہرے پر اڑتے ڈھواں کو دیکھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی، بچپن سے اب تک کے وہ تمام سین نگاہوں میں گھوم گئے جنہوں نے اس سے قدرتی شناخت چھین کر بے یقینی کے صحرا میں دھکیل دیا تھا۔ پاپا کی مار، موبی کی باتیں، ماہم اور ماں کی مظلومیت، وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا مگر عدم اعتماد کی وجہ سے اسے نہیں کر سکتا تھا اور اپنے اندر کی اسی کمزوری کو طاقت میں بدلنا چاہتا تھا، وہ کچھ بن کر لوٹنا چاہتا تھا۔

”میں..... میں چاہتا ہوں بھائی.....! ماما اور ماہم میرے لیے بہت دُکھی ہوں گی اور ہو سکتا ہے کہ مجھے بھی فکر مند ہوں مگر بھائی.....! پچا کہتے تھے کہ میں کسی کام کا نہیں، میں کچھ نہیں کر سکتا اور موبی، وہ تو مجھے انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ بھائی.....! میں..... میں کوئی چیز بن کر جانا چاہتا ہوں، وہ سب موبی سے ماہم کی شادی کرنا چاہتے ہیں، میں نہیں چاہتا کیونکہ ماہم خوش نہیں۔ بھائی.....! میں جب کچھ بن جاؤں گا ناں تو سب میری بات سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی۔ میں اپنی بہن کی ڈھال بننا چاہتا ہوں۔“

وہ بول رہا تھا، عرفان اس کا نفسیاتی تجزیہ کر رہے تھے۔ بات کرتے ہوئے بار بار اس کا حلق اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے، ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا، بولتے بولتے آواز کبھی بلند ہو جاتی، کبھی دب جاتی، کبھی بھاری مردانہ آواز ہو جاتی تو کبھی بالکل زنانہ ہو جاتی۔ عرفان نے اسے بہت اچھی طرح اسٹڈی کر لیا تھا۔

”ہوں.....! گڈ یار.....! تم تو اچھے خاصے ذہین نوجوان ہو۔ کچھ کرنے کی لگن، آگے بڑھنے کا جذبہ، یہ سب تمہارے مردانہ اعتماد کا یقین ہے۔ میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ تم جب گھر لوٹو تو موبی بھی تم سے بات کرنے کے لیے پہلی کئی بار سوچے اور گھروالے تم سے پوچھ کر فیصلہ کریں۔“

”بھائی.....! کیا کہا.....! ایسا ہو سکتا ہے.....؟“ شرجیل نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں.....! کیوں نہیں.....؟ شرجیل.....! تمہیں اللہ تعالیٰ نے مرد پیدا کیا ہے اور مرد کو بہت قوی طاقتور بنایا ہے اور تم میں بھی مردانہ طاقت اور صلاحیت ہے جس کو تم جانتے نہیں۔ خیر اب انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اور پھر عرفان نے شرجیل کو نارمل کرنے کے لیے اسے اعلانیہ طور پر گھر کا فرد بنا لیا تھا اور اس پر چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں بھی ڈالنا شروع کر دی تھیں کہ اس میں اعتماد آئے۔ اس وقت بھی گھر میں ملازم کی موجودگی کے باوجود انہوں نے شرجیل کو اپنے کسی کام سے بھیجا۔ جب وہ کوریڈور سے گزرتا ہوا تیزی سے لاؤنج میں داخل ہوا تو اسے ہادیہ تو نظر آئی مگر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کارپٹ پر سفید کاغذ پھیلانے کیا کر رہی ہے۔ ہادیہ اس سے چڑتی ہے یہ بات وہ بھی جانتا تھا اور اس نے یہ بات بھی عرفان کو بتا دی تھی۔ تب عرفان نے اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے کہا تھا۔

”تم مرد ہو، قوی ہو، تمہیں کسی سے ڈرنا نہیں ہے، کوئی ایک سنائے تم دس سناتا۔“ اور اب تک جو اعتماد حاصل ہو چکا تھا وہ اسی اعتماد کی خوشی میں تیزی سے قدم بڑھاتا جا رہا تھا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا اس کا پاؤں لگنے سے سارے رنگ پانی میں مل کر ہادیہ کے سفید کاغذ پر پھیل گئے اور وہ سر تا پا سلگ اٹھی۔

”آپ.....! آپ اندھے ہیں۔ نظر نہیں آتا بدتمیز آدمی کو۔“

ہادیہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ پہلے تو حسب سابق اسے یوں غصے میں دیکھ کر شرجیل خوفزدہ سا ہو گیا مگر فوراً ہی اعتماد بحال ہوا۔ وہ گھوما، چہرے پر غصہ اور تناؤ تھا جبکہ دل میں جس بات سے پھل جڑیاں پھوٹنے لگی تھیں وہ تھی ”بدتمیز آدمی“۔

بدتمیز کی اسے کیا پرواہ تھی، وہ آدمی کہلایا جا رہا تھا، اس کی قدرتی حیثیت قبول کی جا رہی تھی، وہ خوشی سے مبہوم جھوم گیا۔

”آپ.....! آپ نے مجھے بدتمیز آدمی کہا.....؟“

”آپ نے کیا کہا.....؟“ وہ غصے سے بولا۔

●●●

”ماما.....! آپ نے ردا کے لیے مسز افتخار سے بات تو کر لی ہے ناں.....؟“

”ہاں بیٹا.....! وہ لوگ خود شہرام کو بہت پسند کرتے ہیں مگر جواب میں اتنی تاخیر کچھ سمجھ میں آنی نہیں رہی۔“ ردا شہرام کو تو پہلی ملاقات ہی میں پسند آ گئی تھی۔ اب اس کی پسند سارے گھر والوں کی پسند بن گئی تھی۔ خاص طور پر فاطمہ بیگم کو اس قدر پسند آئی تھی، وہ فوری طور پر اسے گھر لے آنا چاہتی تھیں اور اب انہوں نے باقاعدہ اس کو پرپوز بھی کر دیا تھا مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

”سنی بیٹا.....! تم ذرا مسز افتخار کا نمبر ملاؤ، میں پوچھوں تو.....“

”ماما.....! کیا یہ مناسب رہے گا کہ ہم ہی بار بار پوچھ رہے ہیں.....؟ آخر ہمارے شہرام میں کمی کیا ہے کہ وہ اتنی سوچ بچار سے کام لے رہے ہیں.....؟“

”لیکن کو خود سے دوبارہ فون کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔“

”خدا کا شکر ہے بیٹا.....! ہم لڑکے والے ہیں اور لڑکے والے جتنی بار لڑکی والوں سے پوچھیں ان کی عزت میں کمی نہیں آتی، لڑکی والوں کی عزت افزائی ضرور ہوتی ہے اور بیٹا.....! لڑکی والوں کو زیادہ عزت دینی چاہیے۔ چلو ملاؤ تو نمبر اور پھر میں دونوں گھرانوں کی بڑی ہوں، افتخار خرم کی طرح مجھے ماما کہتا ہے تو پھر کیا اعتراض ہے.....؟ ملاؤ نمبر۔“

فاطمہ کو ردا بے حد پسند تھی اس لیے وہ بار بار تکرار کو بھی مناسب سمجھ رہی تھیں۔ اس وقت شہرام اپنے کمرے سے آیا، بحث کا آخری جملہ اس نے بھی سن لیا تھا، یہ تو براہ راست اس کا معاملہ تھا اور ردا کی طرف سے کسی جواب کا نہ ملنا اس کی انسلیٹ تھی جو وہ بری طرح محسوس کر رہا تھا۔

”دادو.....! آپ ہر گز بھی وہاں فون نہیں کریں گی۔ وہ اترا کس بات پر رہے ہیں.....؟ آپ لوگوں نے اخلاقی طور پر باعزت طریقے سے پرپوز کر دیا، بس کافی ہے اور نہ بھی کر دیں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

شہرام کو ان کی طرف کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔ یہ تو سراسر اس کی انسلیٹ تھی۔

”جی.....! فرق نہیں پڑتا.....؟ رات کو اُداس ہو کر ٹیڑس پر ٹہل رہے تھے اور اُداس گانے گارہے تھے اور پھپھو.....! ان کے والٹ میں ردا کی تصویر بھی.....“



”تم..... تم چپ رہو سنی.....!“ اپنے رازداد اور پھپھو پر فاش ہونے کی ندامت اس کے چہرے اور  
میں کھینچا ہٹ بن کر اتر آئی۔ داد اور لیلیٰ اسے دیکھ کر مسکرائے لگیں۔

”ہوں.....! تو یہ ہے صورت حال۔ دیکھو بیٹا.....! یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں مگر اب اس  
سے دوبارہ پوچھ لینے میں حرج ہی کیا ہے.....؟“

”کہہ دیا ناں پھپھو.....! کوئی وہاں جائے گا نہ ہی فون کرے گا۔“ شہرام بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔  
”اور تمہارا کیا ہوگا.....؟“ لیلیٰ نے پیار سے اس کے بال سنوارے جو پریشان، الجھا ہوا اس وقت بالکل  
خرم کی طرح لگ رہا تھا جنہوں نے خود پر ضبط کر کے اپنی موی کو قربان کر دیا تھا۔

”مم..... میرا کیا ہے پھپھو.....! ٹھیک ہے، رد اپنڈ ضرور ہے مگر مروتوں کا نہیں اس کی محبت میں.....“  
نظریں چرا کر بولا۔

”مرتا کون ہے کسی کی محبت میں بیٹا.....! مگر جیتا بھی نہیں ہے۔“  
لیلیٰ کے اندر درد کا ایک جہان آباد ہو گیا اور اس وقت ابرار آگئے جنہوں نے لیلیٰ کی بات سن لی تھی۔

آہستگی سے چلتے عین لیلیٰ کے مقابل آن کھڑے ہوئے اور ان کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں میں شہباز کا  
عکس دیکھ کر اپنے دل میں اٹھتی کسک کو دبا کر رہ گئے۔

”بالکل درست کہہ رہی ہیں عائشہ.....! کوئی کسی کی محبت میں مرتا نہیں مگر جیتا بھی نہیں۔ اسلام علیکم  
مما.....!“ ابرار چونک کر مڑے اور قاطمہ کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”وعلیکم اسلام بیٹا.....! جیتے رہو، آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے برابر ابرار کو جگہ دی۔  
”جی.....! تو ہمارے بیٹے شہرام کے سرال والوں نے کیا جواب دیا ہے کہ آیا ان کو ہمارا بیٹا اپنی بیٹی کی

غلامی..... میرا مطلب ہے اپنی غلامی میں قبول ہے کہ نہیں.....؟“  
ماحول کی کثافت کو محسوس کرتے ہوئے ابرار نے ایک شیخ سی نظر شہرام پر ڈالی جو سنجیدگی سے سر جھکائے

بیٹھا تھا۔ تب قاطمہ نے ساری بات ان کو بتادی۔  
”ارے یار.....! کتنے لگی ہو کہ سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری خوشیوں کے لیے کتنے لوگ

پریشان ہیں۔ ہم نے تو خود ہی اپنی جنگ لڑی اور ہار گئے۔“  
اک ٹیس لفظوں میں ڈھلی تو نظریں لیلیٰ پر ٹھہر گئیں۔ لیلیٰ نے اک نظر ان پر ڈالی اور آگے بڑھ گئیں اور پھر

قبل اس کے کہ وہ لوگ فون کرتے، شام کو مسز افتخار کا فون آگیا کہ ان کو اس رشتے سے کوئی انکار نہیں۔ تاخیر کی وجہ  
انہوں نے اپنے کچھ رشتے داروں کی خفگی بتائی اور پھر دونوں گھرانوں میں بڑی دھوم دھام سے منگنی کی تیاری

ہونے لگی۔ قاطمہ سب سے زیادہ خوش تھیں۔ شادی جتنا اہتمام تو انہوں نے منگنی پر کر ڈالا۔ شہرام بے حد خوش  
تھا۔ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”خدا تمہیں ہمیشہ اسی طرح خوش رکھے بیٹا.....!“  
ابرار نے شہرام کو ساتھ لگا کر پیار کیا۔

”محبت مل جائے، دل جو چاہے وہ حاصل ہو جائے، خوابوں کی تعبیر مل جائے تو شاید ایسے ہی لوگ خوشی کی

لوگوں میں کرن بن جاتے ہیں، آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

زندگی بھر کی نامرادی کی گہری شام اتر آئی تھی ابرار کے چہرے پر۔ آج تو لیلیٰ کے سارے زخم بھی ہرے  
”گئے تھے۔ ماضی کی یاد ایک نیزے کی انی بن کر دل تڑپ میں اتر رہی تھی۔ شہباز تو اب اک درد تھا، کسک تھا،

الو تھا جو لیلیٰ کی آنکھ میں ٹھہر گیا تھا۔ اس کی بیٹی جو ماں کی گود سے بن نام کے چھین لی گئی، اس کا نام اس نے خود  
لی جو یہ یہ رکھ دیا تھا اور اسی نام کی ٹیس دل میں اٹھتی تو وہ تڑپ تڑپ جاتیں۔ آج جبکہ سب بچے اس عمر میں پہنچ

گئے تھے کہ وہ اپنی اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کر رہے تھے تو ان کی اپنی بیٹی لخت جگر جس کو ابھی انہوں نے ڈھنگ  
سے محسوس بھی نہیں کیا تھا اور چھین لی گئی تھی، آج بڑی شدتوں سے یاد آ رہی تھی۔

”مما.....! اگر آج جو یہ یہ میرے پاس ہوتی تو..... تو شہرام کی منگنی میں اس کے ساتھ کرتی۔ ہے ناں  
مما.....!“ وہ سسک پڑیں۔

”کاش.....! ایسا ہوتا بیٹا.....! مگر اس ظالم انسان نے نجانے بیٹی کو کیا کہہ کر بہلا دیا ہوگا.....؟ دل چھوٹا  
مت کرو، انشاء اللہ جو یہ یہ ضرور آئے گی۔“

ہمیشہ کی طرح مایوسی کے اندھیریوں میں ڈوبتی لیلیٰ کو ماں آس کا دیا تھا دیتیں۔  
منگنی ہو گئی تھی۔ دونوں خاندان بہت خوش تھے سوائے ردا کے جو اس خوشی کو پا کر بھی اُداس تھی۔ اس کے

حسن پر اک پر سوزی کیفیت تھی جسے سب نے ہی محسوس کیا تھا۔ اس وقت بھی ردا تھک کر اپنے کمرے میں لپٹی  
ہوئی تھی کہ فون کی اطلاع ملی۔

”آؤ جانی.....! بات کر لو۔ بری بات ہے ایک انسان اتنی دُور سے فون کرے اور.....“  
مسز افتخار نے آگے بڑھ کر اسے پیار سے کہا۔

”مما.....! جب میں نے کہہ دیا ناں کہ مجھے ان سے بات نہیں کرنی تو آپ مجھے مجبور کیوں کر رہی  
ہیں.....؟ کہہ دیجئے مجھے بات نہیں کرنی ان سے۔“

وہ سختی سے کہہ کر واپس روم میں گھس گئی۔  
♦ ♦ ♦



صاحب کے ساتھ جاگلی۔

”اطلاع یہ ہے کہ ابھی خرم کا فون آیا تھا، کہہ رہا تھا آج ڈنران کے ہاں کرنا ہے۔“

”ارے.....! مگر ابھی تک ٹیلر میرے کپڑے تو دے کر گیا ہی نہیں اور پہلی ان..... اوہ.....!“ ردا جو یہ خبر سن کر بہت خوش ہو گئی تھی ایک دم بے ساختہ بولی تو وہ دونوں مسکرا دیئے اور جب ردا ان کی مسکراہٹ کا مطلب بھی تو بری طرح جھینپ گئی۔

”مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔“ وہ چہرے کی سرخی چھپا کر باہر بھاگ گئی۔

”خدا کا صد شکر اور احسان کہ ہماری بیٹی اس رشتے پر خوش بھی ہے اور مطمئن بھی اور والدین کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے.....؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں افتخار.....! ماشاء اللہ ردا واقعی بے حد خوش ہے، اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ ویسے افکار.....! میں بھی کبھی پریشان ہو جاتی ہوں کہ جب.....“

”ایسی بات نہیں ہے بیگم.....! وہ لوگ پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں۔ ضرور انڈر اسٹینڈ کریں گے۔“

• • •

”نہیں یار.....! آج نہیں۔“ شہرام نے دائیں بائیں دیکھا سنی اور لیلیٰ ڈنر کی تیاریاں کرتی نظر آ رہی تھیں۔

”تم بھی کمال کرتے ہو شہرام.....! یہ سارا پروگرام تمہارا ہی تھا، اب تم منع کر رہے ہو.....؟“ رضوان کو سخت تاؤ آ گیا اس کی بات پر۔

”سمجھا کر ناں یار.....! آج وہ لوگ ہمارے ساتھ ڈنر کریں گے ہمارے گھر میں۔“

سنی اور لیلیٰ کے خوف سے اس نے دبی دبی آواز میں کہا مگر رضوان کے جواب نے دونوں کو متوجہ کر دیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟ کیا تم نے کھانا بنانا ہے یا ان کو نوالے بنانا کرکھلانے ہیں.....؟ ارے

بھئی.....! سب گھر والے ہیں ناں یہ لوگ ان کو انٹرٹین بھی کریں گے اور کھانا بھی کھلا دیں گے۔ یو ڈونٹ وری اوکے.....!“

”ویسے رضوان میاں.....! یہ تمہاری زیادتی ہے کہ آج اسے ساتھ لے جا رہے ہو۔“ سنی اور لیلیٰ بھی ان کے قریب آ گئیں تو شہرام منہ بنا کر بیٹھ گیا۔

”اور رضوان بھائی.....! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے بھیا نے نوالے بنانا کرکھلانے ہیں اپنے سرال والوں کو۔“

”سنی کی بچی.....! تم..... تم چپ ہو جاؤ۔“ شہرام نے سنی کو جھٹک دیا۔

”پھپھو.....! ہمارا ایک دوست امریکہ جا رہا ہے اور اسی نے پروگرام بنایا تھا کہ اس کو فیروں پارٹی دیں گے اور اب جبکہ سارے انتظامات ہو گئے ہیں تو منع کر رہا ہے۔“

”اوہو بھئی.....! یہ معاملہ ہے تو شہرام میاں.....! آپ کو دوستوں کی محفل اٹینڈ کرنی چاہیے، سرال والے تو آتے ہی رہیں گے۔“ خرم نے رضوان کا جملہ سن لیا تو آگے بڑھنے کی بجائے ان کی طرف آگے تو شہرام

”ردا بیٹا.....! خوشی ہو، غم ہو یا زندگی، کوئی بھی پر اہم یا احساس ہو اس کی اپنی ایک الگ کہانی ہوتی، داستان ہوتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی ہم خود اس کا محرک ہوتے ہیں۔ تمہاری یہ ناراضگی بجا کی مگر.....“

”اگر میں درست ہوں تو پھر یہ مگر کیوں ماما.....! مجھے ان کی کسی مجبوری کی داستان سے کوئی غرض نہیں بس.....“

اس نے مسز افتخار کے ہاتھ جھٹک دیئے تو درد کا ایک گہرا احساس ان کے اندر تک سرایت کر گیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا.....! جیسے تمہاری مرضی.....!“ وہ ٹھکی ہوئی سی، بوجھل بوجھل سی دایسی کے لیے بیٹھ گیا۔

چونک کر مڑی۔

”ماما.....! آپ مجھ سے خفا ہو رہی ہیں ان کی وجہ سے.....؟ اگر آپ مجھ سے ان کی وجہ سے خفا ہیں تو جانیے میں آپ سے نہیں بولوں گی۔“ وہ مڑی تو تھی کہ ان کو منانے کی مگر خود روٹھ کر بیٹھ گئی تو مسز افتخار کو اس شدت سے پیار آ گیا۔

”خفگی نفرت کی تو وجہ ہو سکتی ہے مگر محبت بے وجہ ہوتی ہے۔ خود روٹیل کی طرح جنم لینے والی مگر یہ باتیں تم کہاں سمجھو گی.....؟ تمہیں کیا خبر جب ان کا فون آتا ہے میں اور افتخار کتنا ڈسٹرب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا گھر اور دل خالی محسوس ہونے لگتا ہے۔“

مسز افتخار کی آواز بھگ گئی تو ردا نے ان کی پیشانی پر پیار کر لیا۔

”اور اسی لیے بار بار دھکیل دیتے ہیں آپ مجھے ان کی طرف۔“

”میری جان.....! مجبوری ہے۔“

”ارے بھئی.....! ماں بیٹی باہر بھی آئیں گی کہ اندر ہی راز و نیاز ہوتے رہیں گے.....؟“ افتخار صاحب اندر آ گئے۔

”ارے نہیں بھئی.....! ایسی بات نہیں۔“ مسز افتخار مسکرائیں تو ردا نے خفگی سے ان کو دیکھا اور افتخار



جھینپ گیا۔

”وہیں جا رہا ہوں پاپا.....! یہ سب تو بے کار میں بولے جا رہے ہیں۔“

شہرام جل ہی تو گیا تھا رضوان کی ضد پر۔ دونوں لڑتے ہوئے نکل گئے۔

ردا خوب تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کی متلاشی نظروں کو دیکھ کر سنی اور لیلیٰ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔

”کسے تلاش کر رہی ہیں بھابھی جان.....!“ سنی نے اس کے قریب آ کر کہا تو وہ اچھل پڑی۔

”کک..... کچھ نہیں، میں تو بس دیکھ رہی تھی۔ سیٹنگ چیچ کی ہے آپ لوگوں نے.....؟“ ردا نے لیلیٰ کی بات بتائی۔

دل میں شہرام پر شدید تاؤ آ رہا تھا، رات بھر اس کے کان کھاتا رہا کہ تم ضرور آنا اور اب موصوف غائب تھے۔

”جی نہیں.....! ہماری سیٹنگ تو عرصہ دراز سے ایسی ہی چلی آ رہی ہے۔ ہاں.....! اب نئی بہ چاہیے۔“

تبدیل کر لے۔“ لیلیٰ نے پیار سے اسے دیکھا اور کچن میں چلی گئیں۔

”ہاں.....! تو اب بتاؤ ناں ذرا وہ تمہارے بھائی صاحب کہاں ہیں.....؟ ساری رات میرے کان کھاتے رہے۔ یوں تیار ہو کر آنا، یہ بات کریں گے، وہ بات کریں گے اور خود جناب آنے سے پہلے ہی غائب ہو چکے ہیں۔“ وہ دونوں شروع ہو گئی تھیں۔

”توبہ.....! بتاؤں گی میں بھائی کو۔“ سنی نے کانوں کو چھوا تو وہ بھی کھسیانی سی ہو گئی۔

ردا کو شہرام تو پسند آیا ہی تھا ان کے گھر والے بھی بہت اچھے لگے تھے اور اپنی اکلوتی پیاری تندر تو اسے شہرام کی طرح عزیز ہو گئی تھی۔ دوسرا دادا اسے بے حد اچھی لگتی تھیں۔ ایک عجیب سے پیار کا گہرا احساس تھا ان انداز میں۔

”ارے بھئی.....! تندر بھادج کی باتیں ختم ہو گئی ہوں تو جاؤ کھانا لگ گیا ہے۔“ لیلیٰ کی اطلاع پر دونوں ڈانگ روم میں آ گئیں۔

”ماشاء اللہ.....! ماشاء اللہ کتنی محبت ہے تندر بھابھی میں۔“ فاطمہ نے دونوں کی نظر اتاری۔

”بس ماما.....! دُعا کریں تندر بھابھی کا پیار یونہی رہے۔ یہ نہ ہوشادی ہوتے ہی ایک دوسرے کے ہال کھینچ کھینچ کر لے کر رہی ہوں۔“ خرم نے پیار سے بیٹی اور بہو کو دیکھا جو جھینپ رہی تھیں۔

”نہیں خرم.....! ہمیں اپنی بیٹی پر اللہ کی مہربانی سے پورا اعتماد ہے کہ یہ بہت اچھی اور بہترین بہو اور بھابھی ثابت ہوگی۔ ہماری بیٹی تو بالکل بھی لڑا کا نہیں ہے۔“

سزا افتخار نے ممتا بھری نظروں سے ردا کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکان تھی۔

”کاش بھابھی.....! ہم بھی اپنی بیٹی کے لیے ایسی ہی رائے دے سکتے مگر ہماری سنی تو.....“

”پاپا.....! پلیز دادو.....! دیکھئے ناں پاپا کو میری برائیاں کر رہے ہیں۔“ وہ روٹھ گئی۔

”جائے میں کسی سے نہیں بولتی اور نہ کھانا کھاؤں گی۔“ وہ ایک تو تھی ہی ابھی کم سن، دوسرا گھر بھر کی محبت اور توجہ میں کبھی کبھی مذاق کو بھی سنجیدہ لے لیتی تھی۔

”ہیں.....؟ واقعی بھئی.....! اب چونکہ ہماری بیٹی سنجیدہ کھانا نہیں کھا رہی اس لیے اب کھانے کے ختم“

جانے کا خطرہ نہیں رہا۔ لہذا اب ہم آرام سے سکون سے کھانا کھائیں گے۔“

”خرم.....! سدھر جاؤ تم.....! میری سنی سب سے اچھی اور پیاری بیٹی ہے اور تم سب اس سے لڑتے ہو، وہ کسی سے نہیں لڑتی اور میری لیلیٰ کی طرح میری سنجیدہ بھی بہت، بہت اچھی اور پیار کرنے والی تندر ثابت ہوگی انشاء اللہ۔“ فاطمہ نے سنی کو بلا کر پیار کیا۔

”میڈم.....! اب آئیے تاکہ کھانا شروع کیا جائے۔“ خرم نے باقاعدہ منایا تو اس نے خرم کے ہاتھ کا نوالہ منہ میں ڈالا اور کھانے میں شریک ہو گئی۔

”خرم.....! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ کھانے کے بعد افتخار خرم کے ساتھ لان میں آ بیٹھے تو خرم حیرت سے ان کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ بات معمولی نہیں۔

”خیریت افتخار.....! ایسی کیا بات ہے کہ جس نے تمہیں اس حد تک سنجیدہ کر دیا ہے.....؟“ خرم نے پاپا کے کپڑے لیے بغیر واپس رکھ دیا تو افتخار نے گویا نظریں چرائیں۔

”اگر نہ سمجھا جائے تو کوئی خاص بات نہیں اور اگر سمجھ لیا جائے محسوس کر لیا جائے تو بہت بڑی بات ہے۔“

افتخار اپنی بات کے لیے میدان صاف کر رہے تھے۔ چہرے پر سوچ کا الجھاؤ تھا، ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں بری طرح جکڑی ہوئی تھیں جو ان کے ذہنی خلفشار کی غماز تھیں۔

”افتخار.....! کیا بات ہے.....؟ کیوں پریشان ہو.....؟“

”ایسا کیوں ہوتا ہے خرم.....! کہ کبھی کبھی ہم خطا وار بھی نہیں ہوتے پھر بھی ہم سزا سے خوفزدہ ہوتے ہیں.....؟ کیوں.....؟“

افتخار برادر راست کہنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہے تھے اور ان کا انداز، باتیں خرم کو کسی انجانی، انہونی بات سے پریشان کر رہی تھیں۔

”کم آن افتخار.....! ایسی کیا بات ہے کہ تم اپنے اتنے اچھے دوست کے سامنے کہنے سے خوف زدہ ہو.....؟ پلیز.....! مجھ پر اعتماد کرو۔“

”ڈرتا ہوں خرم.....! نئے رشتوں کے نئے بندھنوں کی وجہ سے نازک ڈور کہیں ٹوٹ نہ جائے۔“ افتخار کے لہجے میں بھی الجھاؤ تھا۔

”رشتوں کی بنیاد اگر خلوص اور نیک نیتی پر رکھی جائے تو وہ رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے نہ ہی ان کی ڈور اتنی نازک ہوتی ہے کہ ذرا سی بات سے ٹوٹ جائے۔ تم کہو کیا بات ہے.....؟ اب تو میں ہر حال میں جانتا چاہتا ہوں کہ کیا بات ہے.....؟“

”ٹھیک ہے خرم.....! تو پھر یہ بات ابھی صرف خود تک رکھنا، میرا مطلب ہے یہ بات ابھی خواتین کے کانوں تک نہیں جانی چاہیے کیونکہ خواتین کی سماعتیں کچی اور ظرف کمزور ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے بچوں کی خوشیاں داد پر لگ جائیں، ہمارا بویا ہمارے بچوں کو کاٹنا پڑے جبکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ردا بہت خوش ہے، وہ صرف شہرام ہی کو نہیں سب کو بہت چاہتی ہے۔ اگر رازداری کا وعدہ کرو تو کہوں.....؟“

اتنی دیر میں افتخار نے محسوس کر لیا تھا کہ خرم پر صرف اعتماد نہیں مکمل اعتماد کیا جاسکتا ہے۔



”تمہارے اعتماد کی کسوٹی پر پورا اترنے کے لیے جان کے علاوہ مجھے کیا پیش کرنا ہوگا۔“ خرم نے  
افتخار کے شانے پر پر اعتماد کا دباؤ ڈالا۔  
”خرم.....! ڈرتا ہوں بلکہ اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوں کہ کمان سے تیر نکالنے سے پہلے مجھے سب کا  
کر لینا چاہیے تھا۔“

”اُف یار.....! میں تمہارے فلسفے سے تنگ آ گیا ہوں۔ اگر اتنی بنجیدگی سے مذاق کر رہے ہو تو تم  
اسے اور اگر واقعی کوئی بات ہے تو اس سنس کو ختم کرو کیونکہ اب مجھے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔“ خرم خاصا سنجیدہ  
گئے۔ تب افتخار نے کہنا شروع کیا۔  
”خرم.....! اگر میں یہ کہوں کہ یہ لڑکی ردا جس کو تمہارا بیٹا بہت چاہتا ہے اور تم سب نے جس لڑکی کو  
چاہتوں سے اپنایا ہے، جس کو ماما آج بیاہ کر اپنے گھر لانا چاہتی ہیں اگر یہ..... یہ لڑکی میری اپنی سگی بیٹی نہ  
تو.....؟“

ایک دو تین، حیرت کے سارے پہاڑ اس وقت خرم کے اوپر آگرے تھے۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ ردا  
افتخار کی بیٹی نہ ہو۔ دونوں میاں بیوی کی جس بیٹی میں جان ہو، اس کی رگوں میں ان کا خون نہ ہو، لے پالک ہو۔  
”شٹ اپ یار.....! ڈونٹ بی جو کنگ.....!“ خرم دھیرے سے بنے مگر یہ ہنسی بھی خوفزدہ سی تھی۔  
”آئی ایم ناٹ جو کنگ خرم.....! ردا واقعی میری بیٹی نہیں۔“ افتخار نے ایک گہرا سانس چھوڑ کر پھر  
چاند کو دیکھا۔

”پھر.....؟ کس کی بیٹی ہے.....؟“ خرم نے خود کو کئی کہانی سننے کے لیے تیار کر لیا تھا اور افتخار نے  
سنانے کے لیے۔

”ہم لوگ اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے کہ ایک دم اچانک ہی اللہ کا کرم ہو گیا اور ہمیں والدین بننے کی  
خوشخبری ملی۔ ہمارے ہاں پہلی اور آخری اولاد ہوئی اور ہوتے ہی ختم بھی ہو گئی۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ ایسے  
والدین کو جن کو شادی کے پندرہ سال بعد اولاد جیسی نعمت مل رہی ہو اور ابھی جبکہ وہ لمبے محسوس نہ کر سکے ہوں تو  
ایسے والدین سے وہ نعمت چھٹ جائے تو وہ کتنے پاگل ہوں گے، اس صدمے سے تم محسوس کر سکتے ہو۔ تمہاری  
بھابھی تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں تھیں کہ ان کا بچہ پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے، اس کی جان  
کے لالے پڑ گئے تو انہی دنوں ہمارے ایک اسٹنٹ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی، یہ لڑکی ردا اس مہربان انسان  
اپنا نام دیے بغیر، بیٹی کو سینے سے لگائے بغیر ہماری جھولی میں ڈال دیا تو تمہاری بھابھی پھر زندگی کی طرف لوٹ  
آئیں، پھر ہم نے اسے اپنی اکلوتی اولاد سمجھ کر پالا لیکن ہم نے ان دونوں میاں بیوی کا احسان فراموش نہیں کیا۔  
ردا سمجھ دار ہوئی تو ساری حقیقت اسے بتادی چونکہ وہ بہت نیک والدین کی اولاد ہے اس نے بھی سب کچھ جاننے  
ہوئے ہمیں والدین والا پیار اور مان دیا لیکن اپنے اصلی والدین سے بری طرح خفا ہے کہ انہوں نے اسے خود  
سے جدا کیوں کیا۔ بہر حال یہ اس کی بچکانہ شکایت ہے جو اس کے والدین پاکستان آ کر ڈور کر دیں گے۔  
خرم.....! یہ تمہی وہ بات جس نے مجھے اتنے دن تک کرب میں رکھا تو اب جو تم کو کہنا ہے کہہ ڈالو میں سب کچھ  
کو تیار ہوں۔“

اپنی بات کہہ کر افتخار نے ڈرتے ڈرتے خرم کو دیکھا جس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے، ماتھے  
پر تیریاں ابھرائی تھیں، غصے کے تاثرات سے نتھنے پھولنے لگے تھے۔ افتخار کا سانس کچھ دیر کے لیے رکا۔  
”کک..... کچھ تو کہو خرم.....!“ انہوں نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا تو خرم ایک دم غصے سے ان کی طرف  
گھوڑے۔

”تم نے کہنے کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے.....؟ ارے.....! تم نے تو دوست بن کر پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔  
کیا سمجھ کر تم نے مجھے اور میرے معصوم بیٹے اور گھر والوں کو دھوکا دیا ہے.....؟ میں کیا جانوں لڑکی کون ہے.....؟  
کس خاندان کی ہے.....؟ اچھے خاندان کی یا برے خاندان کی.....؟ اور تم نے کتنی چالاکی کا ثبوت دیا ہے کہ  
سب کچھ ہو گیا اور حقیقت کو اب بے نقاب کیا ہے.....؟ لیکن خیر.....! خدا کا شکر ہے کہ نکاح نہیں ہوا ورنہ مجھے  
شاید ہر کا پیالہ پینا پڑ جاتا۔ افتخار.....! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، تم نے بہت بہت برا کیا ہے مجھ سے جھوٹ  
بول کر۔ بہر حال میں ابھی اور اسی وقت شہرام کی منگنی توڑتا ہوں۔“

”خرم.....! خرم پلیز.....! دیکھو اس میں ردا کا کیا قصور ہے.....؟ اور دیکھا جائے تو میرا بھی کیا قصور  
ہے.....؟ میں نے ردا کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالا ہے، اتنا عرصہ تو ہمیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ اسے ہم نے جنم نہیں دیا۔  
پلیز.....! ایسا مت کرو۔ یہ..... یہ منگنی مت توڑو۔“

افتخار کی آنکھیں بھیگ گئیں تو خرم نے ان کو سامنے لگا کر سمجھنا لیا اور زور سے ہنسنے لگے کہ کچھ دیر کے لیے  
افتخار کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں خرم کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ صدمہ تو اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایسا حادثہ ہوتا۔  
”بس کرو یار.....! مجھے خوف آنے لگا ہے تم سے۔“ افتخار گھبرا گئے۔

”کم آن یار.....! یہ بھی کوئی بات تھی کہ تم نے اتنا بڑا ڈرامہ کر ڈالا.....؟ ویسے تم بہت اچھے رائٹر  
بن سکتے ہو، کیا لفظوں سے کھیلا ہے تم نے، کتنے خوبصورت طریقے سے اپنے احساسات و جذبات کو بیان کیا۔ سچ  
یار.....! میں تو قائل ہو گیا ہوں۔ حد ہو گئی، بھلا یہ بھی کوئی بات تھی.....؟ ردا تمہاری اپنی بیٹی ہے یا نہیں، ہمیں کیا  
فرق پڑتا ہے.....؟ ارے.....! ہم تو تمہارے احسان مند ہیں کہ تمہارے ویسے سے اللہ ہمیں اتنی اچھی پیاری  
بیٹی دے رہا ہے اور تم تو یوں کر رہے تھے جیسے خدا انخواستہ ردا کوئی.....؟“

”شکر ہے یار.....! تم نے تو اپنی جاندارا یکنگ سے میری جان ہی نکال دی تھی۔ تم نے اگر مجھے اچھا  
رائٹر مان لیا ہے تو میں نے تمہیں ایک اچھا ایکٹر مان لیا ہے۔ اُف.....! کیا حقیقت سے قریب تر اداکاری کی ہے  
تم نے۔“ پھر دونوں کتنی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

”ویسے خرم.....! تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر گھر کی خواتین کو خاص کر ماما کو یہ بات پتہ چلے گی تو نجانے ان  
کا کیاری ایکشن ہو.....؟“

”کم آن افتخار.....! ماما میری ماما ہیں، میری طرح ان کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور میرے خیال میں  
اعتراض کی بات ہے بھی نہیں۔ ویسے میں داد دیتا ہوں ردا کے والدین کو کہ وہ مولود بیٹی کو اٹھا کر بھابھی کی گود میں  
بھر دے، ایسے عظیم لوگوں سے تو ملنا چاہیے یار.....!“ خرم کو واقعی ان انجانے لوگوں پر پیارا آ گیا جن کا اتنا بڑا دل  
تھا کہ جگر گوشہ ہی اٹھا کر دوسرے کے حوالے کر دیا۔



”خرم.....! ان میاں بیوی کا تو جواب نہیں۔ اتنے اچھے، اتنے مہربان انسان دوست لوگ میں زندگی میں نہیں دیکھے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ردا کو ساری عمر پتہ نہ چلے کہ اس کے والدین آپ کو ہم لوگ ہیں مگر ہم نے ردا کو دوسری شخصیت بن جانے کے خیال سے شروع ہی سے بتا دیا تھا مگر وہ اپنے والدین سے ناراض ہے کہ شاید انہوں نے اس کے عوض ہم سے کچھ حاصل کیا ہے جبکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر ردا کے اس وہم کو تقویت یوں ملی کہ جب ہم کینیڈا سے پاکستان شفٹ ہو رہے تھے تو میں نے اپنا سارا وہاں کا بزنس اپنے اس اسٹنٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ اب وہ لوگ اس سے بات بھی کرنا چاہیں تو نہیں کرتی۔“ افتخار صاحب نے ساری بات تفصیل سے بتادی۔

”اوہو.....! یہ تو پھر ان بچپان بچپانوں کے ساتھ زیادتی ہو گئی۔ چلو ردا کو ہمارے گھر آنے دو میں اسے سمجھاؤں گا۔ ویسے ردا کے اور بھی بہن بھائی ہیں کہ نہیں؟“

”ہاں.....! ہیں مگر ردا ان کی پہلی اولاد تھی اور اتفاق سے کئی سال تک ان کے ہاں جب دوسری اولاد نہیں ہوئی تو ہم نے ردا کو لوٹانا چاہا مگر ان لوگوں نے کہہ دیا کہ یہ اب آپ کی بیٹی ہے اور آپ کو یہی مبارک ہو۔ بہت کم لوگوں میں اتنا حوصلہ اور ظرف ہوتا ہے۔“

”زبردست یار.....! میں تو حیران ہوں کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو اپنے جگر کا ٹکڑا کسی کو یوں سونپ دیں۔ میرا دل تو ان لوگوں سے ملنے کو چاہ رہا ہے۔ شادی پر تو آئیں گے ناں؟“ خرم ان لوگوں سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔

”ہاں.....! کیوں نہیں؟ وہ آئیں گے، اب ان کا پروگرام بھی پاکستان میں شفٹ ہونے کا بن رہا ہے، دیکھو کب تک آتے ہیں.....؟ دراصل ردا کے دونوں چھوٹے بھائی پڑھ رہے ہیں، ان کی تعلیم مکمل ہوئے ہیں وہ لوگ پاکستان شفٹ ہو جائیں گے۔ ویسے گھر آؤ گے ناں تو تصویریں دکھاؤں گا ردا کے والدین اور بھائیوں کی بلکہ ردا کو میرے خیال میں گاڑی میں ایک چھوٹا الیم پڑا ہے۔ ردا دوستوں کو دکھانے لگی تھی، میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“ اور پھر خرم وہیں بیٹھے انتظار کرنے لگے تو افتخار ایک الجھ لے کر آ گئے۔

”ارے بھئی.....! یہاں کیا نظر آئے گا.....؟ اب ہم بوڑھے ہو گئے ہیں مگرے میں آ جاؤ وہیں دیکھتے ہیں۔“ خرم ان کو لیے اپنے کمرے میں آ گئے۔

”یہ تصویر ہے ان دونوں میاں بیوی کی۔ اختر اور مومنہ اختر یعنی مومی بھابی۔“

”کیا.....؟ یہ..... یہ مومی.....؟“

● ● ●

”سوری.....! وہ میں نے آپ کو بدتمیز کہا، سوری.....!“ ہادیہ خوفزدہ ہو گئی کیونکہ شرجیل کے لیے اس کے بھائی کی بہت خاص قسم کی ہدایات تھیں اور وہ غصے میں اسے بدتمیز آدمی کہہ گئی تھی اور اس کے فرشتوں تک کو خبر نہیں تھی کہ شرجیل کو غصہ نہیں ناقابل یقین خوشی تھی۔ وہ اسے جب جب لڑکایا آدمی کہتی وہ یوں خوش ہوتا جیسے گمشدہ خزانوں کا راز مل گیا ہو۔

”آپ سوری کیوں کہہ رہی ہیں.....؟ بھلا آدمی کہنے پر ایک آدمی غصہ کیوں کرے گا.....؟“ خوشی کی

لڑوں سے اس کا پورا وجود روشن ہوا جا رہا تھا، آنکھوں کے نیچے دیے روشن ہو گئے تھے۔

”نہیں.....! میں نے آپ کو بدتمیز آدمی کہا ہے ناں۔ اس کے لیے سوری.....!“ وہ اب بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔

”جہیں کسی سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں، کوئی ایک سنائے تم دس باتیں سنا دینا۔“ عرفان کا جملہ اس کی سماعتوں میں گونجا تو اسے لگا جیسے یہ جملہ اس کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ وہ بڑے اعتماد سے چہرے پر تالا کر کر رہا تھا رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ہادیہ کو ایک کی دس سنانے جا رہا تھا۔

”اب کچھ میری بھی سن لیں۔ آپ نے مجھے ایک سنائی ہے اب میں دس سناؤں گا۔ ذرا گنتی رہے گا۔ نمبر ایک آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں.....؟ نمبر دو آپ بالکل اچھی آرٹسٹ نہیں ہیں، نمبر تین یہ کون سی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر آپ رنگوں سے کھیل رہی ہیں.....؟ نمبر چار آپ کو پنسل پکڑنی نہیں آتی چلی ہیں آرٹسٹ بننے، نمبر پانچ اپنا چہرہ

ہادیہ بھی آئینے میں ملاحظہ کر لیجئے گا بالکل رنگوں میں ڈوبی بندر یا لگ رہی ہیں جیسے کوئی..... نمبر چھ.....“

”نمبر چھ یہ کہ آپ صرف بدتمیز بلکہ فضول آدمی ہیں۔ آپ ہوتے کون ہیں مجھے ایک کی دس سنانے والے.....؟ میں نے کبھی کسی کی ایک نہیں سنی اور آپ مجھے دس سنانے آئے ہیں.....؟ چلے جائیے یہاں سے، گٹ لاسٹ.....؟“

ہادیہ بھی بڑی تنک مزاج تھی، مگر بھر میں چھوٹی اور لاڈلی تھی، اس نے کب کبھی کسی کی سنی تھی جو اس کی سنی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ چھوٹی سے چھڑپ ایک بھٹکے ہوئے نوجوان کی منزل کی طرف راہ نمائی کر رہی ہے۔

شرجیل کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب تک بیہوش تھا اب ہوش میں آ رہا ہو۔

”ارے.....! تو بتاتے رہیں، بھائی کا ٹوکام ہی یہ ہے مگر میں نے آپ کو بھائی نہیں بنایا، سمجھے آپ.....؟ اور مجھ سے بات بھی ذرا سنبھل کر کیا کیجئے۔“

”آپ بھی سمجھ لیجئے، میں صرف عرفان بھائی کا بھائی ہوں اور اپنی ماہم کا بھائی ہوں۔ آپ کا تو ہرگز بھی بھائی نہیں بنوں گا، سمجھ لیں ناں آپ.....؟“

وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا کہہ رہا تھا۔ ابھی فی الحال وہ اپنی بات کی گہرائی کو خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس کو تو یہ خوشی ہو رہی تھی کہ اس نے ایک کی دس سنا دی تھیں اور ماہم کے علاوہ بھی وہ کسی لڑکی سے بات کر سکتا ہے مگر ہادیہ ان ساری باتوں کو کہاں سمجھ رہی تھی۔ اس نے رنگوں والا باؤل اٹھایا جس میں پانی میں رنگ گھول رکھے تھے اٹھا کر شرجیل کے سر پر انڈیل دیا۔

”جی.....! بالکل سمجھ گئی۔“ پردے کی اوٹ میں کھڑے عرفان اس منظر کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ان کو خوشی ہو رہی تھی کہ شرجیل اپنی بیچان، اپنی شناخت کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اب تو کافی حد تک اس میں اعتماد آ گیا تھا، بے یقینی کے بھنور سے باہر آ رہا تھا اور عرفان اسے ایسے مواقع فراہم کر رہے تھے تاکہ اس کا اعتماد بحال ہو۔ وہ



چاہتے تھے کہ شرجیل جب اپنی دنیا میں، اپنے رشتوں کے آگن میں دوبارہ اترے تو ایک بھرپور، پراثر اور  
کر، جہاں نہ کوئی فیسب اسے گڑیا کہہ سکے اور نہ کوئی اسے تنگ کر سکے۔ اس وقت بھی جبکہ شرجیل ہادیہ سے الگ  
آ رہا تھا، عرفان نے اسے پاس بلایا۔

”شرجیل.....! میرا خیال ہے کہ اب تم اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دو۔“

”کیوں شروع کر دوں.....؟ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں نالائق ہوں.....؟ ناکارہ ہوں.....؟ مجھے اس کی  
تک نہیں آتی تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ عرفان بھائی.....! میں..... میں بہت اچھا پڑھتا تھا اور پڑھ سکتا ہوں  
حتیٰ کہ میں آپ کی بنائی ہوئی دوائیوں کی پرچی بھی پڑھ سکتا ہوں، آپ سمجھ رہے ہیں میں نالائق ہوں.....؟  
ہرگز نہیں ہے۔“

شرجیل جو ابھی ہادیہ سے اُلجھ کر آیا تھا اور ایک کی دس سنانے کے بعد جو اسے اعتماد حاصل ہوا تھا، اس کی اس  
نے عرفان کے سامنے بھی استعمال کر ڈالا تو انہوں نے حیرت سے منہ میں اُلٹی دبائے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے  
دیکھا اور شرجیل، اس کے بدن کی شریانوں میں خون گرم ہو کر تیزی سے دوڑنے لگا تھا، قوت اور اعتماد کی روانی  
نے اندر تک اُجالے پھیلا دیے تھے، اس کا چہرہ سرخ اور ماتھے کی رگیں پھول گئی تھیں، ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش  
تھی جو کہ اس کی بہت زیادہ خوشی اور اعتماد کی قوت کو ہضم نہ کر سکنے کی غمازی کر رہی تھیں۔ عرفان حیرت اور غمی  
سے اسے دیکھتے رہے۔

”شرجیل میاں.....! حیرت ہے یہ سب کیا تھا.....؟“ عرفان کو اندر کہیں خوشی بھی ہو رہی تھی کہ شرجیل  
نارملٹی کی طرف آ رہا تھا اور یہ اس کا پہلا پریقین قدم تھا۔

”جی.....! کک..... کک..... کچھ نہیں، آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ ایک کی دس سنانا تو.....“

”اوہو.....! تو یہ بات ہے.....! ہماری بلی ہمیں ہی سے میاؤں.....؟“

”سوری.....! سوری.....! اور یہ سوری بھائی.....! اوہ میں ناں تھوڑا سا اور ہو گیا تھا لیکن آپ سوچ سکتے  
ہیں کہ میں کس قدر خوش ہوں، میرا دل چاہتا ہے میں بہت جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں اور اپنے گھر چلا جاؤں۔ اگر کیا  
مجھے رنجش کر بھی دیں تو میں اپنی ماما اور بہن کے ساتھ رہ سکتا ہوں، جاب کر سکتا ہوں اور ان کو اپنے ساتھ رکھ  
سکتا ہوں۔ سچ بھائی.....! پپا نے ماما کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے، مامی میں روہ روہ کرتی تھیں، پپا سے ہر  
وقت ہر بات پر ڈرا کرتی تھیں، ماما کوئی غلط کام بھی نہیں کرتی تھیں مگر پپا پھر بھی ان کو بہت برا سلوک کرتے تھے۔  
اب..... اب بھائی.....! میں کچھ بن کر اپنی ماما اور بہن کو خوشیاں دینا چاہتا ہوں، ایسا ہو سکتا ہے ناں.....؟“

عرفان نے نوٹ کیا کہ اب شرجیل روانی سے بولنے لگا تھا۔ وہ پہلے والا تو تلاپن نہیں رہا تھا نہ ہی آواز  
کے زیر و بم میں تبدیلی آتی تھی۔ اس کے اندر کے خوف کے سائے مٹ رہے تھے۔ وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس  
کرنے لگا تھا۔ عرفان اس تبدیلی پر بے حد خوش تھے۔

”کیوں نہیں.....؟ ایسا ہو سکتا۔ ارے شرجیل میاں.....! ایسا ہو چکا ہے۔ تم ایک نارمل اور بھرپور مرد ہو، تم  
میں ایک اچھے نارمل مرد کی ساری خصوصیات ہیں، تم پر اب کوئی بھی ذمہ داری ڈالی جائے تم اسے پورا کر سکتے ہو۔  
اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ اب تم یونیورسٹی میں داخلہ لے لو اور اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر کے اب اپنی عملی زندگی کی

انداز کرو۔“

عرفان کہہ رہے تھے اور شرجیل بہت محبت اور متاثر کن نظروں سے ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر ایک دم ان  
کے گلے لگ گیا۔

”سوری.....! سوری عرفان بھائی.....! میں نے آپ سے بدتمیزی کی، سوری.....!“

اس کا لہجہ ملتتی ہو گیا۔ اپنی غلطی کا شدید احساس اس کے لہجے کو بھگو گیا۔ جب وہ عرفان کے گلے لگا تو ان کو  
محسوس ہوا جیسے اس میں پہلے والی علامات ظاہر ہونے لگی ہیں۔ انہوں نے جھٹکے سے اسے الگ کر دیا۔

”کم آن شرجیل.....! میں تو تمہیں اس کا رٹا ہے پر، اس پر اعتماد کو شش پر انعام دینے والا تھا کہ تم نے  
میری لاج رکھ لی۔ اس طرح گڑگڑا کر، معافی مانگ کر تم نے مجھے مایوس کیا ہے، تمہیں کیا پتہ تمہاری اس حرکت  
سے میں کتنا خوش ہوا ہوں کہ مجھے ناجیز کی کوشش کو اللہ نے قبول فرمایا اور تم نارملٹی کی طرف لوٹ آئے۔ جاؤ تم  
نے میری خوشی بچاری کو بے موت مار ڈالا۔“

عرفان مصروفی کے ساتھ چہرہ موڑ کر کھڑے ہو گئے تو اس بار شرجیل محبت اور اعتماد سے ان کے گلے  
لگ گیا۔

”سوری.....! آئندہ شرجیل میں آپ کو یہ کمزوریاں نظر نہیں آئیں گی۔“

”ؤن.....؟“ عرفان پلٹے۔

”ؤن.....! شرجیل پر جوش انداز میں بولا۔ اسی وقت عرفان کے بیٹے گیند اور بیٹ لے کر آ گئے۔

”شرجی انکل.....! آئیے ہم کرکٹ کھیلیں۔“ نومی پوی اسے دیکھ رہے تھے اور کرکٹ کے نام پر بیٹ  
بال دیکھ کر مامی کی ایک تلخ یاد پورے جسم میں چھوٹ نکلی بن کر بجنے لگی، ناگوں اور ہاتھوں میں لرزنا طاری ہوا،  
پیشانی عرق آلود ہوئی۔ عرفان بنور اس کا جائزہ لیتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ بچوں کے سوال کا وہ کیا  
جواب دیتا ہے۔

”شرجیل انکل.....! چلے ناں.....؟ ہوا بھی چل رہی ہے اور ہوا میں گیند موو کرتی اور.....“ نومی نے اس  
کا ہاتھ پکڑا تو وہ سرد ہو رہا تھا۔

”ارے انکل.....! اتنی سردی تو نہیں ہے پھر آپ کے ہاتھ ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں.....؟“ عرفان  
سمجھ رہے تھے۔ وہ اس کے کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھ رہے تھے، آنکھوں میں مامی کی تلخ یاد کڑی دھوپ بن کر  
اتری ہوئی تھی۔

”ارے.....! کس کو کرکٹ کھیلنے کا کہہ رہے ہو.....؟ کرکٹ ہم لڑکوں کا کھیل ہے ان لڑکیوں کا  
نہیں.....؟ کیوں بے بی.....؟“ موبی کی کبھی ہوئی بات تیر کی طرح دل میں اتر گئی۔

”کرکٹ تو لڑکوں کا کھیل ہوتا ہے ناں.....؟“ وہ جیسے خود سے بولا۔

”جی ہاں.....! تو پھر آئیے ناں ہم کھیلیں۔ اسی لیے تو میں نے پچھو سے نہیں کہا کہ کرکٹ لڑکوں کا کھیل  
ہے لڑکیوں کا نہیں۔“

”لیکن بیٹا.....! تمہارے انکل لڑکے تو نہیں۔“ عرفان نے جان بوجھ کر کہا تو شرجیل چونک کر برقی انداز



الہام میں کھڑا تھا، بچے ڈر گئے۔

”شرجیل اٹکل.....! بھاگ چلیں پھپھو آرہی ہیں۔“

”ارے.....! کیوں بھاگ جائیں.....؟ ہم لوگ ڈرپوک ہیں.....؟ ڈرتے ہیں آپ کی پھپھو.....؟ آتی ہیں تو آنے دو، دیکھتے ہیں کیا باگڑتی ہیں وہ ہمارا.....؟“ ہادیہ غصے میں جلتی بھنتی قریب آرہی تھی، لڑکے خوفزدہ ہو رہے تھے۔

”اٹکل.....! اب کیا ہوگا.....؟ وہ تو سر پر آکھڑی ہوئیں۔“

”ارے یار.....! مرد ہو، مرد بنو، مرد کبھی کسی مصیبت سے ڈر نہیں کرتے۔ بی بی یار کم آن.....!“

”یہ..... یہ شارٹ کس کا تھا.....؟“ ہادیہ نے براہ راست شرجیل کو گھورا مگر پوچھا تینوں سے۔ نوی پوی شرجیل کو دیکھنے لگے۔

”میں پوچھ رہی ہوں یہ حرکت کس کی ہے.....؟“ ہادیہ نے دانت پیسے۔

”میری.....!“ شرجیل اس کے غصے سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

”آپ کو معلوم ہے میری کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے.....؟ اگر میرے سر پر بال لگتی تو.....“ غصے سے ہادیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹ پکڑ کر شرجیل کی دھناتی کر دے جو اس وقت ہلکی سی شریر مسکراہٹ کے ساتھ شرجیل کی نظروں سے اسے دیکھتا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”ارے.....! جہاں کچھ تھا اس کا نقصان ہوا یعنی کھڑکی میں شیشہ تھا ٹوٹ گیا اور اگر گیند آپ کے سر پر لگتی تو آئی ایم شیور کہ آپ کے سر کا کوئی نقصان نہ ہوتا، کیوں بچوں.....!“ وہ بچوں کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا تو ہادیہ غصے سے ان کو گھورتی آگے بڑھ گئی تو شرجیل کے اندر کہیں یقین کا اور اعتماد کا ایک اور دیا روشن ہو گیا۔

ہادیہ سے اس کی ٹوک جھونک چلتی رہتی۔ عرفان اور عالیہ بھا بھی نے اسے بہت اعتماد دیا تھا۔ بچے اس کے ساتھ لگے رہتے، وہ زندگی میں ہونے والی نئی نئی تبدیلیوں کے احساس کے ساتھ بے حد خوش تھا، اسے اپنے گرد روشنی کا میلہ نظر آتا مگر اک کبک ملاں بن کر سائے کی صورت آتی اور گزر جاتی۔ ماما ہم اور پاپا ہر بل یاد آتے مگر اس نے اب خود پر ضبط کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا ایک مضبوط اور مکمل نارمل مرد کی حیثیت سے اپنے گھر، ماما ہم اور ماما کا مضبوط سائبان بن کر لوٹے گا۔ وہ تو اب تک اپنی ماما کو مظلوم ہی سمجھ رہا تھا۔ وہ کیا جانے کہ اس کی جدائی کی آگ نے پتھر جیسے باپ کو پگھلا دیا تھا۔ اب صرف وہ ان کی زندگی کی کمی تھی مگر ان سب کے ارے میں سوچتا تو دل چل جاتا کہ کسی طرح ان سے جا ملے۔ اسے سب سے زیادہ ماما کا خیال آتا جو اس سے کہنی ہو کر بھی اس کی ڈھال بنی رہی۔ اب خود نہ جانے کن حالات کا شکار تھی۔

”کہیں موبی اور اس کی.....؟ نہیں.....! اللہ میاں جی.....! یہ نہیں ہونا چاہیے۔ موبی بہت غلط آدمی ہے۔ میری معصوم بہن کو اس سے بچائیے گا۔“ نماز کے بعد وہ باقاعدہ ماما کے لیے دعا کرتا۔

اب تو وہ یونیورسٹی جانے لگا تھا۔ اب اس نے خود کو بہت مین ٹین کر لیا۔ اچھی پرسٹلٹی تو اللہ نے اس کو دی تھی اب عرفان اور عالیہ بھا بھی کی ڈانٹ پر اس نے اپنا خیال رکھنا شروع کیا تو وہ کھڑکھڑا کر سامنے آیا۔ اس روز وہ اپنے پینٹ شرٹ میں بہت اسارٹ لگ رہا تھا۔

میں عرفان کی طرف گھوما۔ اندر یک دم آنندھیاں چلنے لگیں۔ قریب تھا کہ وہ اس آنندھی میں اڑ جاتا، بے نام نشان ہو کر پھر بے یقینی کی دلدل میں اتر جاتا۔ عرفان نے مضبوطی سے اس کو تھام لیا۔

”بھئی.....! آپ کے شرجیل اٹکل لڑکے نہیں آدمی ہیں، اس لیے کہہ رہے ہیں۔“ عرفان کا جملہ پتھر پتھر گیا جس کو تھام کر وہ یقین کے ساحل تک آ گیا، یہ جملہ ایک کرن بن گیا جس نے تاریکی کو نگل لیا، ایک کلی بن گیا جواب کھل کر پھول بن گئی تھی خوشی کا۔

”نہیں ابو.....! اٹکل بہت بڑے آدمی تھوڑی ہیں آپ کی طرح، آپ بڑے آدمی ہیں اٹکل تو ہم تھوڑے سے بڑے لڑکے ہیں، ہیں ناں شرجی اٹکل.....!“

یہ باتیں، لفظوں کے یہ معنی جگنو بن کر ناچنے لگے تھے شرجیل کے اطراف میں۔ وہ ایک بار پھر مضبوط ہونے لگا تھا۔

”ہاں.....! اور نہیں تو کیا، میں ابھی لڑکا ہوں، آدمی تو یہ خود ہیں اور آدمی تو بوڑھے ہوتے ہیں ناں بچہ.....!“ شرجیل کا اعتماد لوٹ رہا تھا۔

”اوکے.....! یہ بات ہے کہ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں اور آپ لوگ جوان مرد ہیں تینوں.....؟ تو چلو مقابلہ کر لیتے ہیں..... میں اور پوی سا بھی، شرجیل اور نوی سا بھی.....! اب بتاؤ.....! پہلے بیٹنگ کون کرے گا ہم یا آپ لوگ.....؟“

عرفان نے گیند فضا میں اچھالی تو شرجیل نے کچھ کر لی۔

”ناس کر لیتے ہیں۔“

”میرے پاس کوئین ہے۔ یہ لیجئے شرجیل اٹکل.....!“

نوی نے جھٹ اپنی جینز کی جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر شرجیل کے ہاتھ پر رکھا۔ شرجیل نے عرفان کو آفر دی تو انہوں نے ناس کیا اور بیٹنگ عرفان اور پوی کی نکلی۔ پھر سب نے خوب کھیلا، کرکٹ شرجیل کا فیورٹ کھیل تھا، وہ بچپن ہی سے فاسٹ باؤلر بننا چاہتا تھا مگر حالات کی گرد نے ہر خوشی، ہر خواہش کو نوچ ڈالا تھا۔ وہ جب بھی کسی میدان میں اترتا نئے جوش اور ولولے اور اپنی پوری دل پاؤں کے ساتھ اترتا مگر سب سے پہلے اس کی خواہش، اعتماد اور خوشی کے پر کاٹنے والا اس کا اپنا باپ ہوتا پھر دوسرے لوگ۔ اس کے پر اس حد تک کٹ چکے ہوتے کہ وہ پرواز کے قابل ہی نہیں رہتا اور جب اس نے جوانی میں بیٹ بال پکڑا تو موبی نے اتنا مذاق اڑایا، اتنی بار اسے بی بی کہا کہ موبی کی بی بی اس کے دل و دماغ میں پھنس گئی، اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگی مگر آج وہ ہر قسم کے خوف کی قید سے آزاد ہو گیا تھا اور خوب کھیل رہا تھا۔ وہ جب باؤلنگ کر رہا ہوتا تو عرفان کو شدید افسوس ہوتا کہ اتنا باصلاحیت نو جوان حالات کی چنگی میں پھنس گیا۔

”صاحب.....! آپ کے دوست آئے ہیں۔“ ملازم کی اطلاع پر عرفان میدان چھوڑ گئے۔ بچے بھی تھک گئے تھے مگر شرجیل کا دل چاہ رہا تھا کہ کھیلا رہے اور بچوں کو گھمانے لے جانے کا وعدہ کر کے وہ کھیلا رہا، خوب کھیلا۔ اس بار جو اس نے مکمل کر شٹ مارا تو گیند ہادیہ کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ چور کرتی عین ہادیہ کے قدموں میں جا گری۔ وہ چل کر اٹھی کہ نوی پوی کی کھنچائی کرے گی مگر وہاں شرجیل بیٹ پر ہاتھ رکھے پر اعتماد



عالیہ بھابی کی بے ساختہ تعریف پر اپنی کتاب میں بظاہر غرق ہادیہ نے اسے دیکھا تو لاشعوری طور پر شرجیل بھی اسے ہی دیکھنے لگا تو جانے کیوں! اک انجان سا، بے نام سا لطیف احساس چھو کر گزر گیا اور وہ زبردستی مسکرایا۔ متاثر ہو کر بھی ہادیہ نے نخوت سے منہ بنایا اور کتاب سامنے کر لی۔

”ماشاء اللہ بھئی.....! نظر اُتار دو ہمارے بھائی کی..... چلو! شرجیل.....! مغرب کی نماز پڑھا آئیں۔“

”تو چلے پھر.....!“ شرجیل نے کن انکھیوں سے ہادیہ کو دیکھا اور جاتے جاتے جان بوجھ کر ہادیہ کی طرف سے گزرا اور جاتے جاتے ذرا سا جھک کر اس کے چہرے پر رکھی کتاب کھسکا تا ہوا آگے بڑھ گیا اور اب وہ لگتا تملارہی ہوگی، کس طرح چیزیں بیخ رہی ہوگی، یہ تصور ہی اسے محفوظ کر رہا تھا۔ آج کل وہ بہت خوش اور مطمئن نظر آنے لگا تھا اسے لگتا تھا اس کی تلاش ختم ہو گئی ہے جس کے لیے وہ ہر نماز میں گڑگڑا کر اللہ کا شکر ادا کرتا رہا تھا اور عرفان کا جس قدر ممنون ہو سکتا ہوتا۔ اس روز اس کو ماہم بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی ماہم جس طرح اس کا دل اور دوسرے لڑکوں کی طرح دیکھنا چاہتی تھی وہ بالکل ویسا ہی بن گیا تو اس کا دل چاہا کہ ماہم سے چپکے بات کرے وہ فون کے قریب آ گیا۔ دھڑکتے دل اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے اتنے عرصے میں پہلی بار کمر نمبر ملایا بہت عجیب سی حالت ہو رہی تھی اس کی۔

”ہیلو.....!“ دوسری طرف موبی ہی تھا غصے سے شرجیل سلگ اٹھا تاہم خود پر ضبط کر کے بڑے مضبوط اور پراعتماد لہجے میں بولا۔

”جی.....! مجھے ماہم واضح سے بات کرنی ہے۔“

”جی آپ کون.....؟“ موبی کے فرشتے بھی اس کی آواز پہچان نہیں سکتے تھے۔

”میں بھی ہوں کوئی..... آپ ان کو بلا دیں۔“ اک لمبے شرجیل کے دل میں اٹھی۔

”کوئی کا کوئی نام بھی ہوگا کہ نہیں.....؟“ موبی اپنی انہی بدتمیزی کے ساتھ بولا۔

”آپ کا نام سے کیا کام.....؟ میری بات کرو ایسے ماہم سے..... شرجیل غصے میں آ گیا۔

”جب تک آپ اپنا مکمل تعارف نہیں کرائیں گے میں ماہم سے بات نہیں کراؤں گا۔“

”کیوں.....؟ آپ ماہم کے بھائی صاحب ہیں جو اتنی جرح کر رہے ہیں.....؟“

”میں تو اس کا کزن ہوں تو کیا آپ اس کے بھائی ہیں کہ.....“

”جی ہاں.....! ہوں.....!“

● ● ●

”علیزہ.....! اُف.....! تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو اور وہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں.....!“

ہائے.....! آئی ایم طلحہ ابراہیم.....! اینڈ یو.....؟“

چیونگم چپاتا ہوا، انگلی پر گاڑی کی چابی لہراتا ہوا طلحہ ابراہیم آگے بڑھا اور مغان نے علیزہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور خشکیوں سے طلحہ کو گھورنے لگا جو عجیب و غریب لباس اور حلیے میں اپنی کلاس اور شخصیت اور سوچ کا اظہار بنا چیونگم چپاتا ہوا اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اور مغان نے ایک نظر اس پر اس کے بڑھے ہاتھ پر اور دوسری

ہاتھ کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تو طلحہ شانے اُچکا کر رہ گیا پھر اپنے کمرے کی گلاس والے سے اور مغان نے دیکھا طلحہ علیزہ کا ہاتھ پکڑے بے تکلفی سے باہر نکل رہا ہے وہ کھول کر رہ گیا جو اب بھی کہیں باہر گیا ہوا تھا اس نے لمبے میں قیمتی گلدان اٹھا کر دیوار سے دے مارا۔

”ہووازی ہی.....؟“ گاڑی میں بیٹھتے ہی طلحہ نے اور مغان کے بارے میں پوچھا تو علیزہ کی تیوریوں میں مل آ گئے ہونٹ سکڑ گئے۔

”ہونہہ.....! ہی از مائی کزن اور مغان۔“ اس کا نام بھی علیزہ نے یوں لیا جیسے کڑوا بادام چبا رہی ہو۔

”ویری ال میزڈ سا لگ رہا تھا۔ اپنی دین آج تو تم غضب ڈھا رہی ہو۔“ جس بے باکی سے طلحہ کی نگاہوں نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا اسی طرح بے باکی سے اس کی بائیں بھی اس کے گرد پھیلنے لگیں۔ علیزہ کسمسا کر دُور ہٹ گئی۔

”طلحہ.....! پلیز مجھے باؤنڈریز کر اس کرنا قطعی پسند نہیں اس لیے بی کیئر فل نیسٹ ٹائم.....! علیزہ کے چہرے کی ناگواری اس کے لہجے میں در آئی تو طلحہ بدتمیزی سے چیونگم کا بڑا سا نبل بنا کر اس کی ناک سے ٹکرا کر پھوڑتا ہوا بے باکی سے ہنسا۔

”امیزنگ.....! تم اور خولہ فاسٹ فرینڈز ہو مگر خولہ کو یہ سب برا نہیں لگتا پھر تمہیں کیوں.....؟“

”خولہ کی اپنی حدود ہیں، میری اپنی ہیں اور میں اپنی حدود کسی کو کراس کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔“

علیزہ کو یہ سب باتیں بری لگ رہی تھیں۔

”کم آن علیزہ.....! کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟ دوستی میں باؤنڈریز کہاں ہوتی ہیں.....؟“ طلحہ نے اس کے بالوں کو پیچھے کرنا چاہا، وہ جھٹکے سے دُور ہٹ گئی۔

”ہر تعلق، ہر رشتے کی سمیٹیشن ہوتی ہیں طلحہ ابراہیم.....! سمیٹیشن کر اس کرنے والا تعلق اور دوستیاں گناہ اور تباہی کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔“

اس کی سوچ کی چنگلی سختی بن کر اس کے چہرے پر اتر آئی۔ طلحہ چونک گیا۔ اس نے ایک اسٹیک بار کے سامنے گاڑی روک دی اور اسٹیکرنگ پر بازو جمائے اب وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”علیزہ.....! آج تو تم پہلے والی علیزہ لگ ہی نہیں رہی ہو، بہت ہی پرانی سی ٹیڈ کل سی لڑکی لگ رہی ہو۔“

لگتا ہے تمہارے اس ربش کزن نے کوئی پٹی پڑھا دی ہے۔“

”طلحہ ابراہیم.....! پلیز وہ میرا کزن ہے اور میں اپنے کسی کے خلاف ایک بات بھی سننا نہیں چاہتی۔

اب تم اس قسم کی باتیں ختم کرو تا کہ مجھے یہ احساس نہ ہو کہ میں نے تم سے دوستی کر کے غلطی کی ہے۔“

علیزہ ہٹ دھرم اور ضدی ضرور تھی مگر وہ اپنے کسی کے بارے میں کسی غیر کے منہ سے کوئی غلط بات نہ سن سکتی تھی اور برداشت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے سختی سے اسے روک دیا اور اس وقت اور مغان اس کی یہ بات سن لیتا تو جہنم جہنم کے شکوے دُور ہو جاتے۔

”او کے.....! کیا چلے گا.....؟“ طلحہ نے مکاری سے موضوع بدلا۔



بھی ڈھیل کیوں دی، انہوں نے تو اس کی شخصیت کے خیمے میں سانس لینے کے لیے سوراخ کیا تھا، خولہ نے دیوار مائل تھی فرار کی راہ۔

”یہ..... یہ تم کس حلیے میں باہر جا رہی ہو خولہ.....! تمہارے بابا دیکھ لیں ناں تو تمہیں بعد میں اور مجھے پہلے شوٹ کر دیں۔ یہ سراسر بے ایمانی ہے، دھوکہ ہے، فریب ہے، میں ان جرائم کی مرکب نہیں ہو سکتی۔ خولہ.....! میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتی، تم امانت ہو شہباز صاحب کی میرے پاس۔ میں نے تمہیں صرف کھلی فضا میں سانس لینے کی اجازت دی ہے، حدود توڑنے کی اجازت نہیں دی۔ گو بیک اینڈ چیئنج پور ڈریس.....!“ عطیہ خاتون کا چہرہ شدت ضبط سے گرم اور سرخ ہو گیا، لہجہ انتہائی سخت کہ کچھ دیر کے لیے خولہ ان کو دیکھ کر رہ گئی۔ پھر شانے پر سے بیک اٹھا کر صوفے پر پھینکا اور ان کے قریب آ کر ان کو بغور دیکھنے لگی۔ وہ پہلے ہی غصے میں تھیں۔

”اک بات بتائیے عطیہ خاتون.....! یہ زندگی میری ہے جس کو کبھی بابا نے جیا اور اب آپ..... عطیہ خاتون.....! ایک لمحہ، کوئی ایک لمحہ بھی میری زندگی کا ایسا نہیں ہے جس پر میرا حق ہو، جسے میں اپنی مرضی اور خواہش کے ساتھ جیوں، کوئی ایک لمحہ تو مجھے اپنی مرضی سے جینے دیں آپ اور بابا.....“ وہ روہانسی ہو گئی۔ عطیہ خاتون پلٹیں۔

”صرف اس لیے خولہ.....! کہ تم وہ ایک لمحہ بھی برباد کر دو گی۔ مجھے معلوم ہے تم اسے جیو کی نہیں برباد کر دو گی۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم وہ ایک لمحہ برباد کر دو گی، امر کر دو گی تو..... تو میں..... خولہ.....! پلیز.....! میری عمر بھر کی کمائی کو یوں مٹی میں مت رولو۔“ عطیہ خاتون نے بے بسی سے کہا۔ خولہ کے چہرے پر بڑی تلخ مسکراہٹ آ گئی۔

”تو عطیہ خاتون.....! آپ..... آپ بھی بابا کی طرح خوف کے لبادے میں لپٹی، رسم و رواجوں میں جکڑی ہار اور جیت کے زہر کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے زہر کی کیر ٹیکر ہی ثابت ہوئیں۔“

”شکر کرو کہ میں تمہارے باپ کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں، تمہاری سگی ماں ہوتی تو اس لباس پر تمہاری بے باکی کا کی داستان سنا رہی ہوتی اور تمہیں انتقام دیتی کہ دوبارہ تم ایسا لباس زیب تن کرنے کی جرأت نہ کر سکتیں۔ تم ایک لمحے کی بات کرتی ہو خولہ.....! یہ ایک لمحہ ہی تو انسان کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے، اسی ایک لمحے میں تو جنت دوزخ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بیٹا.....! عورت کتنی شریف اور با کردار ہے یہ راز تو بعد میں کھلتا ہے، پہلے تو اس کی شرافت اور پاک دامنی کا ثبوت، اس کا لباس اور آنکھوں کی حیا ہے، میں اور تمہارے بابا تمہیں ایک ایسی ہی اچھی پاک دامن عورت کے روپ میں دیکھنا چاہیں اور تم.....“

عطیہ خاتون پہلے تو غصے میں آ گئی تھیں مگر بعد میں آرام اور پیار سے سمجھاتی رہیں۔ پہلے تو وہ جھل سے سختی رہیں پھر ایک دم اس نے پٹی ٹاپ دوپٹہ جو گردن کے ساتھ لگا ہوا تھا اتار کر زور پھینکا۔

”کچھ نہیں چاہتے آپ اور بابا..... صرف میرا استحصال کرنا چاہتے ہیں، ہمیشہ میں نے جب چاہا آپ لوگوں نے اسے ہی میرے لیے شجر ممنوعہ بنا ڈالا۔ نفرت ہے مجھے آپ لوگوں سے، آپ کے بنائے ہوئے کھوکھلے اصولوں سے۔ اب میں اپنی زندگی کو انجوائے کر دوں گی، میری جن خواہشات پر آپ لوگوں نے پھرے بٹھائے

”کچھ چلے گا نہیں ہم چلیں گے خولہ کے گھر.....!“ باہر دیکھتے ہوئے عطیہ نے حتی انداز میں کہا اور نے شانے اچکائے اور گاڑی اشارت کر دی۔

پاکستان آ کر عطیہ سے دوستی کر کے تو خولہ کی زندگی ہی بدل گئی تھی۔ عطیہ خاتون نے حدود میں رہ کر خواہش پوری کر دی تھی اور ایک عدد ٹی وی بھی اس کے کمرے میں رکھوا دیا تھا کہ وہ حد سے باہر نہ جائے، اس کے شوق کی تکمیل گھر میں ہی ہو جائے۔ وہ خولہ کو ادھورا بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں اور شہباز کے سامنے سرخرو بھی چاہتی تھی اسی لیے تو انہوں نے پاکستان آ کر اسے کچھ آزادی ضرور دی تھی مگر حد میں رہ کر گردنی اور اخلاقی کے اندر تک مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ خولہ کی سوچ کوئی منزلیں مل گئی ہیں، اس کی ننھی منی بے ضرر خواہشات نے ایسے اُمنگوں کے لبادے اوڑھ لیے تھے۔ وہی ٹی وی جو اس کا احساس کمتری بن گیا تھا اب اس کے کمرے میں موجود تھا مگر وہ آن نہیں کرتی تھی۔

”خولہ بیٹا.....! میں نے اتنا بڑا رسک لے کر تمہیں ٹی وی خرید کر دیا ہے اور تم لگاتی ہی نہیں ہو۔“ عطیہ خاتون نے ٹی وی آن کیا تو کوئی زرعی پروگرام چل رہا تھا۔ خولہ جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنے نئے ہیرا سائل کو ہر ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی، اس کے حسن کا ہر زاویہ ہی دلکش اور حسین نظر آ رہا تھا جس سے وہ مطمئن ہو کر مڑی اور مسکرائی اور پھر عطیہ خاتون کو شانوں سے پکڑ کر ان کی پیشانی پر پیار کر لیا۔

”عطیہ خاتون.....! کھلا ہوا پھول کتنا خوبصورت اور خوشنما لگتا ہے، ہے ناں.....؟ اس کی مہک سے روح مہک اُٹھتی ہے اور اس کے زندہ رنگ نظروں کی روشنی بڑھا دیتے ہیں اور ہر کوئی اسے اپنے بالوں میں سجانے کی کوشش کرتا ہے مگر جب یہی پھول مرجھا کر اپنی مہک اور رنگ گنوا بیٹھتا ہے تو بیچارہ بے وقعت ہو کر کچرے میں چلا جاتا ہے اور انسان کی خواہشات بھی ایسے ہی پھول اور تلی کی مانند ہوتی ہیں کہ انسان ان کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے لیکن جب تلی ان کی مٹھی میں آتی ہے تو اس کے حسین رنگین پر نہ صرف رنگ گنوا آتے ہیں بلکہ قوت پر واز بھی کھو بیٹھتے ہیں تو ایسی مردہ بے جان تلی کو کون پسند کرے گا عطیہ خاتون.....! میری یہ ننھی منی خواہشات کی تتلیاں اب رنگ گنوا بیٹھیں ہیں۔ تھا کبھی ٹی وی میرا شوق کہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھوں، کارٹون دیکھنے کی عمر میں کارٹون دیکھوں اور ڈرامہ کی عمر میں ڈرامہ۔ مگر اب تو میں خود ڈرامہ..... وہ میرا مطلب ہے۔“

خاتون.....! میں نہ تو کوئی فصل ہوں، نہ سنڈی ہوں، نہ ہی کوئی سنڈی مارا سپرے جس کا چھڑکاؤ کر کے فصل کو سنڈی سے بچایا جاسکے.....؟ عطیہ خاتون.....! ٹی وی کی خواہش تو اسی عمر میں مر گئی تھی جب خیر اب تو.....“

بولتے بولتے اس کے کھوکھلے دیران لہجے میں اس کی ادھوری نا تمام خوشیوں، خواہشوں کی موت کا سناٹا تھا۔ وہ عطیہ خاتون کو چھوڑ کر رُخ مڑ کر کھڑی ہو گئی اور بھیگی آواز کی نمی کو زخموں پر سے صاف کر کے پھر مڑی۔

”اب تو..... اب تو اور سے اور ہوئے درد کے عنوان جاناں.....!“

اک تلخ سی ہنسی اس کے لبوں کو چھوتی، عطیہ خاتون کو دکھ دیتی غائب ہو گئی تو وہ اٹھ کر باہر آ گئیں۔ خولہ، طلحہ اور عطیہ کے لیے تیار ہونے لگی۔ سیلو زلیں شرٹ اور ڈپ گر بیان پر پٹی ٹاپ دوپٹہ لے کر جب وہ باہر نکلی تو عطیہ خاتون ششدرہ گئیں۔ ایک لمحے کو ان کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ انہوں نے اسے اتنی



ہیں ناں سب پوری کروں گی، یہ میری زندگی ہے، میں اپنی زندگی اب آپ لوگوں کو جینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آپ سب نے، میری ماں نے، بابا نے، آپ نے، سب نے اپنی اپنی زندگی کی تمام بہاریں دیکھیں، ان کو انجوائے کیا اور میری باری آئی تو اپنی سوچ کے پہرے بٹھا دیئے جو مجھے پلک بھی جھپکنے نہیں دیتے۔ ہونہ۔۔۔۔۔! یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، گھر نہ ہوا کیڈی ہو گیا۔“

خولہ اندر سے سلگ رہی تھی۔ طلحہ ابراہیم اور علیزہ پہنچنے والے تھے۔ وہ کتنے شوق سے تیار ہوئی تھی اور حسین لگ رہی تھی مگر عطیہ خاتون نے حسب عادت ٹوک دیا تو وہ بری طرح بے حرا ہو گئی، اپنے کمرے میں آ گئی۔ واپس آئی تو عطیہ خاتون نے دیکھا وہ ان ہی کپڑوں پر سیاہ رنگ کا بڑا سافل آستین والا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ ان کو اس کے پھولے ہوئے منہ پر ڈھیر سارا پیار آ گیا۔ وہ اس کی بدکلامی بھول کر اس کے قریب آ گئیں اور اسے پیار کر لیا۔

”دیکھو بیٹا!۔۔۔۔۔! گناہ بہت دلکش اور پر لطف ہوتا ہے صورتاً مگر اس کی سیرت انتہائی خوفناک اور بے ایمان ہوتی ہے۔ یہ اپنی دلکشی کے پردے میں اپنی مکروہ صورت چھپائے رکھتا ہے اور کمزور نفس اس کی صورت کے پلک میں آ جاتے ہیں جبکہ ٹیک اور مضبوط لوگ نفس کو کمزور نہیں پڑنے دیتے۔“

”پلیز!۔۔۔۔۔! پلیز عطیہ خاتون!۔۔۔۔۔! کبھی تو لیکچر بازی سے باز آ جایا کریں!۔۔۔۔۔! میں جا رہی ہوں، خدا حافظ!۔۔۔۔۔! وہ چڑکرا پنا بیک سنبھالتی آگے بڑھ گئی۔

”جاؤ!۔۔۔۔۔! اللہ تمہارا نگہبان ہو!۔۔۔۔۔! تمہیں برائی کے راستے پر جانے سے روکے، آمین!۔۔۔۔۔!“

خاتون نے اس پر پھونک ماری جو طلحہ اور علیزہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

طلحہ نے بے تکلفی سے خولہ کی طرف بڑھایا ہاتھ ملا یا اور گاڑی تک لے آیا۔ طلحہ ایک بزنس مین تھا، ہر بات ہر چیز کو صرف اپنے فائدے کے تناظر میں دیکھتا تھا اور دوسروں کے شوق اور محرومیوں کو کیش کرانے کا فن اسے بخوبی آتا تھا اور علیزہ، خولہ کے شوق اور محرومیوں کو وہ اچھی طرح جان چکا تھا اسی لیے وہ ان کے حسن اور فریٹش مائنڈ سے بہت کام لینا چاہتا تھا۔ ان دونوں کو مٹھی میں رکھنے کے لیے وہ ان کی ہر بات مان رہا تھا۔ اس کے فائدے کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دونوں لڑکیاں ویل آف گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کو اس سے مالی فائدے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

”خولہ!۔۔۔۔۔! کم آن!۔۔۔۔۔! یہ کیا تم نے اپنے خوبصورت لباس پر اپر چڑھا رکھا ہے!۔۔۔۔۔!؟ اُتارو اسے۔۔۔۔۔! زبردست!۔۔۔۔۔! دیکھو تو طلحہ!۔۔۔۔۔! خولہ کتنی خوبصورت اور اسماٹھ ہے!۔۔۔۔۔! طلحہ کی ایک اور دوست ماریہ نے آگے بڑھ کر خولہ کا اپر خود اُتار کر طلحہ سمیت گویا سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تو اس وقت کمرے میں موجود سب کی نظریں اس پر جم سی گئیں۔ طلحہ تو اک ادائے دلربائی سے اسے دیکھتا ہوا اس کے قریب آ گیا کہ خولہ جو اپر کے اتر جانے پر خود میں سمٹ گئی تھی، ایک دم پیچھے ہٹ گئی اور خود پر جی طلحہ کی بے باک نگاہوں کی حدت سے وہ اپنا ہوا جلتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ ایک پل کے لیے عطیہ خاتون اور بابا کی ساری باتیں، نصیحتیں جن سے وہ بے راز تھی، اپنی ڈھال محسوس ہوئیں۔

”کتنی ظالم ہوتی!۔۔۔۔۔! اپر چڑھا کر اپنے ساتھ دوسروں کے ساتھ بھی زیادتی کر رہی ہو۔“ طلحہ حسب

عادت اور حسب فطرت بے باکی سے بولا اور قریب تھا کہ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ خولہ کے بالوں کو چھوٹا یا چہرے کو، علیزہ جو خولہ سے عمر میں بڑی بھی تھی اور سمجھ دار تھی، اسے یہ سب اچھا نہیں لگا۔ تیزی سے آگے بڑھی اور خولہ کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب اور طلحہ سے دُور کر دیا تھا تو وہ اسے استفہامیہ نگاہوں سے گھورنے لگا۔

”کم ٹو دا پوائنٹ!۔۔۔۔۔! تم نے کہا تھا کہ کوئی نیا اسکرپٹ آیا ہے اور بہت زبردست ہے، اسی پر کام کرنا ہے، لاؤ دکھاؤ۔“ طلحہ کی بات کی اہمیت کو ختم کرتے ہوئے علیزہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ صرف کام کرنے کے لیے ہیں دوسری فضولیات کے لیے نہیں۔

”بہت شوق ہے تمہیں کام کرنے کا!۔۔۔۔۔!“ طلحہ کی نظریں بار بار گھوم پھر کر خولہ پر آٹھرتیں۔

”ہاں!۔۔۔۔۔! نوڈاؤٹ کہ مجھے ڈائریکٹس کی فیلڈ میں آنے کا بہت شوق ہے تم نہ ملتے تو کسی اور کے ساتھ

کام کرتی۔“

”اوکے!۔۔۔۔۔! تو آؤ پھر!۔۔۔۔۔! طلحہ نے بغور دونوں کو دیکھا اور پھر باقاعدہ اسکرپٹ پر کام ہونے لگا۔

● ● ●

خولہ کے جانے کے بعد عطیہ خاتون عصر کی نماز پڑھ کر آصفہ کے پاس آ گئیں جن کی طبیعت آج کل بہت راب تھی۔

”انتظار ختم نہیں ہوتا تو پروردگار!۔۔۔۔۔! زندگی ختم ہو جائے۔“ سسکتے ہوئے آصفہ نے اپنا سر بیڈ سے مارا تو وہاں کی سچی نکل گئی۔ نعمان گھبرا کر ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے بھاگا۔

”دیکھا آئی!۔۔۔۔۔! آپ نے، ماما!۔۔۔۔۔! یہ باتیں کرتی ہیں۔ ممانے کبھی میرے اور بھائی کے بارے میں نہیں سوچا۔ سوچا بھی تو آئی!۔۔۔۔۔! یہ کیا سمجھتی ہیں ہمیں ان کی ایسی باتوں سے دُکھ نہیں ہوتا!۔۔۔۔۔!؟ چپا بھی گھر پر نہیں۔“

زودہا بری طرح رو رہی تھی۔ اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی ماما کو پیار اور ایسی باتیں کرتے سنا تھا۔ دونوں بہن بھائی ماما کی وجہ سے مرجھا کر رہ گئے تھے۔ ماما کی ایسی باتوں سے دل بہم کر رہ گئے تھے۔ اس بات کا احساس نوآصفہ کو بھی تھا مگر کیا کرتیں، ان کو خود پر اختیار بھی نہیں تھا، جب در دسوار ہو جاتا تو بے قابو ہو جاتیں۔

”زودہا بیٹا!۔۔۔۔۔! روتے نہیں، نماز اور صبر سے اللہ کی مدد مانگتے ہیں۔ جاؤ شاباش!۔۔۔۔۔! ہمارے لیے اچھی کی جائے بنا کر لاؤ۔ دیکھو میں ابھی تمہاری ماما کو درست کرتی ہو۔“

عطیہ خاتون نے زودہا کو پیار کیا تو وہ ان کو ممنون نظروں سے دیکھتی اٹھ کر دروازے تک گئی پھر کسی دہم کے تحت اس نے پلٹ کر ماما کو دیکھا جن کے دورے کی کیفیت اب کم ہو رہی تھی، چڑھا ہوا طوفان آہستہ آہستہ معمول پر آ رہا تھا اور عطیہ خاتون نہ صرف ان کو سمجھا رہی تھیں بلکہ آیات پڑھ کر ان پر پھونک بھی رہی تھیں تو آصفہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شعلوں پر کوئی ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہو۔ درد کی شدت اور جلن میں کمی ہو رہی تھی۔ انہوں نے ممنون ہو کر عطیہ خاتون کے ہاتھ تھام لیے۔

”اب کیسا فیل کر رہی ہیں آصفہ!۔۔۔۔۔!“ عطیہ خاتون نے ملائم لہجے میں پوچھا تو آصفہ نے بی بی سے کہا۔

”کھوج اور تلاش کے اس صحرا میں پہلی بار عطیہ!۔۔۔۔۔! پہلی بار اُمید اور یقین کے بادل چھائے ہیں، پہلی



بار جگنو چمکے ہیں، پہلی بار ایک سکون کا ٹھنڈا احساس دل کی عمیق گہرائیوں میں اُترا ہے۔ عظیمہ.....! تھینک یو.....!“

آصف زندگی میں پہلی بار اتنی پرسکون ہوئی تھیں اور ان کی ممنون بھی بہت تھیں۔

”اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سکون کا وسیلہ مجھے بنایا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں۔“

دوسری بات یہ آپ ظفر بھائی کی طرف سے پریشان نہ ہوں، آجائیں گے۔“

”نہیں عظیمہ.....! ظفری تو فرشتہ صفت جیون ساتھی ہیں، وہ میرے دکھ اور پریشانی کی وجہ سے کبھی نہیں بنے۔“

”ارے ماما.....! آ..... آپ ٹھیک ہیں ناں.....؟“ زہد پچائے لے کر آئی تو اس دورے کی کیفیت اتنی جلدی باہر دیکھ کر اسے بے اندازہ خوشی ہوئی۔

”ڈونٹ وری بیٹا.....! اب یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی انشاء اللہ.....! اللہ کے پاک کلام میں ہر درد کی دوا، ہر دکھ کا علاج موجود ہے۔ لا علاج بیماری بھی اللہ کے ذکر سے ٹھیک ہو جاتی ہے تو ان کا مرض تو لا علاج ہی نہیں۔“ پھر عظیمہ خاتون جانے کب تک آصف کو سمجھاتی بہلاتی رہیں اور ذکر اللہ زیادہ سے زیادہ کرنے کی تاکید کرتی رہیں۔

ظفر آج کل ماضی کی اوراق گردانی کرنے کے لیے اپنے علاقے راولپنڈی گئے ہوئے تھے۔ راولپنڈی کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہاں اپنا گھر دیکھا جس کے بڑے سے آگن میں لکڑیوں چولہا آج بھی جل رہا تھا اور لوگ بھی رہ رہے تھے مگر وہ خود کو اور والدین کو اس آگن میں تلاش کرتے اس کے آگے جہاں ان کے اور وجاہت کے والد کی دوستی نے جنم لیا، پروان چڑھی اور موت کی آخری ہنگی لیتے ہوئے ظفر اور وجاہت کی دوستی کی گرہ لگا گئی، جو ان کی دوستی کی طرح بے لوث اور مضبوط نہ رہی اور غرض اور حسد کی نذر ہو گئی۔

ظفری کتنی ہی ویران چیزوں کو چھو کر دیکھتے رہے جو کبھی ان دونوں کے زیر استعمال رہی، اس گھر کے دروازے دیوار کو دیکھتے رہے جہاں ان کے جوان قہقہے گونجا کرتے تھے۔ پھر وہ دل حریں کا درد لئے زینت کی اس گلی میں پر آکھڑے ہوئے جو تنگ تھی اور سانپ کی طرح مل کھاتی ہوئی اونچی نیچی تھی، جہاں وہ کسی دوست سے ملے آئے تھے کہ زینت نے ان دونوں کو مدد کے لیے پکارا تھا اور انسانی ہمدردی کے تحت دونوں کے قدم ایک ساتھ اٹھے تھے ہر قسم کی غرض اور لالچ سے پاک نیت کے ساتھ مگر کون کہہ سکتا تھا کہ ایک ساتھ اٹھنے والے قدم آخری بار ایک ساتھ اٹھے ہیں پھر یہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے۔ پھر زینت کا حسین چہرہ، خوبصورت گہری آنکھیں جس میں خلاف توقع ظفر نے اپنا عکس دیکھا تھا تو خوشی سے دیوانے سے ہو گئے تھے۔ اس حادثے سے ایک لوائسٹوری وجود میں آئے گی یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

زینت کو ہزار جان سے چاہنے کے باوجود انہوں نے اپنی چاہت کو ضبط کے قید خانے میں مقفل رکھا لیکن جب زینت نے ہاتھ اور قدم ان کی طرف بڑھائے تو گویا وہ خوشی سے دیوانے سے ہو گئے اور یہ دیوانگی ان کو

اس نہیں آئی۔ وجاہت دوست کی بجائے رقیب روسیہ بن کر دونوں کے بیچ آ گیا پھر ان کا اور زینت کا تہنہ، چلنا اور وجاہت کی ہر چال کا کامیاب ہو جانا۔

”آف میرے خدا.....! اتنا کچھ سہہ لینے کے بعد بھی میں زندہ ہوں.....؟“ وہ لان کے سوکھے گھاس پر بیٹھے جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔

”جی.....! آپ کون صاحب ہیں اور اندر کیسے آئے.....؟ یہ چوکیدار کہاں ہے.....؟“ بولنے والے نے پہلے تو ان کے شانے پر ہاتھ رکھا پھر چوکیدار کو آواز دینے لگا۔ ظفر چونک کر اس شخص کو دیکھنے لگے۔ وہ بھی ان کی طرف متوجہ تھا۔

”تت..... تم جاوید ہونا.....؟“ ظفری جھٹکے سے کھڑے ہو گئے تو جاوید نے اپنی نظر کا چشمہ اتارا، صاف کر کے پھر لگایا۔ ماضی کا آئینہ وقت کی گرد سے دھندلایا ضرور تھا مگر اتنا نہیں کہ شناخت کی صلاحیت کھو بیٹھتا۔

”آ..... آ..... آپ ظفری بھیا.....!“ اور پھر جیسے ظفر کو اپنا دکھ رونے کے لیے ایک شانہ مل گیا۔ جاوید وجاہت کا خاص آدمی تھا، اس کے بہت سے راتوں کا امین بھی تھا۔ ظفر کرید کرید کر وجاہت اور زینت کے بارے میں پوچھتے رہے اور جس حد تک اسے علم تھا وہ بتاتا رہا مگر کہانی زینت کی موت پر آ کر ٹھہر گئی۔

”کیا.....؟ کیا زینت مر چکی ہے.....؟ آف خدا.....! یہ کیا ہو گیا.....؟ میں تو زندگی کا ایک ایک لمحہ اس آس پر چھا رہا کہ کبھی نہ کبھی اس سے ملوں گا، اپنے زخم دکھاؤں گا، اس کے زخموں پر مرہم رکھوں گا۔ زینت.....! میرا انتظار تو کیا ہوتا.....!“

امید کے ننھے ننھے دیے جو ظفر نے روشن کر رکھے تھے آج زینت کی موت کی اطلاع کے جھوٹے سے سارے بجھ گئے تو اتنا گھٹا گھٹا پاندھیرا ہو گیا کہ ظفر کو اپنا نام کھٹنا ہو محسوس ہونے لگا۔ جانے کب تک وہ زینت کی قبر پر روتے رہتے کہ جاوید نے ان کا شانہ ہلایا۔

”ظفری بھیا.....! بہت رات ہو چکی ہے۔ چلے میرے گھر چلے۔“ جاوید نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر دل کا گرا ایسا اجڑا کہ ظفر کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ وہ زینت کی بیٹیوں کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

”معلوم نہیں ظفری بھیا.....! مجھے اتنا پتہ ہے کہ ان بچیوں کی پیدائش پر زینت باجی کی ڈیٹھ ہو گئی اور وجاہت نے کسی ڈاکٹر شہلا سے شادی کر لی پھر وہ کہاں گئے؟ کچھ خبر نہیں۔ نہ وجاہت صاحب کی اور نہ ان کی فیملی کی۔“

ظفر جو زینت کے ساتھ بیٹھ کر اپنی ناتمام خواہشات اور ٹوٹے خوابوں کا ماتم کرنا چاہتے تھے، اس کی موت کا گہرا صدمہ لیے لوٹ آئے۔

دردہ گاڑی سے جیسے ہی اتری ڈرائیور گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا۔ دردہ جو گاڑی میں اپنا موبائل بھول آئی تھی جیسے ہی لینے کے لیے پلٹی تو لڑھک گئی اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور تین سیڑھیاں جو چڑھائی تھی گر گئی۔



یہ تو خدا کا شکر تھا کہ زیادہ سیڑھیاں نہیں چڑھی تھی ورنہ اتنی سیڑھیوں سے گرتی۔ اس کے پاؤں میں شدید جسمی چوٹ آئی تھی، درد کی شدت پانی کی صورت اس کے زخموں پر پھیل گئی۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ غزین تیزی سے آگے بڑھا، وہ گھٹنے پر سر رکھے پاؤں پر ہاتھ رکھے ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار اور آنسو اس بات کے ثبوت کے لیے کافی تھے۔ نجانے کیوں غزین اس کی ٹیسس اپنے دل میں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول کر اس کی طرف جھکا پوچھا تھا۔

”کیا بہت چوٹ آئی ہے.....؟“ غزین کا انداز اور لہجہ بالکل سادہ اور ہر قسم کی ریاکاری سے پاک تھا مگر وردہ کو لگا جیسے وہ جان بوجھ کر پوچھ رہا ہے۔

”نہیں.....! آئی ایم اوکے.....!“ وہ نخوت سے اسے گھورتے ہوئے اٹھنے لگی مگر پاؤں پر ذرا بھی دباؤ نہ ڈالا گیا۔ پھر لڑکھا گئی۔ غزین نے بڑھ کر تھام لیا ورنہ اب تو شاید منہ کے بل گرتی۔

”ڈونٹ پنچ می.....!“ اس نے انتہائی حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ کچھ بھی تھا یہ سب غزین کی وہ سے ہی تو ہوا تھا نہ وہ اس سے پارٹی میں آنے کی ضد کرتا نہ یہ ہوتا۔ غزین کو غصہ تو آیا مگر اس وقت وہ اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پھر صلح جوئی سے ہاتھ بڑھایا۔

”وردہ.....! لاؤ میرے ہاتھ میں ہاتھ دو..... میں اندر لے چلا ہوں۔“ اس کی پر خلوص آفر پر وہ کھانے والے نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”تمہارے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے بہتر میں موت کے ہاتھ میں ہاتھ دینا پسند کروں گی۔“ اس وقت غصے سے اس کا چہرہ سرخ اور نتھنے پھول رہا ہے تھے، تکلیف کی شدت سے آنسو الگ ہے جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں وہ غزین کو بہت اچھی لگ رہی تھی اسی لیے تو کوئی سخت بات نہیں کر رہا تھا۔

”تو چلے.....! مجھے ہی اپنی موت سمجھ کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیجئے، آزمائش شرط ہے۔“ ہلکی سی شرارت بھری مسکراہٹ غزین کے لبوں پر پھیل کر وردہ کو مزید چراغ پا کر گئی۔

”شٹ اپ.....! میری ماما کو بلائیے۔“ وہ دھاڑی۔

”کیوں بلاؤں ماما کو.....؟ ملازم سمجھ رکھا ہے محترمہ نے..... حکم پر حکم دیئے جا رہی ہیں، میں اس وقت ہاتھ تھام رہا ہوں اور محترمہ ہیر و مین بن رہی ہیں۔ ایکسیکوز می.....! ایسا کچھ نہیں ہے، آپ مہمان اور میں میزبان ہوں، سیدھی طرح چلتی پھرتی نظر آئیے۔ ایک تو سب سے آخر میں آئیں اُدپر سے چوٹ لگا کر احسان فرمایا جا رہا ہے۔ ارے.....! آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں.....؟ اک ذرا سی تکلیف پر آسمان سر پر اٹھا لیا ہے، آپ کو کیا خبر کہ ڈکھ تکلیف کہتے کس کو ہیں.....؟ وہاں سب کھانے کا انتظار کر رہے ہیں، یہ احسان فرماتی آئیں اور لڑھک گئیں۔ میں پوچھتا ہوں اس وقت چوٹ لگوانے کی ضرورت کیا تھی.....؟“

وہ جواب تک اس کے نازاٹھار ہاتھ بولا تو بولتا گیا تو اس نے بھیگی پلکوں سے اسے دیکھا۔ کچھ کچھ روٹھا کچھ کچھ پشیمان سایہ خور و وجہہ نو جوان جو نجانے اس کے ساتھ ایسا کیوں کرتا تھا، اتنی تکلیف کے باوجود اسے اچھا لگا۔ اسے دیکھتا پا کر وہ سیدھا ہو گیا اور منہ پھلا کر سینے پر بازو باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”دوسروں کو ڈکھ دینا، چوٹ لگانا اچھا لگتا ہے ناں آپ کو تو اب ذرا سی چوٹ لگ جانے پر اس قدر کیوں رویا جا رہا ہے.....؟“ وہ تو اور بھی کچھ بولتا کہ اسد بات مزید بڑھ جانے کے خیال سے شہلا کو بلا لایا۔

”وردہ.....! وردہ میری جان.....! کیا ہوا.....؟ کیسے چوٹ آگئی میری گڑیا.....!“ ماما کو دیکھ کر وہ غزین کا خیال بھول کر ان کے ساتھ لگ گئی۔

”ماما.....! بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

”اچھا ہے.....! اور ہو۔“ غزین نے اس کے قریب ہو کر دھیرے سے کہا۔

”میری جان.....! کہیں موج نہ آگئی ہو.....؟“

”ان کے پاؤں پر موج آئے نہ آئے مگر اللہ کرے ان کے دل پر موج ضرور آئے۔“ شہلا چونکہ پاؤں کا معائنہ کر رہی تھیں تو غزین کو اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے کا بھرپور موقع مل گیا تھا۔

”غزین بیٹا.....! لگ تو نہیں رہی مگر پھر بھی ہمیں اپنا شک و دور کر لینا چاہیے۔ ایسا کرو تم ڈرائیور سے کہو

گاڑی لے آئے، ہم مہمانوں کو دیکھ لو سب اس کی وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔“

”آئی.....! آپ بھی ڈاکٹر ہیں، آپ نے چیک کیا، میں نے کیا، یہ خود ڈاکٹر ہیں، خود دیکھ سکتی ہیں موج

نہیں آئی ہے۔ بس گوشت میں دباؤ کی وجہ سے موج نہ آگئی ہے، تکلیف صرف اس وقت اہمیت اختیار کرتی ہے

جب اس کے نازخوئے اٹھائے جائیں، اسے جتنا مل گیا جائے وہ اتنی زیادہ محسوس ہوگی۔ بہر حال آپ کہہ رہی

ہیں تو ڈرائیور کیوں میں خود گاڑی لے کر آتا ہوں۔“ پھر وہ مڑا اور اسد کو نئے احکامات دیتا ہوا گاڑی لے کر

آگیا۔

”آئیے آئی.....! آپ تشریف رکھیے اور میں وردہ.....! آپ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیجئے۔“

شہلا کے لیے فرنٹ ڈور کھول کر وہ وردہ کی طرف پھر ہاتھ بڑھائے بڑے معنی خیز انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ بیچ و

تاب کھا کر رہ گئی۔

”جلدی کیجئے محترمہ.....! سب فکر مند ہیں۔“ وہ اس کے قریب آگیا۔ شہلا گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔

وردہ کو غصہ آگیا۔

”مہمان بھی عجیب ہیں۔ مجھے پکڑنے کی بجائے خود جائیٹھی ہیں۔ اتنا اعتماد بھی اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ اسے

گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میرے نقوش بعد میں حفظ کر لیجئے گا پہلے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ چلے.....! کتنی خیرے باز ہوتی ہیں یہ

لڑکیاں۔“

غزین کو واقعی اب غصہ آنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر خود اس کا ہاتھ پکڑا، کھینچ کر کھڑا کر دیا اور اسے مجبوراً

قدم بڑھانے کے لیے اس کے شانے کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے ہاتھ جیسے ہی اس کے شانے پر رکھا، وہ شوخی سے

مڑا۔

”اچھا لگا آپ کا سہارا لینے کا یہ انداز ہمیں۔“



وہ اپنی دلکش مسکراہٹ سے اسے جلاتا چلنے لگا اور واقعی اس کا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔ اسے کوئی سوچ نہیں آئی تھی، دباؤ کی وجہ سے صرف گوشت میں سو جن اور تکلیف تھی۔

غزین اب اس کے سارے خاندان پر چھا چکا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بھی سوچ میں پڑ جاتی کہ اصل حقیقت کیا ہے یا تو یہ شخص ڈرامہ کر رہا ہے یا ایسا ہی ہے۔ لیکن یہ اسے یقین تھا کہ وہ دہری شخصیت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اسی خیال کا اظہار اس نے اسد سے کیا تو ایک معنی خیزی خاموشی نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ کچھ بھی تھا وہ اس کی سوچ کا عنوان بن چکا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی، کھوج لگانے لگی تھی۔

”مگر کیوں.....؟ وہ اچھا ہے یا برا مجھے کیا فرق پڑتا ہے.....؟“ وہ کبھی کبھی خود ہی خود کو صفائی پیش کرتی۔

• • •

علیزہ، جواد اور ارمغان عید کرنے آرہے تھے۔ شہلا بہت خوش تھیں اور ان سے زیادہ عفت خوش تھیں۔

”بس شہلا.....! اب آنے دو میرے مانی کو۔ دیکھنا دونوں کا نکاح کر کے ہی بھیجوں گی۔“ شہلا اور وردہ

ان کی باتوں پر ہنس پڑیں۔

”مامی.....! چھوڑیے مانی کے نکاح کو آپ بس مجھے اپنی بیٹی بنالیں، بیٹی۔“ وردہ کی بات کا کیا مطلب ہے وہ عفت تو سمجھ نہیں پائیں البتہ شہلا مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ عفت تو خوشی سے دیوانی ہو گئیں۔

”ہاں ہاں.....! میں صدقے جاؤں، میں تمہیں اپنی بیٹی بناؤں گی۔“ انہوں نے فرط مسرت سے اسے ڈھیر سارا پیار کر لیا۔

”جی.....! صرف بیٹی ہی۔“ وردہ چپکے سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ عفت کچھ حیرت زدہ سی ہلتا پردہ دیکھتی رہیں۔

”بھابھی جان.....! روزہ کھلنے والا ہے، آئیے.....! شہلا نے ان کو سوچ سے باہر نکالا۔ پھر ارمغان وغیرہ آگئے تو رمضان کا حرا آنے لگا۔ ارمغان اور جواد مل کر خوب تنگ کرتے، ارمغان کی وہی شرارتیں اور علیزہ کی وہی نفرتیں تھیں۔

”تم ارمغان سے اتنا کیوں چڑتی ہو علیزہ.....!“ اس روز پکڑے بناتے اس نے پوچھا تو فروٹ چاٹ بناتے ہوئے علیزہ نے بڑی معنی خیز انداز میں اسے دیکھا۔

”ایکسکوز می.....! خیریت تو ہے ناں.....؟ کہیں آپ انوالو تو نہیں ہو گئیں.....؟“

”ہاں ہاں.....! کچھ ایسی گڑبڑ محسوس تو ہو رہی ہے مجھے۔“ وہ اسے چڑانے کے لیے آہ بھر کر بولی تو وہ غصے سے اس کی طرف بڑھی۔

”میں جان نکال دوں گی اگر ایسا ہوا تو۔“

”کس کی.....؟ ارمغان کی.....؟ دیکھو ایسا نہ کرنا، میری عیدی آنے والی ہے اور چاند رات کو ارمغان

مجھے شاپنگ پر بھی لے جائے گا۔ چوڑیاں، مہندی اور.....“

”ڈاکٹر ز پر یہ خوش فہمی سوٹ نہیں کرتی ڈاکٹر وردہ.....! بڑا شوق ہے تمہیں میرے ساتھ شاپنگ کرنے

کا.....؟ میں چاند رات کو شاپنگ بھی کراؤں گا، چوڑیاں، مہندی بھی دلاؤں گا مگر اسے جو.....“

”آپ کو بے حد ذلیل کرتی ہے، ہے ناں.....؟“ وردہ نے پلٹ کر گیلیا بیسن ارمغان کی ناک پر لگایا اور چاند رات کو ان لوگوں نے خوب انجوائے کیا۔ شاپنگ کرتے چوڑیوں کی شاپ پر وردہ چوڑیاں دیکھ رہی تھی۔

”لایئے ہاتھ دیجئے چوڑیاں پہنا دوں۔“ اس نے ارمغان کو دیکھتے ہوئے ڈکاندار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پہنانے والے نے برق رفتاری سے ڈھیر ساری چوڑیاں اس کی کلائی میں بھر دیں اور جب وہ متوجہ ہوئی تو اس کا ہاتھ غزین کے ہاتھ میں تھا۔

”آ..... آپ..... آپ یہاں.....؟ اور یہ.....“

”جی.....! یہ دکان میرے دوست کی ہے۔ کہہ رہا تھا لڑکیاں آئیں تو مجھے کھڑا کر دیا۔ تب سے ہاتھ فارغ ہی نہیں ہو رہا۔ ایک لمحے بعد ایک ہاتھ ہاتھ میں آرہا ہے۔“

چاند رات کے خوشی اور رنگ برساتے لمحوں میں وہ بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وردہ نے دیکھا ارمغان نے مسکرا کر منہ دوسری طرف کر لیا تھا جس کا مطلب اس نے یہی نکالا کہ ارمغان بھی شامل ہے۔

اس نے چوڑیاں اتارنا چاہیں تو غزین ڈپٹ کر بولا۔

”خبردار.....! جو ایک چوڑی بھی اُتاری ہو تو۔“

ایسی کوئی خطرناک دھمکی بھی نہیں تھی اس نے مگر پھر بھی نجانے کیوں اس نے واقعی چوڑیاں اُتاری نہیں۔ کیوں اس کا جواب خود اس کے پاس بھی نہیں تھا، کچھ باتیں شاید بے وجہ ہی ہوتی ہیں یا اس کی اتنی بڑی

اور گہری وجہ ہوتی ہے کہ ہم سمجھنے سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ عید آئی اور نئی خوشیوں اور نئے احساس کے پیغام دیتی چلی گئی۔ ارمغان لوگ لاہور واپس چلے گئے تھے۔ غزین آفاق صاحب کی طرف سے بہت فکر مند تھا جن کو پھر

آکسیجن لگی ہوئی تھی۔

”ڈاکٹر.....! کیا یہ کبھی بول نہیں سکیں گے.....؟“

”ہاں.....! بول سکتے ہیں۔ اگر کوئی اموشنل ایک ہو۔“

”تو پھر ٹھیک ہے ڈاکٹر.....! اب ان کے بولنے کے لیے مجھے اموشنل ایک کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“

”غزین.....! جلدی آؤ.....!“

♦ ♦ ♦



ہاں.....! تو میں ایک انجان آدمی بلکہ صرف آفاق صاحب کا جذباتی بیٹا سمجھ کر تمہاری ان باتوں کو محبت سے کھاتے میں ڈال کر کوئی ایسی تسلی دے دیتا جو سچ بھی نہ ہوتی مگر پھر بھی تم اس پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہوتے۔ مگر تم خود ڈاکٹر ہوا اور بہت قابل ڈاکٹر ہو، جہاں تک میں جانتا ہوں تم بہت ذہین آدمی ہو جو میڈیکل جات میں وہ ایسی بات کرے تو مناسب بات نہیں۔ بہر حال تمہاری اس بچکانہ بات کا جواب یہ ہے کہ ہم لوگ صرفہ اکثر ہیں، ہماری طاقت اور علم کی ایک حد مقرر ہے مگر جو سب سے بڑا ڈاکٹر ہے ناں، جو خالق بھی ہے اور مالک بھی، وہی جانتا ہے کہ آفاق صاحب کے پاس کتنا وقت ہے اور کب تک یہ جی سکتے ہیں.....؟ ہم سانس گنتے والے کون ہوتے ہیں.....؟ آپ بیٹے ہوان کے اور میں آپ کو نصیحت کروں گا کہ ان کی جتنی خدمت کر سکتے ہیں کرو، پیچھتاوے کے لیے ایک لمحہ بھی نہ چھوڑنا، وہ ایک لمحہ ہم انسانوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور پیچھتاوے کا یہ ایک لمحہ ہماری زندگی کی ہر خوشی کو نگل جاتا ہے۔ اوکے.....! ناؤ آئی ہیو ٹو گو.....! خدا حافظ.....!“

ڈاکٹر ہاشم اپنے لفظوں کے آئینے میں غزین کا نقش اُتارتے اسد کے ساتھ باہر نکل گئے تو غزین بے حس و حرکت الفاظ کے اس آئینے میں اپنی اس شکل کو دیکھنے لگا جو اس وقت بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ ایک لمبا آدمی کیا سوچ رہا ہوگا کہ اپنے پاپا کے باہرے میں یہ بات کرنا سوچنا بھلا کسی بیٹے کو کیوں کر زیب دے سکتا ہے۔

”پھر..... پھر میں کیا کروں پاپا.....؟ میں بھی انسان ہوں۔ آپ زبان کیوں نہیں کھول دیتے.....؟ کیوں مجھے اس اذیت ناک کیفیت سے باہر نہیں نکال دیتے.....؟ کیوں اس لامتناہی راستوں کی منزل بن جاتے.....؟ کیوں.....؟ کیوں پاپا.....؟ پلیز پاپا.....!“ غزین بالکل بے بس بچے کی طرح ان کے ہاتھ تھامے رو رہا تھا، وہ بھی رورہے تھے، لب لباب ضرور رہے تھے مگر کیا تو ان کے پاس الفاظ نہیں تھے یا الفاظ گونگے تھے مگر غزین کو بولتے، کو بولنے لفظ درکار تھے جو اس کے پرسکون، خوشی کا درماں بن جائیں۔

”پلیز پاپا.....! میں بہت بے قرار ہوں، بے چین ہوں بے منزل راہوں پر چلتے چلتے تھک گیا ہوں، اب تو ایک قدم بھی نہیں اٹھتا مجھ سے، کوئی منزل نہیں، کوئی کرن نہیں۔ پاپا.....! اس اندھیرے میں دم گھٹنے لگا ہے میرا۔ پلیز.....! کم ٹولائف اینڈ اسپیک.....! پلیز.....!“

آفاق صاحب کا لرزنا ہوا ہاتھ اٹھا اور اس کے جھکے سر پر آکر ٹھہر گیا۔ ان کی بے زبان خاموشی سرد ہاتھ کی لہان سے جو کہانی سنارہی تھی وہ چلتے ہوئے غزین کی سمجھ میں آ رہی تھی نہ ہی اسے کچھ سنائی دے رہی تھی۔ جانے کب تک وہ اسی کوشش میں مصروف رہے اور کب غزین مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ اب اسد تھا اور اس کا شانہ۔

”نہیں اسد.....! میں..... میں اس طرح جی ہی نہیں سکتا، میرا دم گھٹتا ہے، آفاق صاحب کو واپس آنا ہی ہوگا، زبان کھولنا ہی ہوگی ورنہ.....“

غزین نے جذباتی ہو کر اپنے بال نوچ ڈالے۔ وہ جب بھی کرب، مایوسی کے صحرا سے گزرتا اس کی ایسی ہی حالت ہوتی اور اسی جانتی کی حالت سے اسے باہر لاتے لاتے اسد ہلکا ہوجاتا۔

”مایوسی بری بات ہے غزین.....! اللہ تعالیٰ انکل کو زندگی دے، وہ ٹھیک ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ.....! کتنے نازوں سے تو انہوں نے تمہیں پالا، تربیت کی کتنے لاڈ اٹھایا کرتے تھے تمہارے۔“

”پاپا نے میری پرورش، تعلیم و تربیت ایسی کی کہ دنیا میں کوئی باپ نہیں کر سکتا، میں تو ان کی محبت کے نشے

غزین جو ڈاکٹر سے آفاق صاحب کی حالت کے بارے میں پوچھ رہا تھا اسد کے ہلانے پر اندر گیا تو آفاق صاحب کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ غزین آگے بڑھا، ان کی آنکھیں سانس رکنے اور پھولنے کی وجہ سے ایک طرح سے پھٹنے والے انداز میں کھلی جا رہی تھیں جس سے اندازہ ہو رہا تھا وہ کتنی اذیت میں ہیں۔ ہاتھ اٹھا کر کچھ بولنا چاہتے ہیں مگر بول نہیں پا رہے۔

”آپ بولیں.....! میں سننے کے لیے بے قرار ہوں، اب تو چپ کا قفل توڑ دیں پلیز.....! بولیں.....! میں..... میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گا جب تک..... اسد.....! ڈاکٹر کو بلاؤ۔“

غزین آفاق صاحب کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اتنی زور سے دھاڑا کہ ڈرائیونگ روم میں بیٹھے ڈاکٹر اور اسد بھاگے آئے۔

”اوہ نو.....! ابھی تو اسٹبل تھے۔“ ڈاکٹر نے فوری طور پر ان کو آکسیجن لگا دی۔

”دوسروں کو مضطرب اور بے قرار رکھنے والے خود اسٹبل کیسے رہ سکتے ہیں.....؟“

غزین کی شدید محبتوں کی شیرینی میں زہر گھل رہا تھا۔ اسد نے اسے گھورا مگر ڈاکٹر کتنی دیر آفاق صاحب کو سنبھالنے میں لگے رہے۔

”ناؤ ہی از اسٹبل.....! لیکن میں پریشان ہوں غزین میاں.....! کہ ابھی چیک آپ کے دوران مجھے..... ایسا فیل نہیں ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے، یوں اچانک ان کی طبیعت کا بگڑ جانا، اپنی ویز.....! ابھی تو ٹھیک ہیں اگر پھر خدا نخواستہ طبیعت خراب ہو تو موبائل پر.....“

”ڈاکٹر صاحب.....! یہ ایسی کنڈیشن میں کتنا جی سکتے ہیں.....؟ میرا مطلب ہے کب تک سرواؤ کر سکتے ہیں.....؟“

اسد کی ساری بے چینیاں، بے قراریاں، خوف، خدشات اس کی زبان سے الفاظ میں ڈھلے تو ڈاکٹر خاصی عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

”غزین میاں.....! کبھی کبھی آپ کی باتیں مجھے حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ آپ اگر ڈاکٹر نہ ہوتے



میں مدھوش رہنا چاہتا تھا اسد.....! پھر ایسا کیوں کیا انہوں نے.....؟ میری سوچ تو ان سے شروع ہو کر ان پر ختم ہوتی تھی پھر..... پھر انہوں نے مجھے بے دردی سے سوچ کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے تنہا کیوں چھوڑ دیا کہ مجھے نہ کوئی کنارہ ملتا ہے نہ کرن نظر آتی ہے.....؟ کیوں.....؟ کیوں پاپا.....! آپ نے ایسا کیا.....؟“

وہ بے قرار سا اسد کے شانے سے لگا شدتوں سے روئے گیا۔ وہ کتنا بے قرار اور بے چین تھا اس کی ہر ہر حرکت سے لگ رہا تھا۔ اسد نے پیار سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

”غزین.....! اللہ مالک ہے ناں، معجزات بھی تو ہوتے ہیں ناں، اللہ کی طرف سے دیکھنا انشاء اللہ اکل ٹھیک ہو جائیں اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ٹھنڈی پھوار کی طرح اسد کی یہ تسلیاں کبھی کبھی مٹی کا تیل ثابت ہوتیں کہ پڑتے ہی آگ بھڑک اٹھتی اور اس وقت بھی وہ اسے پرے دھکیل کر جھٹکے سے اٹھا، چہرہ رگڑا اور شدید سردی میں بھی فل پٹکھا کھول کر نیچے کھڑا ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر اسد کی طرف مڑا۔

”اسد.....! میں اس دنیا میں صرف ان کو جانتا تھا، ان کو پہچانتا تھا پھر انہوں نے خود ہی مجھے اور راستے پر ڈال دیا تو اب یہ میرا انتظار کریں میرے لوٹ آنے کا، اب تو میں خالی ہاتھ واپس نہیں آؤں گا، ان کو بولنے کے لیے کسی اموشنل ایک کی ضرورت ہے ناں.....؟ تو اب ایسا ہی ہوگا، ان کو ایسا صدمہ پہنچاؤں گا کہ یہ بول اٹھیں گے۔“

غزین کی آنکھیں نامعلوم عزائم سے چمک اٹھیں۔ زور سے ہاتھ پر مکا مارا تو اسد سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔

”جیسا تم سوچ رہے ہونا غزین.....! اس سے تم سب کچھ گنوا دو گے۔“

”ہونہہ.....! تو ابھی میرے پاس کیا ہے.....؟ خالی دامن.....؟ خالی ہاتھ.....؟“

”یہ تمہارا جذباتی پن ہے۔ ابھی وقت اور حالات کی لگاتار ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر عقلمندی کا ثبوت وہ تو خالی دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔ جو تم نے سوچا ہے اور جو کرنا چاہتے ہو وہ کسی طرح مناسب نہیں۔“

”پلیز.....! پلیز اسد.....! میری زندگی کا یہ وہ معاملہ ہے جس میں مجھے نہ سمجھنا ہے مشورے کی ضرورت ہے اور نہ ہی رائے کی اور اب پلیز.....! مجھے نہیں روکنا، اس لیے کہ اب میں وہ کروں گا جو میں نے سوچ رکھا ہے کیونکہ میں دوہری زندگی، دوہرے احساس کے ساتھ جی جی کر تھک گیا ہوں۔ پلیز.....!“

غزین نے یہ سب کہتے ہوئے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا کیونکہ دونوں کی دوستی ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے یوں جھٹکے سے ایک بل میں اپنی زندگی سے نکال باہر کرتا۔ اس کے الفاظ کی برچھیاں اسد کے دل کے آ پار ضرور ہو گئی تھیں مگر بے لوث تعلق کی بنیادیں اتنی کمزور نہیں ہوتیں کہ ذرا سی بات پر ڈھسے جائیں وہ غزین کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھا اور آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”یہی بات اگر جرات ہے تو میری آنکھوں میں دیکھ کر کہہ دو، قسم کھاتا ہوں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔“

”تم جانتے ہونا میں یہ سب نہیں کر سکتا اس لیے پلیز.....! مجھے جو کرنا ہے کرنے دو کیونکہ اس کے بغیر

اب کوئی چارہ نہیں۔ پلیز.....!“

غزین اسے دیکھے بغیر بولتا ہوا باہر نکل گیا اور اسد ہلتا پردہ دیکھتا رہ گیا۔

•••

”بھابھی جان.....! غزین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے.....؟“

شہلا کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ ارمغان علیزہ کو چاہتا ہے اور غزین وردہ کے چکروں میں ان کے ہاں آتا ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی سے وردہ کے حوالے سے غزین کو سوچنے لگی تھیں مگر پہلا مرحلہ تو عفت بیگم کو منانا تھا جو کہ وردہ کے علاوہ کسی اور کو بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔

”ہاں.....! بہت اچھا لڑکا ہے، خاندان بھی اچھا ہے اگر ہمارے گھر کی کسی لڑکی کا نصیب اس سے جڑ جاتا ہے تو جانویہ ہماری خوشی قسمتی ہے۔“

”ہوں.....! تو اس کا مطلب ہے اس کے بارے میں آپ کی بھی وہی رائے ہے جو میری ہے۔“ شہلا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

”ہاں.....! ہے تو مگر ایک عجیب سی بات ہے کہ خود تو وہ اتنا آگے بڑھ گیا ہے مگر اس نے کبھی اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں بس یہی بات کہتی ہے۔“ عفت نے اپنا خدشہ ظاہر کر دیا تو شہلا بھی جو کہ اس پہلو پر بار بار سوچ چکی تھیں، پر خیال انداز میں بولیں۔

”بات تو آپ کی درست ہے بھابھی جان.....! مگر وہ کہتا ہے کہ اس کا صرف باپ ہی ہے۔“

”ہاں.....! تو باپ ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے گھر کی کسی لڑکی کا طلبگار ہے تو اسے اپنے والد کو ہمارے گھر لانا چاہیے یا ہمیں ان سے ملوانا چاہیے۔ ہم ایسے ہی تو اپنی کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ رخصت کرنے سے رہے.....؟“

”ویسے بھابھی جان.....! آپ کا کیا خیال ہے غزین کو ہماری کون سے لڑکی پسند آئی ہوگی.....؟“ شہلا نے کچھ چور سے لہجے اور کن آنکھوں سے ان کو دیکھا جو وردہ پر اپنا اتنا حق سمجھتی تھیں کہ ارمغان کے علاوہ وردہ کا نام بھی کسی اور کے ساتھ نہیں سن سکتی تھیں اور آج غزین کا ذکر چھیڑنے کا ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ عفت کو اصل حقیقت بتا دی جائے کہ نہ وردہ ارمغان کو پسند کرتی ہے اور نہ ہی ارمغان وردہ کو اس حیثیت سے پسند کرتا ہے۔ وہ خود تو جانتی تھیں کہ غزین وردہ کے چکر میں ہے اور کبھی ان کو وردہ بھی اس سے متاثر نظر آتی تھی اس لیے اب وہ چاہتی تھیں کہ عفت بھابھی سے علیزہ اور ارمغان کی بات کر دی جائے اور اس کے لیے انہوں نے بڑے طریقے سے بات شروع کی تھی۔

”بھئی.....! اب مجھے الہام تو ہوتا نہیں کہ پتہ چل جائے وہ کس لڑکی کے لیے آتا ہے.....؟ اتنا یقین ہے کہ وہ ہے اسی گھر کی کسی لڑکی کے چکر میں..... ویسے لڑکا بڑا خوبصورت اور قابل ہے۔ یوں تو ہماری کسی بھی لڑکی سے ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”اور اگر اس کی نظریں وردہ پر ہوئیں تو.....؟ وہ..... میرا مطلب ہے بھابھی جان.....! دونوں ساتھ پڑھتے ہیں، انڈر اسٹینڈنگ تو ہو جاتی ہے ناں.....؟“



عفت مشکوک ہو کر ان کے قریب آگئیں۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو.....؟ میرے ارمغان میں کیا کمی ہے.....؟“

عفت کمر پر ہاتھ باندھے لڑا کا انداز میں غرائیں تو شہلا کو ہنسی آگئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

”صرف سینگوں کی.....!“ وہ بھی اسی انداز میں ہنسیں۔

”سینگوں والا گدھا تو تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔“

”بھابھی جان.....! آئیے یہاں بیٹھئے میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ شہلا نے بھابھی کا انداز اور غصہ بھابھی

لیا تھا۔ وہ ان کی خواہش کو بھی بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔

”شہلا.....! وردہ پر پہلا حق میرا ہے، میں دیکھ رہی ہوں جب سے یہ باگڑ بلا جیسا غزین تمہاری نظروں

میں چچا ہے تمہارے انداز ہی اور سے اور ہونے لگے ہیں۔ مگر یاد رکھو میں تمہیں اپنے بیٹے کا حق مارنے نہیں دوں

گی۔“ عفت نے بڑے بڑے انداز میں دھمکی دی۔

”پیاری بھابھی جان.....! یہ آپ نے کیسے جان لیا کہ ارمغان ہے بڑھ کر مجھے کوئی اور ہو سکتا

ہے.....؟ ارمغان پہلے بعد میں کوئی اور لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ علیزہ اور وردہ میری آنکھوں کے تارے

ہیں، میں دونوں کو ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتی ہوں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ غزین اور ارمغان کو میرا داماد

بنادے تو میں خود کو کتنا خوش نصیب تصور کروں گی۔“

شہلا آہستہ آہستہ اپنے اصل مقصد پر آگئیں۔ اب عفت کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔

”ہاں.....! تو پر اہم کیا ہے.....؟ غزین اچھا لڑکا ہے، اس کے والد سے ملنے ہیں اور علیزہ کا رشتہ اس

سے طے کر دیتے ہیں۔ یوں علیزہ اور غزین کی جوڑی بن جائے گی، ارمغان اور وردہ کی، کیوں.....؟ ماشاء اللہ

جب ان چاروں کی تصویر بنے گی تو زندگی کا فریم کتنا حسین لگنے لگے گا۔“

اپنی خواہش کے اوٹ میں عفت خیالوں ہی خیالوں میں غزین اور علیزہ، وردہ اور ارمغان کو ڈالیں دو لہا

کے روپ میں دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ شہلا نے ان کے روشن چہرے کو دیکھا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”جی بھابھی.....! زندگی کا فریم اسی وقت حسین لگ سکتا کہ جب خوشی کے پھولوں سے مہک رہا ہو۔ اچھا

چلیں اک بات بتائیں کہ کوئی بھی ماں وہ میں ہوں یا آپ ہوں، اپنی بیٹی یا بیٹے کی آنکھوں میں عجز بھری

آنسو بھر سکتی ہے.....؟“

”خدا نہ کرے شہلا.....! دنیا میں ایسی کون سی ماں ہو سکتی ہے جو اپنی اولاد کو آنسو دے.....؟ ارے.....!

مائیں تو اولاد کی خوشی کے لیے اپنی زندگی تک قربان کر دیا کرتی ہیں۔“

”ایسا ہے تو بھابھی جان.....! آپ ارمغان کو ناخوش کیوں کرنا چاہتی ہیں.....؟ اس کی آنکھوں میں

آنسو کیوں بھرنا چاہتی ہیں.....؟“ اب شہلا کھل کر بولنے لگی تھیں۔

”شہلا.....! یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے.....؟ کتنی مہل باتیں کر رہی ہو.....؟ صاف صاف کہو کیا بات

ہے.....؟“ عفت نے گھبرا کر کہا۔

”خفا تو نہیں ہوں گی.....؟“

”نہیں.....! میں خفا کیوں ہونے لگی.....؟ اگر تم ایسی بات کہہ رہی ہو تو یقیناً پس پردہ کوئی نہ کوئی کہانی تو

ہوگی.....؟“ عفت الجھ سی گئیں۔

”صرف کہانی نہیں بھابھی.....! لو اسٹوری کہیے۔ اس روز وردہ نے آپ سے کہا تھا ناں کہ آپ اس کو

اپنی بیٹی بنالیں، اس نے بیٹی پر بہت زور کیوں دیا تھا.....؟“

”ارے بھئی.....! نہیں معلوم کیوں زور دیا تھا.....؟ ایک تو تم ماں بیٹیاں اتنی گھنی ہو کہ حد نہیں۔ اب

ہانے کیا کچھ دل میں لیے بیٹھی ہو تم دونوں.....؟ کہہ ہی دو.....!“

عفت اپنے انداز میں اس سے خفا ہوئیں تو شہلا کو پھر ہنسی آگئی۔

”ہم ماں بیٹی کے دل میں کچھ نہیں ہے بھابھی جان.....! دل میں تو ہے آپ کے بیٹے کے میری بیٹی علیزہ

کی محبت.....!“

”کیا کیا.....! یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟ ذرا پھر سے کہنا.....!“ عفت کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔

”میری پیاری بھابھی.....! آپ کا لڑا بیٹا بچپن ہی سے علیزہ کو چاہتا ہے اور کچھلی بار جب وہ آیا تھا تو

اس نے وردہ کو بتایا، وردہ نے مجھے بتایا اور میں آج آپ کو بتا رہی ہوں۔ اب آپ بھائی جان کو بتائیے گا بھائی

جان خاندان بھر کو بتائیں گے اور.....“

”ارے.....! بس کرو یہ بتاتی رٹ، ایسا نہیں ہو سکتا۔“

عفت کے لیے یہ بات خاصی شاکنگ نیو تھی۔ علیزہ وردہ سے زیادہ خوبصورت تھی مگر اپنی بددماغی کی وجہ

سے ذرا نا پسندیدہ فہرست میں تھی اور کچھ شروع سے انہوں نے وردہ کو اس حیثیت سے پسند کیا تھا۔ اب اچانک

علیزہ، وہ اس وقت عجیب سی کیفیت کا شکار تھیں۔ اب بات بھی ان کے اپنے بیٹے کی پسند کی تھی، وہ نہ تو شہلا سے

خفا ہو سکتی تھیں نہ کچھ کہہ سکتی تھیں، بس جھنجھلا کر رہ گئیں۔ شہلا گہری نظروں سے ان کو دیکھتی رہیں۔

”اس..... اس خبیث نے مجھے کیوں نہیں بتایا.....؟“

وہ غصے اور الجھن میں کمرے کا طواف کرنے لگیں۔ ایک بار تو کارپٹ میں پاؤں الجھ کر گرنے بھی لگیں تو

شہلا نے بڑھ کر تھام لیا۔

”اللہ.....! ابھی گر جاتیں بھابھی جان.....! ہاں.....! آپ نے پوچھا کہ اس خبیث نے آپ کو کیوں

نہیں بتایا.....؟ اب آپ کو کیسے بتاؤں.....؟ کیونکہ لفظ ”بتا“ سے آپ کو چڑ ہے۔“

”اچھا.....! زیادہ شوخ بننے کی ضرورت نہیں۔ جب بچپن ہی سے میں وردہ کو اس حیثیت سے چاہتی

ہوں تو اس کے دل میں اس بددماغ، خوبصورت بلا کی محبت کیسے اتر آئی.....؟“ غصے میں اپنے احساسات اور

ہزبات کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ بھی ان کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔

”اب بھابھی.....! دل ارمغان کا ہے، پسند اس کی، محبت اس کی۔“

”بیٹی تو تمہاری ہے ناں.....!“ عفت غصے سے پٹکیں۔

”ہاں.....! تو میری بیٹی علیزہ کو اپنی بہو بنالیتے ناں بھابھی جان.....!“



شہلانے بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں بازو ڈال کر ان کی پیشانی پر پیار کر لیا تو وہ جو اندر سے ابھی خاصی ہرٹ ہوئی تھیں، ایک مدت تک انسان جس کو چاہے، پسند کرے، حاصل کرنا چاہے، وہ نہ ملے تو ہرٹ ہوا تو فطری عمل ہے، وہ کچھ اداس سی ہو گئیں۔

”سوچوں گی.....!“ ان کا لہجہ ڈب گیا کیونکہ علیزہ ان کے بیٹے کی محبت تھی۔

”اے بھابھی جان.....! میری علیزہ جس کے اب تک بے شمار پر پوز لڑ آ چکے ہیں، آپ اس کے لیے سوچیں گی.....؟“

”اور وہ گھٹی وردہ کہاں ہے.....؟ اس کی اس بارے میں کیا رائے ہے.....؟“

”اس کی رائے آپ کو اس بات سے معلوم نہیں ہوتی کہ اس نے کہا تھا کہ ماما آپ مجھے اپنی بیٹی

لیں۔“

”تو وردہ کی بات کا یہ مطلب تھا.....؟ پھر کہوں گی کہ تم ماں بیٹی بہت گھٹی ہو مگر وہ جو دوسری ہے، وہ تو

میرے بیٹے کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔“ عفت برہی سے بولیں، وہ عجیب کیفیت کا شکار تھیں۔

”میری بیٹی کو چھوڑیے وہ دیکھے نہ دیکھے، آپ کا بیٹا تو اس کو دیکھ کر جیتا ہے ناں.....؟“

”ارے.....! اس چغند کو آنے تو دو.....! ٹھیک کر دوں گی۔“

”بھابھی جان.....! اب ذرا ہم گروپ فوٹو کی ترتیب بدلیں تو کچھ یوں ہوگی۔ غزین اور وردہ، ارمغان

اور علیزہ۔ ذرا چشم تصور سے دیکھئے کتنا خوبصورت گروپ فوٹو بنائے۔ ماشاء اللہ.....!“

شہلانے بڑے لاڈ سے کہا تو عفت جواب کافی حد تک سنبھل چکی تھیں، یوں بھی علیزہ بھی بہترین لڑکی

تھی، سب سے بڑھ کر ان کے پیارے بیٹے کی چاہت تھی، کچھ دیر وہ منصوبی خفگی سے شہلا کو گھورتی رہیں پھر ان کے گلے جا لگیں۔

”ماشاء اللہ.....! اللہ اس گروپ کو نظر بند سے بچائے۔“

”آمین.....!“ شہلا کے دل پر سے منوں بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھیں۔

”ارے ارے.....! غالباً عید کو گزرے ایک ماہ ہونے لگا ہے اور آپ لوگ اب عید مل رہے ہیں.....؟

لیجئے ماما.....! میں آپ کی پسند کی چائے اور پکڑے بنا کر لائی ہوں۔ آئیں ناں ماما.....! آپ بھی۔“

وردہ ٹرے سجا کر لائی تو دونوں خواتین بغل گیر ہو چکی تھیں۔ اس نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا اور میز پر

چیزیں لگانے لگی تو عفت ناراضگی سے اسے گھورنے لگیں۔ وردہ نے پہلے تو خوفزدہ سی نظر عفت پر ڈالی، پھر سوالیہ

نظروں سے شہلا کو دیکھنے لگیں جن کے ہونٹوں پر بڑی خوشگوار مگر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”ماما.....! خیریت تو ہے ناں.....؟ آ..... آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں.....؟“ تب شہلا نے

وردہ کو ساری بات بتادی۔ وردہ کی گردن عفت کے سامنے جھک گئی۔ وہ ندامت سے ان کی گود میں سر رکھ کر

پڑی۔

”سوری.....! سوری ماما.....! میں آپ کو ہرگز ہرٹ نہ کرتی، صرف اور صرف آپ کی محبت میں نہ

چاہتے ہوئے ارمغان کو قبول کر لیتی مگر ارمغان کو شروع سے علیزہ پسند ہے اور ماما.....! علیزہ تو بہت پیاری

ہے، بہت اچھی ہے، مجھ سے بھی زیادہ اور ویسے آپ بالکل ماؤں جیسی اچھی ہیں اور میں آپ کی بیٹی بن کر رہنا چاہتی ہوں۔“

بولتے بولتے وہ ایک بار پھر ان کی دل آزاری کے خیال سے رو دی تو انہوں نے اسے ساتھ لگایا اور کتنی دیر پیار کرتی رہیں۔

”یہ محبتوں کے بھی بڑے عجیب سلسلے ہوتے ہیں بیٹا.....! جانے کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور جانے

کہاں ختم ہوتے ہیں.....؟ اور پھر یہ تو زندگی کا سفر ہے جس میں لڑکے لڑکی دونوں کی رضا مندی اور خوشی ہونی

چاہیے، دوسرے رشتے تو ان کی خوشی دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اور پھر علیزہ کون سی پرانی ہے.....؟ میری اپنی بیٹی

ہے۔“

اور پھر عفت کتنی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ شہلا کا بوجھ تو پہلے ہی ختم ہو گیا تھا اب وردہ بھی خود کو بہت

خوش اور مطمئن محسوس کر رہی تھی مگر وردہ کو جو بات چھپی تھی وہ اس کا نام غزین کے ساتھ لیا جانا تھا۔

”ماما.....! آئی ایم ان شاک کہ آپ نے میرے نام کے ساتھ غزین کا نام لیا بھی کیسے.....؟“ شدید

ضبط سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور آواز ہزار آداب کا خیال کرتے ہوئے بھی ذرا بلند ہو گئی تو شہلانے اس کے

چہرے پر آئے بالوں کو بڑے پیار سے مٹایا اور بڑے خوش انداز میں بولیں۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر غزین کا نام تمہارے نام کے ساتھ لیا ہے۔ اب تمہاری باری ہے، سوچ لو۔“

وہ اسے سوچ کے نئے راستے پر ڈال کر عفت کے ساتھ آگے بڑھ گئیں تو وہ گھوم کر رہ گئی۔

”ڈراے باز نے بلا آخر اپنا رنگ جما ہی لیا کہ ماما جوتی سمجھدار اور محتاط عورت ہیں، وہ بھی اس کے چکر

میں آگئی ہیں۔“

اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی غزین اس کی سوچ کے آسمان کا چاند بن گیا جس کی کرنیں دور اندر تک اتر

گئیں۔

”ہاں.....! ایسا ہونا کوئی انہولی بات تو نہیں مگر..... مگر میں اس بہروپے پر کیسے اعتبار کر لوں.....؟

لومڑ.....! اول درجے کا ہے۔“

وہ ہر انداز میں اسے سوچ رہی تھی اور اسی دوران اس نے اپنی چوری بھی پکڑی تھی کہ دل کے کسی کونے

میں کہیں نہ کہیں غزین کا خیال موجود ضرور ہے۔

”کیا مشکل ہے.....؟ اس بد تمیز کا خیال سایہ بن کر رہ گیا ہے میری ہر سوچ کا۔ ہاں اگر ایسا ہو جائے تو

ایسا کچھ برا بھی نہیں۔“ اندر جانے کون سی دبی چھپی غیر مانوس سی خواہش ڈرتے ڈرتے مسکرائی تو اس نے سر

دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”اُف.....! یہ شخص.....؟“ وہ جیسے ہارتے ہوئے دھیرے سے بولی۔ اُٹھنے ہی والی تھی کہ فون کی بیل

گونجی۔

”کہیں اس کا تو فون نہ ہو.....؟“ فون تک جانا تھا اس خیال نے روکا مگر مسلسل بیل نے ریسیور ہاتھ

میں تھما دیا۔



”کیا ہو رہا تھا وردہ وجاہت.....!“ دوسری طرف غزین بول رہا تھا۔ ماما کی بات سن کر اس نے اسے اٹھانے کا سوچا تھا کہ اب اس کی آواز سے جلتی رنگ سے گونج اٹھے تھے اندر کہیں۔

”ارے ڈاکٹر صاحبہ.....! کہاں کھو گئیں.....؟“ فحاشی کہ اتنے دنوں بات کی نہ ملاقات یا شکوے کے لیے الفاظ تلاش کیے جا رہے ہیں.....؟“

وہ حسب عادت شوخیاں لیے اسے چھیڑ رہا تھا۔ اس کی اسی بات سے وہ بہت دُور جاتے جاتے ایک دم لوٹ آئی۔ چہرے پر سختی اور لہجے میں کڑک آگئی۔

”مسٹر غزین.....! آپ ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر کو اس قسم کی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے آپ سے بات کرنا ہی گوارہ نہیں تو.....“

وردہ اتنی سی دیر میں جانے خود کو کتنا لعن طعن کر گئی کہ کیوں کمزور ہو کر جھٹ غزین کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جبکہ وہ تو اس قابل ہی نہیں کہ ایک لمحہ بھی اس کے بارے میں سوچا جائے۔

”اُف.....! اتنی ناراضگی.....؟ لگتا ہے گھر آ کر مانا پڑے گا.....؟ اوکے.....! جسٹ ویٹ آئی دل کم.....!“

”آپ.....! آپ ہر گز نہیں آئیں گے ہمارے گھر.....!“ اس نے سختی سے منع کیا۔

”کیوں.....؟“ کر فیلوگ ہوا ہے آپ کے علاقے میں.....؟“ اس نے چڑایا۔

”جہاں آپ جیسے آئیں گے وہاں کر فیلو بھی لگ سکتا ہے.....“

”اجی کہاں کہاں کر فیلو لگائیے گا.....؟ اپنی آنکھوں پر.....؟ اپنے دل پر.....؟ اپنے گھر پر.....؟“ وہ مستقل چڑانے کے موڈ میں تھا۔ وہ سلگ ہی تو اٹھی اور ماما کو دینے کے لیے اس نے کھرا جواب بھی سوچ لیا۔

وردہ، ناجیہ کے گھر جانے کو تیار ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی پہنچ جائے گا اور وہ اتنی دیر میں غائب ہو جانا چاہتی تھی، اسے اہمیت دینا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اسے تیار ہونا دیکھ کر شہلا نے ہجرت سے پوچھا۔

”وردہ.....! یہ..... یہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے.....؟ کہیں جا رہی ہو.....؟“

”جی ماما.....! ناجیہ کے گھر جا رہی ہوں، کئی دنوں سے اس نے بات بھی نہیں کی۔ سوچا تو رہی ہوں.....؟“

گے اور پھر کانو وکیشن ہونے والا ہے ذرا ڈسکشن ہو جائے گی۔ ماما.....! میں گاڑی لے جاؤں.....؟“

”آپی.....! میں بھی چلوں.....؟“ وہ جلدی سے گاڑی کی چابی لے کر نکلی تو سامنے سے ہنی آگئی۔ اسے جتنی جلدی تھی ہنی نے اتنا ہی کام لٹکا دیا۔

”ہاں.....! چلو آؤ.....!“ اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔

”جسٹ اے منٹ آپی.....! میں ابھی آئی ذرا اس کے ساتھ کا دوپٹہ لے آؤں۔“ ہنی جو انٹر کے ایگزٹرز دے کر بیٹھی تھی، بھاگتی ہوئی اندر گئی تو وردہ جھنجھلا کر رہ گئی۔

اس نے فل پاور سے ہارن دیا اور گاڑی ریورس کرنے لگی۔ باہر سے آتی غزین نے کمال ہوشیاری سے گاڑی اس کی گاڑی کے بالکل سامنے روک دی۔

”اودہ نو.....! ٹپک ہی پڑا منخوس آدمی.....! ہنی.....! تمہیں نہیں بخشوں گی۔“

اس نے غصے سے اسٹیرنگ پر مکا مارا۔ غزین اسے گاڑی میں دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سے فرار ہو کر باہر ہی تھی۔ اس کی یہ ادا اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ بکسیر گئی۔ وہ گاڑی کو ایک سائیڈ پر لگا کر باہر آ گیا۔

وردہ نے سائیڈ مرر سے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ لیے آتے ہوئے غزین کو دیکھا تو دل جل کر راکھ ہو گیا۔ اس کو اس کی اسی جلانے والی مسکراہٹ ہی سے تو نفرت تھی۔ قریب تھا کہ وہ اتر کر اندر جاتی، وہ کھڑکی میں جھکا اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”سنا تھا عورت اچھی ڈرائیور نہیں ہوتی مگر آج دیکھ بھی لیا۔“

وہی دل جلانے والا انداز، لہجہ اور مسکراہٹ۔ وردہ نے متاثر ہوئے بغیر جھٹکے سے دروازہ اس طرح کھولا کہ اس کا ہینڈل غزین کے سینے پر جا کر لگا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا، اسے چوٹ لگی ہے اتنا احساس وردہ کو بھی ہو گیا تھا مگر وہ لا پرواہی کا مظاہرہ کرتی ہوئی باہر نکل کر اندر کی طرف بڑھنے لگی تو وہ پھرتی سے چلتے چلتے اس کے سامنے آ گیا اور کچھ دیر اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا۔

”میدان چھوڑ کر فرار ہونے والے لوگوں کو دنیا بزدل کہتی ہے۔“

غزین نے براہ راست اس کے فرار ہونے پر چھوٹ کی تو وہ جھوٹی ہو کر بھی بل کھا کر پلٹی۔

”ہونہہ.....! میں اور آپ سے فرار ہوں گی.....؟ ایک سکیوڑی.....! مردوں کو خوش فہمی سوٹ نہیں کرتی، آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں کہ میں وردہ وجاہت آپ سے فرار ہونے لگوں گی.....؟ میں تو ناجیہ کے پاس ضروری کام سے جا رہی تھی۔“

وہ بتانا تو نہیں چاہتی تھی مگر اس کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے اس نے جھوٹ بول دیا تو ایک شوخ جاندار نقبہ آزاد فضا میں پھیل گیا۔ وہ راکھ ہو گئی۔

”ناجیہ.....! وہ ناجیہ جو آپ کی بیسٹ فرینڈ ہے.....؟“

وہ خامسے تمسخرانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”جی.....!“ وردہ نے خوشخوار نظروں سے اس وجہہ شخص کو گھورا اور پاؤں میخ کر آگے بڑھنے لگی تو غزین کے اگلے چلنے سے جیسے قدموں میں زنجیر ڈال دی۔

”اچھا.....! ویسے سنا ہے بیسٹ فرینڈ کی ہر بات دوسرے دوست کو پتہ ہوتی ہے پھر نجانے آپ دونوں میں کیسی دوستی ہے کہ آپ کو یہ خبر نہیں کہ آپ کی عزیز از جان دوست ناجیہ اپنی فیملی کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے گئی ہوئی ہے.....؟“

”اودہ.....! ناجیہ کا نام لیتے ہوئے میں یہ بات کیوں بھول گئی.....؟“

مارے ندامت کے اس کی ہتھیلی پر نمی اتر آئی مگر چہرے پر ڈھٹائی کی فضا چھائی رہی۔

”معلوم ہے مجھے کہ وہ پاکستان میں نہیں ہے۔“ وہ آگے بڑھی تو وہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔

”اچھا.....! تو آپ کو یہ معلوم ہے.....؟ تو کیا آپ کو ناجیہ سے اتنا ضروری کام تھا کہ اس کے پیچھے سعودیہ جانے لگی تھیں.....؟“



اس کا لہجہ، اس کے الفاظ جان جلا رہے تھے اس کی۔ ایک تو اس کا سامنا اوپر سے جھوٹ کا مکمل ہوا۔ عجیب! لکھن اور کھیاہٹ کا شکار تھی مگر وہ اس سب کا اظہار اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
”میں کچھ بھی کروں، کہیں جاؤں، آؤں، آپ سے مطلب.....؟“ وہی کھوکھلی سی ڈھٹائی جو غزین نے چھیڑنے کا موقع فراہم کر گئی۔

”ویسے حقائق تسلیم کر لیں، ہار مان لینا بھی بہادری ہوتی ہے۔“

”تو میں کیا کروں.....؟“ وہ کترا کر گزرنے لگی تو غزین نے بازو سامنے کر دیا۔

”تو یہ کیجئے کہ آپ بھی مان لیجئے کہ آپ شروع ہی سے مجھ سے متاثر تھیں، متاثر ہیں اور رہیں گی.....؟“

بات گو کہ دل پر جا کر لگی تھی، یہ بات تو اس نے چپکے سے مان بھی لی تھی کہ ایسا ہی کچھ ہے مگر عجیب ہر ڈھٹائی بھی جواب بھی اتر رہی تھی۔

”اُف تو بہ..... اتنی خوش فہمی.....؟ آپ کو کون ڈاکٹر کہہ سکتا ہے.....؟“

”اجی ہم ڈاکٹر ہیں یا نہیں، اسی ثبوت کے لیے تو کالج والے دور روز بعد کانفرنس کر رہے ہیں تب آپ کیا، ساری دنیا ہمیں ڈاکٹر مان لے گئی۔“

وہ اس کے قریب جھکا کہہ رہا تھا، وہ پہنکار کر آگے بڑھی تو سامنے سے ہنی آگئی۔ ہوا میں دو پشہراتی وردہ اسے دیکھ کر کھول اٹھی۔ اسی کی وجہ سے وہ وقت پر نکل نہیں سکی تھی اور اس بدتمیز آدمی کے ساتھ بحث کرنا پڑی۔

”ارے..... غزین بھیا.....! آپ.....؟ السلام علیکم.....!“

”یہ جادوگر تو چھا گیا ہے میرے گھر والوں پر۔ ماما اور ہنی تو اسے دیکھ کر دیوانے ہو جاتے ہیں۔“  
ہنی کا دلہانہ پن دیکھ کر وہ جل گئی جو بڑی گرم جوشی سے غزین کو سلام کر رہی تھی۔ جواباً غزین نے بھی بزرگانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”وعلیکم السلام.....! جیتی رہو گڑیا.....! کہیں جانے کی تیاری لگ رہی ہے.....؟“

غزین نے کن آنکھوں سے وردہ کو دیکھا جس کی شفاف پیشانی پر پتل اُجھرائے تھے۔ وہ مظلوم ہوا۔

”جی.....! ذرا آپ کی بات ساتھ جا رہی تھی۔“ ہنی نے دو پٹہ شانوں پر پھیلا دیا۔

”ہوں.....! اچھا.....! ویسے تمہاری آپنی تو ایسے کسی موڈ میں نظر نہیں آرہی۔ ہو سکتا ہے ہمیں دیکھ کر کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو.....؟“

وہ براہ راست اس کو دیکھتا چوٹ کر گیا۔ قریب تھا کہ وہ پھٹ پڑتی۔

”السلام علیکم آنٹی.....!“ وردہ جو شدید غصے سے بات کہہ نہیں پاتی تھی کہ سامنے سے شہلا بیگم آگئیں۔ غزین نے ہاتھ اٹھا کر وردہ کو روکا تو بے ساختہ وردہ کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

”وعلیکم السلام بیٹا.....! جیتے رہو.....! کہاں رہے اتنے دن.....؟ کوئی خبر نہیں۔ چلو اندر آؤ، ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔“

شہلا جس محبت، جس گرم جوشی سے غزین سے ملی تھیں اور جس سعادتمندی کا وہ مظاہرہ کر رہا تھا وہ وردہ کی جان جلانے کے لیے کافی تھا۔

”بدتمیز.....! بہرہ پیا.....! چھٹائی چلا جا رہا ہے۔“ شہلا نے اسے اچھی چائے بنانے کا آرڈر دے دیا۔ غزین اس کی حالت سے مظلوم ہوتا اندر جا بیٹھا تھا اور وردہ سارے ملازموں کو کوستی چائے بنانے لگی جو ایک دم غائب ہو گئے تھے۔

اندر کیا کچھڑی پک رہی ہے وردہ نہیں جانتی تھی۔ اسے تو یہ فکر تھی کہ وہ اس کی سیدھی سادی ماں کو اپنی باتوں میں الجھا رہا ہے اور اسی سلگتے خیال کے ساتھ اس نے چائے اس کے سامنے لا پٹی۔ غزین اس کی اس بچگانہ سی حرکت پر زیر لب مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ..... یہ کہاں لوٹا بیٹا.....!“

”شکریہ آئی.....! بس چائے ہی لوں گا۔ آج دوستوں نے ڈنڈا دیا ہے تو وہاں جانا ہے، چائے لے لیتا ہوں۔“ غزین نے احسان والے انداز میں کہا۔

”ہاں.....! چائے ضرور لو، میری وردہ جیسی لذیذ چائے کوئی نہیں بنا سکتا۔“

شہلا نے ممتا بھری نظر وردہ پر ڈالی جو ہر ملی نظروں سے غزین کو دیکھ رہی تھی جس نے بڑا سا گھونٹ لیا تو جیسے جلن زبان سے ہوتی ہوئی دل جو جگر جلا گئی۔ وردہ نے مارے نفرت کے اس کی چائے میں گرم مسالا ڈال دیا تھا۔ غزین کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا، غزین پر کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ وردہ اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ وہ چاہتا تو شہلا پر اس کا راز فاش کر کے اسے شہلا سے ڈانٹ پڑا سکتا تھا مگر اسے یہ چھوٹا پن لگا۔ اس کی بہادری، مردانگی کا جو تقاضا تھا وہ اس نے پورا کیا اور ملتا ہوا گھونٹ اندر اُتار لیا۔ اسی وقت شہلا فون سننے اُٹھ گئیں تو وہ حواس بحال کرنا اس کی طرف مڑا۔

”چنان کو سوئی سے کھوٹنا اچھی خاصی حماقت ہے مس وردہ و جاہت.....! چاہتا تو آپ کو آنٹی سے ڈانٹ پڑا سکتا تھا مگر یہ بہت چھوٹا پن ہوتا جو کہ مجھ جیسے وضع دار اور شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والے مرد کو زیب نہیں دیتا۔“

وہ جلتی زبان کے ساتھ بمشکل بولا تو وہ پہنکار کر جواب دیے بغیر آگے بڑھنے لگی تو غزین کی بوجھل آواز نے قدم روک دیے۔

”کرستم پرستم اسے میرے صنم.....! تجھ کو نہ چھوڑیں گے ہم.....!“ کیا بات تھی، کتنا تضاد تھا اس شخص کے قول و فعل میں کہ کسی کچھ نظر آتا کبھی کچھ، وہ مڑے بغیر اس کی آواز کے بوجھل پن کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”اوکے آنٹی.....! میں چلتا ہوں۔ آئی ہو پ کہ آپ میری درخواست پر غور ضرور کریں گی۔“

”ہاں بیٹا.....! غور تو ضرور کروں گی بلکہ مجھے اور کیا چاہیے مگر جب تک ان کے والد آ نہیں جاتے میں اکیلے کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں۔ اب تو ہر وقت خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وجاہت جلدی سے آجائیں تو میں اپنے فرائض سے فارغ ہوں۔ اکیلے زندگی کی گاڑی چلاتے چلاتے، تنہا فیصلوں کی آگ میں جلتے جلتے میں بھی راکھ ہو گئی ہوں، اب تو بہت تھک گئی ہوں۔“ اور واقعی صدیوں کی تھکن شہلا کے لہجے میں اُتر آئی تو غزین نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”آجائیں گے انکل بھی واپس آجائیں گے..... ان کو آنا ہی ہوگا..... میرا مطلب ہے آخر کب تک وہ



آپ لوگوں سے دُور رہیں گے.....؟ چلتا ہوں آنٹی.....! کانو وکیشن پر آئیے گا ضرور، میری رشتے دار تو آپ ہیں، پاپا بیماری کی وجہ سے نہیں آسکتے مگر آپ تو آئیے گا ناں.....؟“

غزین کے چہرے پر رشتوں کی محرومی سایہ بن کر اُتری اور غائب ہو گئی۔

”ہاں بیٹا.....! آؤں گی کیوں نہیں.....؟ میرے بچوں کو کامیابی کی روشن مستقبل کی سند ملنے والی ہے تو حیات بخش منظر میں دیکھنے کیوں نہیں آؤں گی.....؟“

”تھینک یو آنٹی.....! تھینک یو سوچ.....!“ غزین نے عقیدت سے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ تو چلا گیا تھا مگر شہلا کے لیے سوچ کے دروازے کھول گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کریں۔ آج وجاہت کی یاد، ان کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس ہوئی کہ ان کا تکیہ بھیگ گیا تھا۔ زندگی کا کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب انہوں نے وجاہت کی کمی اور ضرورت نہ محسوس کی ہو، کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا تھا کہ جب انہوں نے وجاہت کے لوٹ آنے کی دُعا نہ کی ہو۔

”کوئی یوں بھی روٹھتا ہے وجاہت.....! کوئی یوں بھی کسی کی کمزوری کو اُڑاتا ہے.....؟ آجائے پلینز.....! میں اب بہت اکیلا پن محسوس کرتی ہوں۔ آج اتنی عمر آپ کے بغیر گزار کر میں مانتی ہوں کہ زندگی کی گاڑی صرف اسی صورت متوازن چل کر منزل پر پہنچ سکتی ہے کہ جب میاں بیوی مل کر اسے چلائیں، کوئی گاڑی ایک پیپے سے نہیں چل سکتی۔ وجاہت.....! میں کہیں درست اور کہیں بہت غلط تھی، خود اعتمادی کا میرا زعم غلط تھا، اکیلے رہ کر زندگی کو اس کے سارے رنگوں کے ساتھ سنوارنے کا میرا دعویٰ غلط تھا، میں نے آپ کے بغیر بڑی ایمان داری سے ایک ایک لمحہ آپ کی اولاد کے نام کر دیا مگر میرے بچے آج بھی مجھ سے بدظن ہیں کہ آپ نے مجھ سے گھر چھوڑ کر گئے۔ علیزہ تو محض آپ کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرتی ہے، باقی بچے کچھ نہ کہیں مگر میں محسوس تو کر سکتی ہوں ناں، وہ بھی اس معاملے میں مجھ سے خفا ہیں۔ آپ آجائے وجاہت.....! میں ہار مان لینے کو تیار ہوں کہ کوئی بھی عورت شوہر کے بغیر بھرپور زندگی نہ گزار سکتی ہے نہ دے سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام رشتوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنایا ہے، زندگی تو ازن کا نام ہے، عدم توازن سے گاڑی الٹ جایا کرتی ہے۔ وجاہت.....! آجائے کہ شام ڈھلنے لگی ہے، آجائے کہ اب بہت مشکل گھڑی ہے، میں بچوں کی زندگی کے فیصلے تنہا نہیں کر سکتی، ماں اور باپ دونوں ہی اولاد کے لیے ضروری ہیں۔ میرا یہ دعویٰ کہ میں سب کچھ کر لوں گی، ناں کی ہر محرومی دُور کر دوں گی، غلط ثابت ہو گیا۔ میاں بیوی مل کر ہی زندگی کے گلشن کو سجا سنوار سکتے ہیں کوئی ایک نہیں، بچوں کو ماں بھی چاہیے اور باپ بھی، آجائے پلینز.....! آجائے!“

شہلا کتنی دیر سے وجاہت کی تصویر تھا مے روئے جا رہی تھیں۔ برسوں پہلے اپنی ذات اور خوبیوں کا اعتماد آج پچھتاوے اور کمزوری کا اعتراف بنا دُعاؤں میں ڈھلا ہوا تھا۔ گزرتے وقت کے ہر پل نے ان کو وجاہت کی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور ان کے دعویٰ کو پورا قرار دیا تھا۔

غزین کے شدید اصرار پر وہ کانو وکیشن پر جانے کے لیے تیار تھیں۔ تقریب بڑی خوبصورت اور باوقار تھی۔ ڈگریاں حاصل کر کے سب نے خوب کیپ اُچھال اُچھال کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ڈگریاں حاصل کرنے والے لوگوں کی آنکھوں میں خوش آمد خواہوں کی قدیلیں روشن تھیں، ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹیں بکھری ہوئی تھیں،

ان میں سے سب کے عزیز رشتے دار والدین اپنے پیاروں کو خوش دیکھ کر اس خوشی کی ابدیت کی دُعا دے رہے تھے۔ خوشی اور رنگ کے ان لمحوں میں غزین اور وردہ اپنی اپنی جگہ اُداس تھے۔ اک عجیب بے نام سی اُداسی نے دونوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ آج نہ تو غزین نے اسے کچھ کہا، نہ کوئی چوٹ کی، نہ ہی وردہ کو وہ برا لگا بلکہ ایک دوسرے کے لیے گرم گوشہ سا ضرور محسوس کیا۔ شہلا خود بہت اُداس تھیں، بچوں کو کوئی کمزور تسلی دینے کی بجائے وہ بھیگی آنکھوں کا نظارہ رکھنے کے لیے بے وجہ ہی مسکرائے جا رہی تھیں۔ پھر ان کے دُور کے کچھ ساتھی آئے تو وہ ان کے ساتھ ماضی کی باتوں اور گلیوں کی طرف نکل گئیں۔ اب اس گوشے میں غزین اور وردہ اکیلے رہ گئے۔ غزین آج چھیڑ چھاڑ کرنے کے موڈ میں بھی نہیں تھا۔ وردہ نے ایک نظر اس پر ڈالی، سفید شرٹ اور گرے پینٹ میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا اور خود وہ خوبصورت لباس میں سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو دونوں نے خاموشی کو یو لتے سنا پھر وردہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ ماما کے پاس چلی جائے۔ وہ مڑی ہی تھی کہ غزین کی آواز کی بازگشت رنجش بن گئی۔

”ول یو میری می.....!“ اس اچانک حملے پر اس نے چونک کر غزین کو دیکھا۔ وہ سر تا پا طلبگار بنا کھڑا تھا ہاتھ بڑھائے اور وہ بری طرح بوکھلا گئی۔

”آ..... آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے.....؟“

”مجھ سے شادی کرو گی.....؟“ اب سوال اُردو میں کیا گیا۔

”کہہ دیا ناں میں اس کا بھائی ہوں۔ اب تو کوئی اعتراض نہیں آپ کو.....؟ اب تو اس سے بات کروا دیجئے.....؟“ شرجیل کا لہجہ بلند ہو گیا۔ وہ ماتم سے بات کرنے کے لیے اتنا بیقرار ہو رہا تھا کہ ایک پل بھی اب برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

”او کے بھائی صاحب.....! بلا دیتا ہوں، کالیے تو مت، ویسے آپ کو کہنا کیا ہے.....؟ ذرا سنبھل کر بات کرنا، بڑی ہی توپ چیز ہے یہ لڑکی جس کو آپ بہن بنا رہے ہو۔“

”آپ اس کو بلائیں گے یا.....؟“ شرجیل کا لہجہ کرخت ہو گیا۔ موبی کے فرشتے بھی اس کی آواز اور انداز پہچان نہیں پائے تھے۔

”بلا رہا ہوں بابا.....! لڑکیوں رہے ہو.....؟“ موبی بدتمیزی سے باز نہ آیا۔ اتفاق سے اسی وقت ماما کو ریڈور سے گزری تو ناچا جتے ہوئے بھی موبی کو اسے بلانا پڑا کیونکہ اگر نہ بلاتا تو اس صاحب کی بات اس سے ہو جاتی تو ماما یہ گستاخی اسے معاف نہ کرتی۔

”ماما.....! یہاں آؤ بھی.....! تمہارے بھائی صاحب کا فون ہے۔“

موبی کا لہجہ کتنا چڑانے والا تھا شرجیل سمجھ سکتا تھا۔ دوسری طرف ماما نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا اور موبی سے لڑ پڑی۔ بھائی کا سن کر اڑتی ہوئی اندر آئی۔

”کیا کہا.....؟ بھائی کا فون ہے.....؟ اور تم نے مجھے اب بتایا ہے.....؟“

اس کی آواز کی بیقراری شرجیل کو تڑپا گئی۔ بے ساختہ آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔



”ارے لڑکی.....! حواسوں پر قابو رکھو۔ تمہارا وہ بے بی بھائی نہیں، یہ تو کوئی مرد بھائی بات کر رہا ہے۔“  
 ”شٹ اپ موبی.....! میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔ پہلے کی طرح تمہاری وجہ سے، تمہاری اس بکواس کی وجہ سے میرا معصوم فرشتوں جیسا بھائی کہیں کھو گیا ہے۔“

موبی کی بات پر ماہم نے گلدان ہاتھ میں پکڑ لیا تو وہ ڈر کر بھاگ گیا۔ ماہم رو رہی تھی، اس کی باتوں کی آواز، سسکیوں کی آواز شرجیل کو تر پار رہی تھی، اس کی آنکھوں کے پھٹکے کناروں سے پانی باہر آنے لگا تھا۔  
 ”ہیلو ماہم.....! ماہم.....! مجھ سے بات کرو۔ ماہم.....! میں ہوں تمہارا اپنا بھائی، تمہارا شرجیل بھائی، پلیز.....! مجھ سے بات کرو، میں تمہاری آواز سننے کے لیے ترس گیا ہوں۔ ہیلو ماہم.....!“ ماہم سمجھ رہی تھی کہ جانے کون ہوگا اس لیے بات کرنے سے پہلے ریسور پر ہاتھ رکھے خود کو سنبھال رہی تھی۔ جب ذرا بہل گئی تو آواز کو نارمل بنا کر اس نے ہیلو کہا۔

”ہیلو.....! جی میں ماہم بات کر رہی ہوں، آپ کون ہیں.....؟ اور کیا بات کرنی ہے آپ کو.....؟“ اب کسی حد تک ماہم نے خود کو سنبھال لیا تو آواز میں توازن پیدا کر کے وہ آہستگی سے بولی تو شرجیل کا دل چاہا فون کی تاروں سے باہر نکل کر اپنی پیاری بہن کو اپنے دل میں چھپالے مگر اب وہ ماہم پر کوئی پہلی والی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے خود پر کنٹرول کیا۔  
 ”ماہم.....!“ دل سے محبت میں ڈوبی ہوئی یہ آواز اس کے شرجیل بھائی کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے۔ ماہم کی تمام حیات بیدار ہو گئیں، اس کے سماعتیں چیخ اٹھیں۔

”بھائی.....! یہ آپ ہیں.....؟ دیکھیں پلیز.....! انکار مت کیجئے گا، میرے دل کی تڑپ، خون میں اٹھنے والا جوش کہہ رہا ہے کہ یہ آپ ہیں.....؟ بھائی.....! یہ آپ ہیں ناں.....؟ بھائی.....! بولیں ناں.....! آپ کہاں ہیں.....! میں ابھی آجاتی ہوں۔“

ماہم اس کی آواز سن کر پہچان گئی تھی کہ یہ شرجیل ہی ہے۔ شرجیل سے ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔  
 ”ماہم.....! پلیز آپ میری بات سنئے۔ میں..... میں آپ کا بھائی نہیں ہوں، شرجیل کا دوست ہوں تو اسی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

آنسو کا گولہ سا شرجیل کے حلق میں پھنس گیا تو وہ چپ ہو گیا۔ ماہم چیخ پڑی۔  
 ”جھوٹ مت بولیں.....! آپ بھائی ہیں، میرے اپنے میرے شہزادے بھائی.....! میرا بھائی شرجیل.....! آپ کہاں ہیں.....؟ بھائی.....! گھر کیوں نہیں آتے.....؟ کیا ہم تینوں میں سے کسی کے جنازے کو کندھا دینے ہی آئیں گے.....؟ بھائی.....! اب بھی نہ ملے تو ایسا ہی ہوگا۔“ خون میں جوش آ گیا تھا۔ ماہم کو یقین تھا کہ یہ شرجیل ہی ہے تب ہی تو پورے یقین سے کہہ رہی تھی اور اب شرجیل میں بھی ہمت کہاں رہی تھی کچھ چھپا سکے۔

”چپ رہو ماہم.....! بالکل چپ رہو، تھل اور خاموشی سے میری بات سنو۔ گھر میں ابھی کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ میں.....“

”بھائی.....! میرے بھائی.....! آپ کہاں ہیں.....؟ ماما پاپا بہت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پاپا

کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اب وہ کسی صدمے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آپ آجائیں.....!“  
 گھرے گھرے سانس لیتی ماہم کمزور پڑ گئی۔ شرجیل گھبرا گیا، وہ بھی ماما اور پاپا کو دیکھنے کے لیے چل چل گیا۔

”کیوں.....! کیوں ایسا کہہ رہی ہو.....؟ کیا ہوا ہے پاپا کو.....؟ میں تو ان کو بالکل ٹھیک چھوڑ کر آیا تھا.....“

”آپ ہی نے مار ڈالا ہے ہم سب کو، پاپا کو بہت خطرناک قسم کا ہارٹ ایکٹ ہوا تھا اور ماما کو تو چپ سی لگ گئی ہے۔ نہ بولتی ہیں، نہ کھاتی ہیں، ہر وقت تسخیر پڑھتی رہتی ہیں اور دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہیں۔ آپ کہاں ہیں.....؟ بھائی.....! بتا کیوں نہیں دیتے.....؟ اگر ہم سے خفا ہیں تو میں آپ کے پاؤں پکڑ کے معافی مانگ لوں گی مگر آپ کو گھر لے آؤں گی۔ بھائی.....! بتائیے آپ کہاں ہیں.....؟“ ماہم بری طرح ہچکیاں

لے رہی تھی۔ شرجیل کا دل ڈوبنے لگا۔  
 ”بس کرو ماہم.....! بس کرو، میں نے اذیت کا ایک سمندر عبور کیا ہے، اب کہاں ہوں دھیان سے سنو کسی کو بتانا نہیں، ماما پاپا کو بھی نہیں۔ بس تیور کو بتاؤ اور جو پتہ دے رہا ہوں وہاں پہنچ جاؤ۔ پتہ دھیان سے لکھنا، پھر تاکید کر رہا ہوں کہ کسی کو ابھی میرے بارے میں علم نہیں ہونا چاہیے ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ سن رہی ہو ناں.....؟“

”جی جی.....! میں سن رہی ہوں، آپ فکر نہ کریں بھائی.....! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میں نے ایسا نہیں کر لیا ہے، میں ابھی تیور کے پاس جا رہی ہوں۔ بولتے رہیں میں آپ کی آواز سننے رہنا چاہتی ہوں، یقین کرنا چاہتی ہوں کہ آپ ہمیں مل گئے ہیں۔“ ماہم کی آواز، لہجہ، ہاتھ سب کانپ رہے تھے، آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔

”اس طرح کمزور نہیں پڑتے ماہم.....! اب تو اللہ کے فضل سے بات ہو رہی ہے ناں اور میں تو مل بھی گیا ہوں، یقین کرتے ہیں بے یقینی کا شکار نہیں ہوتے۔“ خود پر کنٹرول شرجیل سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔  
 ”اچھا.....! اب وقت پر باد نہ کرو جاؤ تیور کو لو اور آ جاؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”جی.....! جی بھائی.....! اللہ حافظ.....!“  
 ”خدا حافظ.....!“ ماہم نے سب سے پہلے اللہ کے حضور شکرانے کے سجدے کیے، روتی رہی، اس حیات میں خوشی کو کس طرح سنبھال کر رکھنا ہے سوچتی رہی، پھر اس نے خوشی سے دھڑکتے دل کو بمشکل نارمل کیا اور پاپا کے کمرے میں آ گئی۔ پاپا تو نماز پڑھنے گئے تھے، وہ آمنہ سے لپٹ کر بے قابو ہو کر روئے گی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہیں کہ یہ نئی بات نہ تھی کہ شرجیل کے لیے اس طرح رونا ان ماں بیٹی کا معمول تھا۔  
 ”ماما.....! آپ کو پتہ ہے آج میں بھائی کی یاد میں نہیں رو رہی ہوں بلکہ آج میں نے خواب دیکھا ہے کہ بھائی واپس آ گئے ہیں۔“

”میری بچی.....! یہ خواب تو نہ نیند کا محتاج ہے اور نہ ہی رات کا۔ یہ تو آنسو بن کر، آنکھوں میں دُعا بن کر لوں پر جم گیا ہے۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہو گئی ناں.....؟“



”نہیں ماما! آج کے خواب میں نئی بات ہے، نئی روشنی، نئی اُمنگ ہے۔ اچھا ماما! میں آپ کو بتانے آئی تھی کہ مجھے اسماء سے کچھ کام ہے، تیمور کے ساتھ چلی جاؤں ناں۔“ وہ خوشی سے اتنی بے قابو رہی تھی کہ وہ ماما کو بھی بتا دینا چاہتی تھی مگر شرجیل نے جانے کیوں بتانے سے منع کیا تھا، وہ سمجھ نہیں سکی تھی مگر ہاں ضرور ہو گئی تھی۔

”ہاں! جاؤ بیٹی! جاؤ۔“ اس نے ماما کے آنسو صاف کرتے ہوئے شکریہ کہا اور باہر نکل گئی۔ تیمور کو ڈھونڈ رہی تھی، موبی کے سامنے وہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہی ہوا۔ تیمور اس وقت گھر کے سارے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ماما بہت بے قرار تھی شرجیل کے لیے، وہ کسی بات کا بھی خیال کیے بغیر آگئی۔

”تیمور! مجھے اسماء کے ہاں ضروری کام سے جانا ہے۔ لے چلو گے۔“ تیمور جو اس کے لیے جان بھرتی پر لیے پھرتا تھا یہ معمولی سا کام نہ کرنا تو جیسے اشارے کا منتظر تھا۔ ماما سب کا خیال کر کے اس نے کوئی خاص جوش ظاہر نہیں کیا۔

”ہاں! چلو۔“ دروازے میں کھڑی ماما کے مقابل کھڑا ہوا موبی را کہہ ہو گیا۔ بل کر مگر اس وقت ماما کو کچھ ہوش تھا نہ ہی کسی کی پروا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ماما نے تیمور کو ساری بات بتا دی تو وہ بھی خوشی سے اُٹھ پڑا۔

”ہیں! ارے ماما! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ تیمور بے حد خوش ہوا۔

”ہاں! ابھی موبی نے جو فون اٹینڈ کیا تھا وہ بھائی ہی کا تھا۔ انہوں نے ابھی سب سے یہ بات چھپانے کو کہا ہے، کیوں؟ یہ نہیں بتایا۔ پلیز! تم وعدہ کرو تم بھی کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔“

”تم نے کہہ دیا تو پھر وعدے کی کیا ضرورت ہے۔“ لاؤ شرجیل کا ایڈریس دو۔“ مگر بے لکھ میں بات کہہ کر تیمور نے فوراً ہی ایڈریس مانگ لیا۔

ڈھونڈتے ہوئے دونوں مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ گیٹ پر ہی عرفان اور شرجیل ساتھ کھڑے تھے۔ شرجیل میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ ماما بھائی کو پہچان گئی تھی۔ عرفان اور شرجیل ان کی جھجک سمجھ رہے تھے۔ شرجیل سے اب ضبط نہ ہوا۔ وہ آگے بڑھا اور ماما کے لیے بازو دکھائیے۔

”بھائی! بھائی آپ! آپ واقعی یہ آپ ہیں۔“ بھائی! آپ ہی ہیں ناں۔“ آپ کو کیا پتہ ہے ہم نے آپ کے بغیر یہ۔۔۔۔۔ یہ راتیں کیسے گزاری ہیں۔“ بھائی! آپ کہاں چلے گئے تھے۔“ ہمیں کوئی خبر کیوں نہیں دی۔“ اگر میں مرجاتی، ماما پیا میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو آپ کیا کرتے۔“

ماما بالکل دیوانی ہو رہی تھی، بولے بھی جاری تھی اور شرجیل کو پیار بھی کرتی جا رہی تھی۔

”اور میں نے بھی تو اتنا تلخ وقت گزارا ہے۔ تیمور! گلے لگو یار۔“ میں تو ترس ہی گیا تھا اپنوں کی شکلوں کو، ان کے قرب کو۔“

شرجیل نے دوسرا بازو پھیلا کر تیمور کو ساتھ لگایا جو قریب ہی کھڑا بہن بھائی کو ہندلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

”کہاں رہ گئے تھے یار شرجیل۔۔۔۔۔ تم! تم! تم نے تو ہم سب کو مار ہی دیا تھا۔“

”بھائی! آپ اتنا بدل کیسے گئے۔۔۔۔۔ کون سے ٹریننگ اسکول میں چلے گئے تھے۔۔۔۔۔؟“ اسی طرح شرجیل کو با اعتماد طریقے سے کھڑا دیکھ کر اس کی آواز کی مضبوطی سن کر ماما کو خوشی بھی ہو رہی تھی اور حیرت بھی۔

”ارے بھئی ماما بیٹا! اندر چلو، چائے پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں، ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔؟“

عرفان سب کو لے کر اندر آ گئے۔ بہن بھائی نے ایک دوسرے پر بیت جانے والی قیامت کی داستان سنائی۔ ماما تو بار بار بھائی کی نظر اُتار رہی تھی۔

”ماشاء اللہ! چشم بد دور۔۔۔۔۔! اللہ میرے چاند سے بھائی کو کسی کی نظر نہ لگے۔ اب آپ میرے آئیڈیل بھائی بنے ہیں، میں یہی تو چاہتی تھی کہ آپ بھی باقی سب کی طرح بہادر، پر اعتماد مرد بنیں کہ موبی جیسے چوٹے آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔“

”تو بس پھر اللہ نے تمہاری دعائیں سن لیں اور مجھے انسان بنا دیا۔ بس ماما! اللہ کے فضل و کرم سے عرفان بھائی کو یہ سارا گیمینٹ جاتا ہے۔“

شرجیل نے ممنون سی نظروں سے عرفان کو دیکھا۔

”ارے میاں! عرفان بھائی کو کیا کریڈٹ جاتا ہے۔۔۔۔۔؟ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، جب اللہ نے کوئی کام کرنا ہے تو اس کے لیے وسیلہ بھی وہ خود ہی پیدا کر دیتا ہے کیونکہ کوئی کام بغیر وسیلے کے نہیں ہوتا۔“

”بھائی! پلیز گھر چلیں۔ ماما کتنا خوش ہو جائیں گی آپ کو دیکھ کر اور ہاں! اب اگر وہ موبی کا بچہ آپ کو بے بی کہے گا ناں تو ایسی دھنائی کچھنے کا کہ نانی یاد آ جائے اسے، بہت ہی بدتمیز آدمی ہے۔“ ماما نے تو سوچ لیا تھا اب موبی سے سارے حساب برابر کرے گی۔

”ماما بیٹا! سب کچھ ہو جائے گا مگر پہلے کھانا کھالیں، لگ گیا ہے۔“ بھائی نے کھانے کی اطلاع دی، ماما مسکرا دی، وہ بار بار عرفان اور عالیہ بھائی کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ انہوں نے شرجیل کو اپنا بھائی سمجھ کر رکھا۔

”اصل شکریہ تو میرے ماما آپ کا ادا کریں گے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہی نہیں آپ لوگوں نے کتنا بڑا احسان کیا ہے ہم سب پر۔۔۔۔۔؟“ ماما نے پیار سے شرجیل کو دیکھا جس کی چور نظریں ہادیہ پر تھیں جس سے ہر روز کئی بار لڑائی ہوتی تھی۔ اب تو وہ شرارتا بھی اسے تنگ کرنا، وہ چڑنے لگتی تو عرفان یا عالیہ سمیہ کر دیتے۔ وہ دل کی دل میں رکھ کر چپ ہو جاتی۔

”بھئی ماما! تم نے سب کا شکریہ ادا کر دیا مگر ہادیہ کا تم نے شکریہ ہی ادا نہیں کیا۔ تمہیں پتہ ہے انہوں نے میرا کتنا خیال رکھا ہے، ہر وقت لڑنا جھگڑنا، جو چیز ہاتھ میں ہو اٹھا کر دیوانوں کی طرح مار دیتا۔“ شرجیل مسلسل ہادیہ کو چڑا رہا تھا۔ ہادیہ نے بڑے خونخوار انداز میں اسے گھورا۔

”شرجیل! اس کے ہاتھ میں اس وقت کاٹا ہے، دے مارا تو کیا کرو گے۔۔۔۔۔؟“

”بھائی! آپ بھی ناں مل جایا کریں ان کے ساتھ۔“ ہادیہ خفا ہو کر اٹھ کر چلی گئی تو ماما اور تیمور بھی مسکرا دیے۔ ماما کا کہنا تھا شرجیل آج ہی گھر چلے مگر عرفان ابھی اسے بھیجنا نہیں چاہ رہے تھے۔



ہو گیا۔ ریکٹ پھینک کر ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ لیے طہریہ شکل بنائے ان کی طرف آ گیا۔

”تو ہو گیا ضروری کام.....؟“ دونوں نے پہلے اسے دیکھا پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ جلتی پرتیل پڑا، شعلے بھڑک اٹھے۔

”ماہم صاحبہ.....! آپ کی دوست اسماء کا فون آیا تھا، وہ پوچھ رہی تھی تمہارا۔ پھر تم کس اسماء کے پاس گئی تھیں.....؟“

ماہم نے پھر تیمور کو دیکھا، معنی خیزی مسکراہٹ دونوں کے ہونٹوں پر کھیل گئی کیونکہ اسماء اپنے بھائی کے ساتھ انگلینڈ گئی ہوئی تھی، اس نے محض ان لوگوں کے سامنے بہانہ بنایا تھا شرجیل کے پاس جانے کے لیے۔

”اچھا.....! کیا کہہ رہی تھی کہ میں وہاں نہیں گئی.....؟ اس نے میری کتاب دینی تھی کہیں اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ رہی تھی.....؟“

”ہوں، ہاں.....! کچھ خاص نہیں کہہ رہی تھی وہ.....“ وہ دونوں اس کو نظر انداز کر کے اندر چلے گئے۔ بھوت کھل جانے کے خوف سے موٹی بوکھلا گیا تھا۔

شرجیل کے منع کرنے کے باوجود ماہم اس سے ملنے گئی تھی۔ اسی دوران ہادیہ سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

”بھائی.....! بس کریں ناں یہ سنیں..... ماما مجھے یوں خوشی سے جموتے دیکھتی ہیں تو ایسے دیکھتی ہیں مجھے جیسے میں پاگل ہو گئی ہوں۔ بھائی.....! پلیز ماما کو بتانے کی اجازت دے دیں۔“ وہ منت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں کم ٹرپ رہا ہوں.....؟ بس ذرا عرفان بھائی کے ابو جو کہ باہر ہوتے ہیں وہ آجائیں تو ہم ایک ساتھ آئیں گے۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے جس کو ناراض ہونا ہے جی بھر کر ہو لے، ہم تو مہمان ہیں آج نہیں تو کل چلے ہی جائیں گے۔ شرجیل نے جیسے ہی بات کرتے کرتے ہادیہ کو آتے دیکھا تو اسے سنانے کو کہا۔

”کیا واقعی شرجیل ہمارے گھر سے چلا جائے گا۔“ ہادیہ کو جھٹکا سا لگا۔

• • •

”کیا کہا.....؟ تم موی کو جانتے ہو.....؟“ افتخار نے بے ساختہ حیرت سے خرم کو دیکھا جن کے دھم ایک ایک کر کے اُدھڑ گئے تھے۔ ماضی کا ایک ایک پل آئینہ بن گیا، ایک ایک کسک جاگ اٹھی، اپنی بیقراریاں، موی کی مجبوریاں اور ماما کی نگرانی ڈھیر سا درد داس اُداس ویران شام کو مزید ویران اور سوگوار بنا گیا۔

”جان پہچان کے ان سلسلوں کو میں تو نہیں جانتا افتخار.....! ہاں اتنا جانتا ہوں کہ کچھ لوگ جو ہماری پہچان ہوتے ہیں، ہماری دھڑکنوں کا عنوان اور جذباتوں کی جان ہوتے ہیں، ہم جان بوجھ کر ان کی حیثیت، اہمیت کو انور کر کے صفحہ پلٹ کر، کہانی اُدھوری چھوڑ کر دوسری کہانی لکھنے یا پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ موی سے بھی میری کچھ ایسی ہی جان پہچان ہے۔“

برف ہوتے لہجے میں بولتے خرم آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑی راکھ میں انگلیاں پھیرنے لگے تو افتخار کے

”بھائی.....! یہ کیا بات ہوئی.....؟ آپ ماما کو ایک نظر دیکھ تو لیں۔ بس کچھ بھی ہو میں ماما کو ضرور بتا دوں گی آپ کے بارے میں، اتنا ٹرپ رہی ہیں وہ اور آپ.....“

”ماہم بیٹا.....! تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر بیٹا.....! شرجیل جن حالات میں گھر سے نکلا اور باہر نکل کر اس نے جو حالات فیس کیے ہیں اگر پھر اب موجود حالت کو پہنچا تو ان سب باتوں کو تم پھر بھی نہیں سمجھو گی۔ دیکھو تبدیلی بہت بڑی ہے اور واضح صاحب دل کے مریض ہیں، اتنی بڑی خوشی سے ان کی جان پر بن بھی سکتی ہے اس لیے آہستہ آہستہ سب کرنا ہوگا۔“ عرفان نے ایسی دلیل دی کہ ماہم کی سمجھ میں آ گئی۔

”لیکن عرفان بھائی.....! جلدی.....! تیمور نے کہا۔“

”ہاں ہاں.....! بہت جلدی کوشش کریں گے اور میں خود شرجیل کو لے کر آؤں گا۔“

ماہم کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا شرجیل کو یہاں چھوڑ کر جانے کو مگر شرجیل اور عرفان کا کہنا بھی ٹال نہیں سکتی تھی اس لیے آنکھوں میں جھڑی لیے چلی گئی۔

”تیمور.....! دیکھا تم نے بھائی کتنا بدل گئے ہیں.....؟ اب اس منیب کے بچے کو پتہ چلے گا کہ کس طرح وہ ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اُف خدا یا.....! میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں.....؟“ گاڑی میں بیٹھی ماہم بے حد خوش تھی، اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خوشیوں کے اڑن کھٹولے میں اڑی جا رہی تھی۔ اسے شرجیل کا بہت دکھ تھا، وہ چاہتی تھی باقی سب لڑکوں کی طرح شرجیل بھی نارمل ہو جائے کھیلے، شوخ حرکتیں کرے مگر وقت حالات نے تو اسے عجیب کر دیا تھا۔

”ویسے واقعی ماہم.....! یہ تو اللہ کا معجزہ ہو گیا ہے۔ ہم اللہ کا شکر ادا کریں کم ہے۔ ماشاء اللہ.....! شرجیل خاندان کے سب لڑکوں سے زیادہ خوب رو اور اسارت ہے اور لڑکی.....! اب کیوں رو رہی ہو.....؟ اب تو شکرانے کا وقت ہے۔“ تیمور ڈرائیونگ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ یہ انسان بھی عجیب چیز ہے، خوشی ملنے پر بھی روتا ہے اور غم ملنے پر بھی۔

”ماہم.....!“ تیمور نے اس کے آنسو صاف کیے تو وہ بارش میں ڈھوپ کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”تیمور.....! تمہارا کیا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو اتنا عظیم احسان کیا ہے، کرم کیا ہے، ہم اس کا شکر ادا کر سکتے ہیں.....؟ نہیں، ہرگز نہیں، کبھی ہم اللہ کی کرم نوازیوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ ویسے تیمور.....! میں سوچ رہی ہوں کہ میں پپا سے تو یہ خوشی چھپا سکتی ہوں مگر ماما سے نہیں۔ بتاؤ.....! مشورہ دو کیا کروں.....؟“

ماہم بہت بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طرح ماما کو یہ خوشخبری سنا دے۔

”ماہم.....! دیکھو میں مانتا ہوں چچی جان اس بات کی حقدار ہیں کہ ان کو یہ خوشخبری جلدی سے سنا دی جائے لیکن اگر شرجیل اور عرفان بھائی کہہ رہے ہیں تو صبر کر لیتے ہیں۔“

”ہائے تیمور.....! میں..... میں کیسے چھپا پاؤں گی.....؟“ تیمور نے تنبیہی نظر ڈالی تو وہ چپ ہو گئی۔

”لگتا ہے ماہم.....! اب ہر وقت تمہاری نگرانی کرنی پڑے گی۔ ارے.....! تم تو خطرناک لڑکی ہو، بھانڈا پھوڑ دو گی۔“

دونوں ہنستے ہوئے گیٹ سے اندر آ رہے تھے تو سب سے پہلی نظر ان پر موی بی بی کی پڑی۔ وہ جل کر راکھ



سامنے مومی اور خرم کی محبت کی تصویر بن گئی۔ خرم کی بیقراریاں اور مومی کی مجبوریاں فاطمہ کی وجہ سے تھیں جن کو بہت ہی صلح جو، حلیم اور خدا ترس قسم کی خاتون سمجھ رہے تھے۔ وہ کبھی ایسی بھی رہی ہیں کہ دو مصوم محبت کر لے والوں پر قہر بن کر ٹوٹی ہیں، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

”حیرت ہے یار.....! آنٹی ایسی لگتی تو نہیں.....؟“

”انسان پیاز کی طرح ہوتا ہے افتخار.....! اس پر تہہ در تہہ چھلکے چڑھے ہوئے ہیں، ہر پرست کی الگ کہانی، الگ موڈ، الگ سوچ اور الگ عمل ہے۔ کہنے کو ماسوشل ورکر تھیں اور غریب بے سہارا لڑکیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر کے خوش ہوتیں، مساوات اور امیری غریبی کے فرق کو بودا قرار دینے والی فاطمہ زہیر صرف کہنے کی حد تک سوشل ورکر تھیں اور جب خود خدا نے ان کو نیکی کرنے کا موقع دیا تو وہی ٹھیک سوج اور عمل وجود میں آ گیا۔ مومی پر کڑی نظر اور مجھے مومی جیسی خوبصورت اور ملازمہ قسم کی لڑکیوں سے بچنے کی نصیحت کرتی رہتیں۔ بس یار.....! انسان کا دشمن کوئی اور نہیں اپنا آپ ہی اس کا دشمن ہے۔“ اک شدید قسم کی کک خرم کو فاطمہ نے کہا۔

”تم چاہتے تو ایسا ہو تو ہو سکتا تھا.....؟“

”ہاں.....! ہو تو سکتا تھا مگر چاہت کی لگام ہمارے ساتھ میں تھی کب، میں اگر بغاوت کرتا بھی تو کس اعتماد پر مومی اتنی اچھی اور مضبوط لڑکی تھی کہ اس نے بھی قسم کھالی تھی کہ اس گھر میں ایسے رہے گی کہ کوئی افسانہ وجود میں نہ آئے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایسی بے شمار مجبور بے سہارا لڑکیوں کی نمائندہ سمجھتی تھی جو اس کی طرح خوبصورت بھی تھیں اور تعلیم یافتہ بھی اور ملازمت کرنے پر مجبور بھی، وہ اپنی کسی حرکت سے دوسری لڑکیوں کے لیے مدد کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بس یار.....! میں تو اس محبت کی بجلی میں پس کر رہ گیا، کچھ ماں کی محبت نے مارا کچھ محبوبہ کی چاہت نے مارا۔“

گزشتہ یادوں کی چھین نے خرم کو سکنے پر مجبور کر دیا۔ افتخار سمجھ رہے تھے کہ انسان کے قول و فعل کا فلسفہ بالکل الگ ہوتا ہے۔ خرم ایک بار پھر عہد گزشتہ کی واردات سے گزر رہے تھے، وہی کرب ناک، اذیت ناک احساس کاٹ رہا تھا۔

”یہ تو بہت گڑبڑ ہو گئی۔ جب تک آنٹی پر یہ راز نہیں کھلتا کہ رد امیری بیٹی نہیں جب تک رشتہ باقی ہے ورنہ.....“

افتخار جو یہ رشتہ کر کے طرح طرح کے واہموں اور دوسو سوں کا شکار ہو گئے تھے، اب تو ان کو یہ رشتہ ختم ہونے کا یقین ہو چلا تھا۔

”ہاں.....! میں اب بھی اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ماما کو معلوم ہو گیا کہ رد امیری نہیں مومی کی بیٹی ہے تو شاید وہ کچھ بھی کر گزریں.....؟“

”پھر.....؟ پھر اب کیا کیا جائے یار خرم.....! رد امیرا کو بہت چاہتی ہے۔“

”کتنی عجیب سی صورت حال ہے افتخار.....! کہ ماضی میں بھی خرم نے مومی کو ٹوٹ کر چاہا مگر ممانے نے نہیں دیا۔ آج پیار کرنے والے مختلف ہیں مگر.....“ خرم چپ ہو گئے۔

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا خرم.....! کہ اب کیا ہوگا.....؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آنٹی کو صرف یہ بتایا جائے کہ رد امیری لے پا لک بیٹی ہے۔ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ رد امیری ہے تو تمہارے خیال میں پھر وہ مان جائیں گی۔“

”نہیں افتخار.....! میں اپنی ماں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کو جس موڑ پر بھی یہ بات معلوم ہوگی وہ یہ رشتہ کیا شادی تک ختم کر ادیں گی۔ وہ مومی کو انسان نہیں صرف ملازمہ ہی سمجھتی ہیں اور کسی ملازمہ کو جب انہوں نے اپنی بہو نہیں بنایا تو اس کی بیٹی کو.....“ خرم نے اک گہرا سانس لیا۔

”اب کیا ہوگا خرم.....! میرے تو پسینے چھوٹ گئے ہیں۔ کاش.....! میں ہی تمہیں یہ راز نہ بتاتا اور نہ تم مجھے یہ سب بتاتے۔“

افتخار واقعی بہت پریشان ہو گئے تھے۔

”اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے افتخار.....! ڈونٹ وری.....! میں لیلی سے بات کرتا ہوں۔ ماما شہرام کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں، ہو سکتا ہے وہ پوتے کے معاملے میں اپنی سوچ، اپنے قوانین میں تبدیلی کر لیں۔“

خرم اپنی ماما کو بہت اچھے طریقے سے جانتے تھے مگر جانے کس اعتماد پر اس کی ڈوری افتخار کو تھما دی۔ شاید واقعی فاطمہ شہرام کو بیٹے سے زیادہ چاہتی تھیں، ماما اندر کہیں یہ اعتماد تھا کہ اپنے لیے لڑ نہ سکے مگر بیٹے کی وکالت خوب کر سکتے تھے یا یہ کہ اس بار وہ ماما کو زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان باتوں میں جانے کیا بات تھی جو ان کے لہجے میں اعتماد بن کر عود آئی تھی اور پھر خرم نے ساری بات لیلی سے کہہ دی تو وہ کتنی دیر گم سم بیٹھی رہیں۔

”واہ.....! قدرت کی شان دیکھیں بھائی.....! کہ ماضی میں ممانے مومی کو اس گھر کی بہو بننے نہیں دیا تو مومی کی بیٹی اس گھر کی بہو بننے کے لیے آ گئی۔ ویسے آپ نے نوٹ کیا بھائی.....! کہ رد امیری سے کتنی ملتی ہے۔ میں تو پہلی بار رد امیری کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔“

”جاتے وقت مومی نے ایک ہی جملہ کہا تھا کہ میں تمہاری زندگی میں لوٹ کر ضرور آؤں گی۔ وہ اس صورت میں لوٹ کر آئے گی یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا، تاریخ یوں بھی خود کو دہراتی ہے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ لیلی.....! میں دوسری بار مومی کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ پلیز.....! ماما کو سمجھانا۔“

خرم کی خواہش ان کے لہجے میں ڈھل گئی تو لیلی کتنی دیر ان کو سمجھاتی رہیں۔

”بتانا تو ماما کو پڑے گا ہی، چھپانا خطر ناک ہو سکتا ہے۔“

”نہیں لیلی.....! ہم کوئی کام بھی ان کو بتائے بغیر نہیں کریں گے۔ ہاں.....! اس بار ماما کو ماننا ہی ہوگا

کیونکہ میں دوسری بار ٹوٹنے کی ہمت نہیں رکھتا۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں ماما سے بات کرتی ہوں اور اس بار میں ان کو کوئی زیادتی کرنے نہیں دوں گی۔“

لیلی نے مضبوط لہجے میں کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

فاطمہ کچھ دیر تو گنگ رہ گئیں پھر ان کے چہرے پر تازہ آ گیا۔

”ہوں.....! تو یہ بات ہے۔ اس طرح مومی اب مجھے مات دینا چاہتی ہے۔ خود اس گھر کی بہو نہ بن سکی



تو بیٹی کو تیار کر کے بھیج دیا۔ وہ کیا سمجھتی ہے میں اس کی بیٹی کو بحیثیت بہو قبول کر لوں گی.....؟“ قاطرہ بیگم ساری بات سن کر بولیں۔

• • •

”کیوٹ بے بی.....!“ طلحہ ابراہیم مستقل خولہ اور علیزہ کے گرد گھوم رہا تھا۔ اس بار خولہ کے قریب گزرتے ہوئے اس نے خولہ کے چہرے پر آئی لٹ کو پیچھے کرنا چاہا تو وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔  
”یہ کیا ہے طلحہ ابراہیم.....!“ علیزہ نے اس کی حرکت دیکھ لی تھی، اس نے فوراً ٹوکا۔  
”سوری ڈیر.....! مجھے اسکرپٹ بالکل پڑھنا نہیں آتا۔ اُردو کمزور ہے ناں، یہ تم کسی اور سے پوچھ لو۔“  
طلحہ واقعی اس کی تنبیہ کا اشارہ سمجھا نہیں تھا۔

”طلحہ.....! میں اسکرپٹ کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ دیکھو طلحہ.....! کام تو ہمیں کرنا ہے، سیکھنا ہے، تم نہیں تو اور سبکی اور اگر تم چاہتے ہو کہ تم ہمارے اور ہم تمہارے ٹیلنٹ سے فائدہ اٹھائیں تو اپنی حرکت درست کرو۔ اور نہ تم اس راہ ہم اس راہ۔“

علیزہ بڑی گھری لڑکی تھی۔ درست بات وہ کہنے سے چوکتی نہیں تھی اور طلحہ جو کہ طبعاً ہی چیٹر تھا بس اپنے اسی ٹیلنٹ سے وہ سادہ اور معصوم لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر استعمال کر رہا تھا اور اپنے اس کام میں وہ اس حد تک ماہر ہو چکا تھا، اب بڑی صفائی سے ایسی ایسی وارداتیں کر گزرتا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی، ایک طرح سے یہ اس کا فیملی بزنس تھا۔ لڑکیاں تو اس نے بہت دیکھی بھی اور پٹائیں بھی مگر جو بات خولہ اور علیزہ میں تھی، دونوں اچھے کھاتے پیتے گھروں کی انتہائی حسین اور فریش لڑکیاں تھیں اور ان کو وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا اسی لیے تو ان کی ہر بات مان لیتا اور ان دونوں کو بھی اپنے اپنے شوق اتنے پیارے تھے کہ خولہ تو بعض دفعہ اس کی غلط بات بھی مان جاتی جس پر علیزہ اسے خوب ڈانٹتی۔ دونوں اب طلحہ کے اسٹوڈیو میں زیادہ وقت گزارنے لگی تھیں اور واپسی بھی دیر سے ہونے لگی تھی۔ دونوں کو اپنے گھروں سے خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔

”خولہ.....! بس بہت ہو گیا۔ اب تم یہ فضولیات بند کرو۔ مجھنا صاحب آنے والے ہیں یوں بھی ان کی مرضی کے خلاف تمہیں آزادی دے کر میں نے ان کے ساتھ نا انصافی کی امامت میں خیانت کی ہے میں نے۔ لیکن اب نہیں، ان اف.....!“

اس روز عطیہ خاتون نے حسی انداز میں اپنا فیصلہ سنایا تو خولہ تو صدے سے بیٹھ سی گئی۔ طلحہ ابراہیم کے پہلے سیریل کی وہ ہیر و من تھی اور عطیہ خاتون اس پر پابندیاں لگا رہی تھیں۔

”عطیہ خاتون.....! پلیز آزاد کر دیں مجھے اپنی جیل سے، میں بھی کچھ سانس اپنی خوشی اور مرضی سے لینا چاہتی ہوں۔“

”خولہ.....! یہ تم اتنی دیر کہاں لگاتی ہو آخر.....؟“  
عطیہ خاتون کا انداز ذرا ٹیکھا تھا۔ خولہ نظریں چرا گئی، اب اگر وہ بتا دیتی کہ وہ ایکٹنگ کی کلاسز لے رہی ہے تو قیامت سے پہلے قیامت برپا کر دیتیں یہ عطیہ خاتون۔ لہذا چالپوسی والی پالیسی ہی بہتر تھی جو وہ اب استعمال کرنے لگی تھی۔

”عطیہ خاتون.....! جب آپ ایسے دیکھتی ہیں ناں بالکل بابا لگتی ہیں۔ آپ کو معلوم تو ہے کہ میں فائن آرٹ میں ہوں، وہاں تو دیر ہوئی جاتی ہے، کھانا تو آپ نے نہیں کھایا ہو گا ناں.....؟ چلیں کھانا لگوائیں کھاتے ہیں۔“

وہ ان کے رُخساروں پر پیار کر کے اپنے کمرے کی میز حیاں چڑھ گئی تو وہ سوچتی آنکھوں سے دُور تک اسے دیکھتی رہیں اور ایسی ہی صورتحال سے علیزہ بھی دو چار تھی۔ اس کام میں اسے بہت دیر ہو جاتی تو ارمغان اور جواد گیٹ پر ہی اس کی کلاس لینے کے لیے موجود ہوتے۔ تب کبھی تو وہ چپ رہتی تو کبھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بول بھی پڑتی۔ اس وقت بھی دونوں بہت پریشان تھے۔ علیزہ ابھی نہیں آئی تھی، جواد بار بار اس کے موبائل پر ٹرائی کر رہا تھا مگر اس کا موبائل شاید چارج نہیں تھا۔

”جواد.....! یہ لڑکی ہماری سنی نہیں، طلحہ ابراہیم انتہائی خبیث آدمی ہے، کہیں یہ دونوں بے وقوف لڑکیاں کوئی غلطی نہ کر رہیں۔“ ارمغان مسلسل ٹہل رہا تھا۔

”خدا نہ کرے ارمغان بھائی.....! مگر اب کریں بھی کیا.....؟ آپ تو مماسے بھی نہیں ڈرتیں کہ ان کو بتا دیا جائے۔ اگر ہم ان کو بتا دیں تو وہ یقیناً آپ کی کونج کریں گی اور آپ کی ویسے ہی ان کی نافرمانی کرتی رہتی ہیں۔“ جواد بے بسی سے بیٹھ گیا۔

”ہونے دو جو ہوتا ہے۔ ارے.....! وہ روڈ پر پٹشی ہوئی اکیلی لڑکی نہیں، لاوارث نہیں کہ جو اس کے جی میں آئے کرتی پھرے۔ وہ ایک خاندان سے جڑی ہے، ہماری عزت ہے، میں خود اس سے بات کروں گا اور وہ ہوتی کون ہے ہماری بات رد کرتے والی.....؟“ ارمغان ابھی بول ہی رہا تھا کہ علیزہ کی گاڑی اندر آ گئی۔

”وقت کیا ہوا ہے سہرہ.....؟“ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو اتالیٹ آنے پر وہ دلی طور پر شرمندہ بھی تھی اور افسردہ بھی مگر وہ اس پر اپنی کمزوری ظاہر کر کے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لہذا کھٹ سے لا پرواہی کا بورڈ چہرے پر آویزاں کیا، بیگ شانے پر ڈالا، خود آگے بڑھی پھر بیٹھی۔

”تو کیا واقعی ہمارے گھر کی ساری گھڑیاں خراب ہو گئی ہیں کہ تم وقت پوچھنے کے لیے گیٹ پر کھڑے ہو.....؟“

”دیر ہی فی.....! لیکن آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ گھر کی ساری گھڑیوں پر جو وقت ہے ناں وہ بتا رہا ہے کہ یہ وقت کسی بھی شریف لڑکی کے گھر آنے کا نہیں۔“ ارمغان متاثر ہوئے بغیر پھٹا۔

”مائی بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ.....! یہ مناسب وقت نہیں کہ آپ.....“  
”اوہ.....! شٹ آپ جواد.....! تم تو ہو ہی ان کے پیچھے۔“

”تمہیں معلوم ہے یہ طلحہ ابراہیم کیا چیز ہے.....؟“  
”نہ مجھے کچھ معلوم ہے اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ وہ جیسا بھی ہے ہمارا اچھا دوست ہے بس۔“

جب ہٹ دھرمی اور خود سری کا نشہ چڑھا ہوتا ہے تو ہر غلط درست اور درست غلط لگتا ہے۔  
”جس راستے پر تم جاری ہو نا علیزہ.....! نہ تو اس کی کوئی منزل ہے اور نہ واپسی کا راستہ۔ اگر خدا نخواستہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو.....“



اب ارمان اسے آرام سے سمجھا رہا تھا مگر علیزہ مزید چڑ گئی۔  
 ”ڈونٹ وری.....! کوئی گڑبڑ ہوگئی ناں تو تمہارے پاس نہیں آؤں گی مدد کے لیے۔“ وہ پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تو ارمان نے ایک گہرا سانس لیا۔

”یہی تو میری کم نصیبی ہے علیزہ.....!“ ایک کسک انداز دہک کر رہ گئی۔  
 ”آپ کی نہیں مانی بھیا.....! آپ کی کم نصیبی ہے جو آپ کو سمجھ نہیں سکتیں۔“ جو ادا فر دگی سے بولا۔  
 علیزہ اور خولہ بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ طلحہ ابراہیم نے ان دونوں کے لیے جو سوچ رکھا تھا اس کے لیے بہت قربانی دینا پڑ رہی تھی لیکن ان دونوں کو وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس روز طلحہ کی سریل کے بننے کی ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں، خولہ ہیروئن تھی جبکہ طلحہ خود ہیرو بن رہا تھا اور اسی خوشی کو سیلبرٹ کیا جا رہا تھا۔ بہت سے شوقین لڑکیاں لڑکے جمع تھے، رنگ و بو کے ساتھ پینے پلانے کا اہتمام بھی تھا، خولہ اور علیزہ آتو گئی تھیں مگر اب ان کا اس آزاد اور بدتمیز ماحول میں دم گھٹ رہا تھا، خوف بھی آ رہا تھا، ہر کوئی ان پر مہربان ہو رہا تھا، دیر ہو رہی تھی، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

”خولہ.....! اب ڈانس شروع ہونے والا ہے۔ طلحہ کافی دیر سے غائب ہے اور مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سب کی باتیں درست ہو جائیں۔ نکل چلو، عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“

”اوہ علیزہ.....! تم بلا وجہ ہم کر رہی ہو۔ طلحہ بھلا نہیں کیوں.....“  
 ”گڈ.....! ویری گڈ.....! ارے.....! یہ ہوئی ناں بات، کیوٹ بے بی کو مجھ پر بھروسہ ہے..... کم آن بے بی.....! آج یہ خوبصورت پل ہیں اور ہم ہیں۔“ طلحہ قریب آیا، خولہ کی بات پر مسکرایا، نشے میں دھت عجیب شیطانی انداز اور حلیہ تھا اس کا۔

”طلحہ.....! خبردار.....! خبردار جو تم نے خولہ یا مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ یو چیئر.....! دھوکہ دیا ہے تم نے دوستی کے نام پر۔ خولہ.....! چلو.....!“

”اب کہاں جاؤ گی میری جان.....! اور وازے لاکڈ ہیں۔ ارے.....! میں نے تو بہت وقت دے دیا تمہیں ورنہ میں کسی لڑکی کو اتنا وقت نہیں دیتا۔ آئی لو یو خولہ.....! آئی لو یو علیزہ.....!“

اس کی بات پر اور انداز پر دونوں کو وہی حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ دونوں کا خون رگوں میں خشک ہو رہا تھا۔



ایک شیطان خصلت شخص خونخوار انداز میں ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دونوں کے حلق زبان خشک ہو رہے تھے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اپنی حماقت، خود سری اور ہٹ دھرمی پر وہ کرغصہ آ رہا تھا۔ اب اگر خدا نخواستہ کچھ ہو گیا تو خاندان کی عزت پر لگنے والا فارغ شاید سب سے ان کی خوشیاں چھین لے۔  
 ”آپی.....! پلیز سب کچھ دیکھ کر، جان کر زہر پینے والوں کو لوگ کبھی معاف نہیں کرتے۔ پلیز.....! طلحہ ابراہیم کو سمجھیں، وہ شیطان صفت آدمی ہے۔ اگر کچھ ہو گیا تو ماما بابا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ آپ غلط راستے پر جا رہی ہیں محض مہا کی چڑ میں، آپ اپنی زندگی کے گلشن میں کانٹے بوری ہیں۔ پلیز.....! قدم پیچھے کی جانب موڑ لیں، پچھتاوے کا ڈھواں زندگی کے آسمان کو ہمیشہ کے لیے دھندلا دیتا ہے۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ انسان ٹھوکر کھانے سے پہلے سنبھل جائے، آپ بھی سنبھل جائیں آپی.....!“ کل رات ہی تو جو اد نے اس کے آگے ہاتھ تک جوڑ دیئے تھے اور کتنی نخوت سے اس نے اسے جھڑک دیا تھا۔

”آخر سوتیلے پن کا ثبوت دے ہی دیا ناں.....! اپنی ہی ماما کی حمایت کر رہے ہونا.....! تم بھی ماما کی طرح جلنے لگے ہو، ہم سے، خاص کر مجھ سے۔ میں بہتر جانتی ہوں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں.....؟“

”اُف میرے خدا.....! اپنے اتنے پیارے چاہنے والے بھائی کو کس ذلت سے، حقارت سے دھکا رہا تھا میں نے اور ارمان، اُف میرے پروردگار.....! اپنے اس بھوٹے شوق کی خاطر میں نے اس شخص کو ذلیل کر دیا جو..... جو مجھ سے کچھ نہیں چاہتا، جو میری عزت کی خاطر جان بھی دینے کو تیار ہے اور میں نے کس طرح اسے ذلیل کر دیا.....؟“

”اپنے مقام سے مت گرد علیزہ.....! میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے نفرت ہے، چڑتی ہے مجھ سے۔ چلو میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کو تیار ہوں اور پچھو کو بھی منع کر دوں گا کہ تمہاری کسی بات میں دخل نہ دیں مگر تم پلیز.....! تم طلحہ ابراہیم کو نہیں جانتیں۔ عورت نشو و نما سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس کے نزدیک۔ پلیز علیزہ.....! آگ کی طرف مت بڑھو، جل کر راکھ بھی ہو جاؤ گی تب بھی تڑپتی رہو گی پچھتاوے کی آگ میں۔ کسی کے لیے نہ سہی تم..... تم اپنے بابا جان سے تو بہت محبت کرتی ہونا.....! ان کی خاطر، ایسا نہ ہو



کہ جب وہ آئیں ان کے بازو تھمارے لئے واہوں اور تمہارا وجود اتنا گراؤد ہو کہ تم ندامت سے ان کی طرف بڑھ بھی نہ سکو۔ پلیز علیزہ.....! پچھتاوے کے کسی لمحے کو اپنی زندگی کے دروازے پر دستک نہ دینے دو۔ ورنہ ہر خوشی کا لمحہ دستک دیئے بغیر آگے بڑھ جائے گا۔“ ایک ایک جملہ، ایک ایک لفظ دیے روشن کرنا چاہا اور کتنی بری تھی، کتنی نا سمجھ کہ اپنی بھلائی کو اس روشنی میں دیکھنے کی بجائے ایک ایک کر کے تمام دیئے اپنی خود سری، ہٹ دھرمی سے بجھاتی چلی گئی اور اب ذلت کے گھپ اندھیرے میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس قدر ٹھٹھن کی سانس لیا ہی نہیں جا رہا تھا۔ مارے ٹھٹھن کے اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں اسی کیفیت کے بھنور میں خولہ بھی دھنسی جا رہی تھی۔

”عورت کی عزت نازک آئینہ ہوتی ہے خولہ.....! ذرا سی ٹھٹھن سے ہر آئینہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ میری جان.....! تم شہباز صاحب کی امانت ہو میرے پاس اور میری عزت امانت ہے تمہارے پاس۔ اگر کہیں جو بددیانتی ہو گئی تو..... تو نہ میں شہباز صاحب کو منہ دکھا سکوں گی اور تم..... تم شاید اپنے آپ سے نگاہ ملا نہ پاؤ۔ یہ خود سری، ہٹ دھرمی عورت کی دشمن ہیں۔ پھر عورت حیثیت اور مرتبے کے بغیر خزاں رسیدہ چٹوں کی طرح پیروں میں چر مرا کر ختم ہو جاتی ہے۔“

خولہ.....! میری بچی.....! اس راستے پر مت چلو جس کی کوئی منزل نہ ہو اور اس راستے پر تو ہرگز نہیں جس پر چل کر تمہاری ماں نے شوہر اور بیٹی گنوائی۔ ایک مسلمان لڑکی کو اپنی دینی حدود میں اور اخلاقی حدود میں رہ کر زندگی گزارنا چاہیے، عورت ایک گھر کی زینت ہے اور اگر گھر کی زینت شمع محفل بن جائے یا پوسٹر بن کر ہر مکان پر لٹکنے لگے، ہر زبان پر آجائے، ہر آنکھ پر چھا جائے تو..... تو خولہ بیٹی.....! اسی عورت نہ گھر کی رہتی ہے نہ باہر کی اور وقتی تماش بین بھی ایک مدت کے بعد اسے دھتکار دیتے ہیں۔ خولہ.....! ایک بہترین عورت وہ ہے جو مرد کا اعزاز بن جائے، اس کی چاہت، اس کی دعا، اس کی تربیت بن جائے، پچھتاوا نہیں کیونکہ پچھتاوا بن جانے والی عورت کہیں کی نہیں رہتی، پچھتاوے کا زہر ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ رگوں کو کاٹتا ہے تو زندگی ایسا ٹوٹا ہوا آئینہ بن جاتی ہے جس میں کوئی چیز، کوئی حسن مکمل اور خوشنما نظر نہیں آتا۔ خولہ.....! پلیز اپنے باپ کا پچھتاوا نہ بن جانا۔ میں تو شاید تمہیں اپنا خون بھی معاف کر سکتی ہوں مگر شہباز صاحب خود کشی کر لیں گے۔“

عطیہ خاتون کی باتیں یاد کر کے اس نے سسکی لی۔ خولہ پر خوف سے لپکی طاری ہوئے لگی تھی خشکی میں بھی سینے کے قطرے بہہ رہے تھے۔

”بابا.....! بابا خود کشی کر لیں گے، میں..... میں ان کا پچھتاوا بن رہی ہوں، اعزاز نہیں، دعا نہیں، تربت نہیں، صرف پچھتاوا اور دوسرے مرد جواد کا پچھتاوا، جس کی آنکھوں میں اس نے اپنا روپ دیکھا تو زندگی میں پہلی بار دل عجیب سے انداز میں دھڑکا، پہلی بار اپنا آپ خوبصورت لگا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ جواد کی نظر میں ہے تو دل کی مسند پر بھی ہے۔ جواد اسے چاہتا ہے، تنہائی کے لمحات میں یہ تصور کتنا خوبصورت لگتا۔ پہلی بار کسی مرد کے بارے میں سوچنا اچھا لگا تھا۔ اب..... اب وہ جواد کا بھی پچھتاوا بن جائے گی۔ دل بہت تیزی سے دھڑکا پھر کچھ دیر کے لیے اندر کہیں سناٹا چھا گیا، دھڑکنیں بالکل خاموش ہو گئیں تو اس نے گھومتے سر کے ساتھ شدت سے دعا مانگی کہ وہ یہیں ختم ہو جائے۔ وہ بہت نازک، بہت کمزور تھی، اس کے بعد کی کہانی نہیں پڑھ سکتی تھی۔“

”بابا.....! بابا خود کشی کر لیں گے۔“

وہ علیزہ سے لپٹ گئی۔ دونوں کی حالت غیر تھی، کسی بھی تباہی کے خوف کے گہرے سائے دونوں کے حسین چہروں کو ڈھنڈلا رہے تھے، سینے کے اندر کبھی دل دھڑ دھڑ کرنے لگتے اور کبھی بالکل سناٹا چھا جاتا، گلاس ہاتھ میں لیے طلحہ ابراہیم تیلیوں کی اپنی قید میں بے بس دیکھ کر خوشی سے جھوم رہا تھا۔

”خولہ.....! ہم دونوں کو اپنی عزت بچا کر بھاگنا ہے اس کے لیے خواہ اس شیطان کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”ہماری عزت یہاں سے بچ گئی تو اس کے قتل سے ہم ساری دنیا میں بدنام ہو جائیں گے۔ اخبارات، بیانات، ہر جگہ..... نہیں علیزہ.....! ہم پھنس گئے ہیں۔ ایک طرف کھائی ہے، ایک طرف کنواں ہے۔ اللہ تعالیٰ.....! ہمیں معاف فرمادے، ہم نے اپنے پیاروں کو دھوکا دیا ہے، معاف فرمادے، ہمیں اس شیطان کے چنگل سے باعزت نکال دے پروردگار.....!“ دونوں کے دل خدا کے حضور سجدہ ریز تھے اور طلحہ ابراہیم جس نے واقعی اپنی فطرت کے خلاف ان دونوں کے حسن کی بہت ناز برداریاں اٹھائی تھیں، اب ان کو یوں بے بس کر کے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اسی خوشی میں اس نے ایک اور گلاس پڑھایا اور لڑکھڑاتا ہوا دونوں کے قریب آ گیا۔

”ڈونٹ شیخ طلحہ ابراہیم.....! خبردار جو تم نے ہم دونوں کو چھوا بھی۔“

نشے میں دھت طلحہ نے اخلاقی حد پار کرنے کی کوشش کی تو علیزہ خولہ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”خولہ.....! میں کھڑکی کی کنڈی کھولتی ہوں۔ کوہنے کے لیے خود کو دہنی طور پر تیار رکھو۔“

علیزہ نے طلحہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تو خولہ کو خش آ گیا۔ اس وقت وہ لوگ بلڈنگ کی چھٹی منزل پر تھیں اگر کوہ جاتیں تو ہڈیوں کا سرا بن جاتا بعد میں ان کی لاشیں اخبارات کی زبانی دنیا والوں کو، ان کے گھر والوں کو کون کون سی کہانیاں سناتی ہیں، ان کی بازگشت دونوں بہت قریب محسوس کر رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے.....!“ خولہ نے سر دلبے میں کہا اور قبل اس کے کہ علیزہ کا ہاتھ کنڈی تک جاتا طلحہ کسی خونخوار بھیڑیے کی طرح ان کی طرف بڑھا اور اس کی نازک کلائی تختی سے پکڑی۔

”ڈونٹ..... ڈونٹ برن می اب فلاش گرلز.....! ڈونٹ برن می اب.....!“ وہ دانت پیستا ہوا دونوں کے انتہائی قریب آ کر دھاڑا۔ خولہ تو رونے لگی، علیزہ کا دل بھی بیٹھنے لگا تاہم اندر کہیں نہ کہیں اُمید کا ننھا سا دیا ابھی روشن تھا۔

”کہا تھا مجھے غصہ نہ دلا نا اور نہ میرے غضب کو بھڑکانا ورنہ بہت برا ہوگا۔ تم لوگ کیا سمجھتی ہو اب تم لوگ میری قید سے آزاد ہو جاؤ گی.....؟ نیور.....! ناٹ ایٹ آل.....! اور پھر میری قید سے رہائی کے بعد تم لوگوں کو قبول بھی کون کرے گا.....؟“ وہ ان کی مجبوری، ان کی خود سری اور ہٹ دھرمی کا تمسخر اڑا رہا تھا اور چونکہ وہ خطاوار تھیں لہذا نظریں جھکا کر رہ گئیں۔ وہ شیطانی قہقہے لگا رہا۔

”میں نے تم لوگوں کو چیت کیا اور تم لوگوں نے اپنے گھر والوں کو چیت کیا، گھر سے پڑھنے کے لیے نکلیں



اور باہر نکل کر میرے ساتھ گھومتی پھرتی رہیں، پارٹی میں دیر ہو جاتی تو گھر والوں کے سامنے اُلٹے سیدھے بھول بول کر کسی نہ کسی کو چٹ کیا ہے۔ ہاں خولہ بیگم.....! بتاؤ تم نے اپنے باپ اور اس فرشتہ صفت عطیہ خاتون کو کیا کیا ہے کہ نہیں.....؟ کالج کی بجائے تم میرے ساتھ گھومتی رہیں اور عطیہ خاتون کو بتاتی رہیں کہ کالج میں کام ہی بہت ہوتا ہے۔ اب بتاؤ.....! چیئر کون ہوا.....؟ تم.....؟ یا میں.....؟“

وہ خولہ کے خوبصورت بالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بدتمیزی سے بولا تو جج کا خنجر خولہ کے ساتھ علیزہ کے دل کے بھی آر پار ہو گیا۔

”اینڈ یودی فلاسفر علیزہ و جاہت.....! تم اپنی اسٹپ مدر کو نیچا دکھانے کے لیے یہ سب کر رہی ہو ناں.....؟ اور تمہارا وہ.....! اسٹوڈنٹ کزن ارمغان.....! کتنا روکتا رہا، منع کرتا رہا، مجھ سے دُور رہنے کی تاکید کرتا رہا.....؟ مگر تم..... تم سب کو ذلیل کر کے میری طرف بڑھتی ہی رہیں۔ ہاؤ.....! آئی ایم چارمنگ اینڈ ایئر ٹیکٹو بینک مین.....! اب اس میں تمہارا بھی کیا قصور.....؟ میں ہوں ہی ایسی چیز کہ لڑکیاں مجھے دیکھ کر پھیر کر توجہ پا کر سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ ہے ناں یہ ہی بات سویٹ ہارٹ.....؟“ طلحہ نے بے باکی سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا تو وہ چیخ گئی۔

”طلحہ.....! مان لیا کہ ہم نے غلط قدم اٹھایا، دھوکا دیا اپنے گھر والوں کو، بٹ لسی.....! تروالہ نہیں بنیں گے تمہارا۔“

علیزہ نے اس کے اپنے بالوں کی طرف بڑھتے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر پیچھے کیا۔

”واٹ.....! تروالہ.....؟ ہا.....! ہا.....!“ طلحہ کا ایک ہاتھ بیہودہ قہقہہ ان کی سماعتوں کو چیر چیر کیا۔

بدتمیزی سے پھر علیزہ کی طرف بڑھا۔

”سویٹ ہارٹ.....! ایک بات تو بتاؤ.....! وہ تمہارا فرسٹ کزن بہت چاہتا ہے ناں تمہیں.....؟ بٹ آئی ڈونٹ نو کہ وہ اپنی پہلی محبت کو سکیڈ ہیٹڈ روپ میں قبول کرے گا۔ میرے خیال میں اگر وہ واقعی تمہیں چاہتا ہے تو تمہیں کسی بھی روپ میں.....“

”شٹ آپ طلحہ ابراہیم.....! شٹ آپ.....!“

علیزہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور لڑکھڑاتے طلحہ کے منہ پر نشان چھوڑ گیا۔

تھا، مٹی کا تیل تھا جو اس کی جلتی آگ پر پڑا اور شعلے آسمان کو چھونے لگے۔

”علیزہ.....! علیزہ اب نہیں چھوڑوں گا۔“

طلحہ نے ڈیک آن کیا اور فل والیوم میں انگلش میوزک آن کر کے وہ ان دونوں کی طرف بڑھا۔ دونوں کی روح فنا ہو گئی، کمرے میں اتنا شور تھا کہ ان کی چیخ و پکار بھی باہر نہیں جاسکتی تھی۔

جب تک وہ شیطانی ارادے کے ساتھ علیزہ کی طرف بڑھتا خولہ نے گلدان پکڑ لیا تھا اور یہ طلحہ نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ علیزہ کو چھوڑ کر خولہ کی طرف بڑھا۔

”یو.....! کیوٹ بے بی.....! مجھے مارو گی.....؟“ وہ خولہ پر چھپنا۔ اس کے ہاتھ سے گلدان علیزہ نے چھین لیا اور طلحہ کے سر کے پیچھے دے مارا اور جیسے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

”عل.....! علیزہ.....! یہ.....! یہ.....! تم نے کیا کیا.....؟“ خولہ طلحہ کو خون میں لت پت دیکھ کر بیہوش ہونے لگی، اس کا دل جیسے دھڑکننا بھول گیا تھا، آنکھیں پتھر اگئی تھیں۔

”شٹ آپ.....! یہ مرتا ہے تو مرنے دو.....! کچھ نہ سوچو، کچھ نہ بولو، بھاگو.....!“

طلحہ ابراہیم زندہ تھا یا نہیں، اس بات کی ان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ علیزہ خولہ سے بڑی بھی تھی اور مضبوط اعصاب کی مالک بھی، اس وقت اس کے پیش نظر اس کی اور خولہ کی عزت تھی۔ اس نے خولہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا جس کے جسم سے جان گویا نکل رہی تھی۔

”عزت پیاری ہے تو بھاگو خولہ.....! بھاگو.....!“

علیزہ نے اسے گھسیٹا اور دروازے تک پہنچی۔

”اوہ نو.....!“

”عطیہ.....! عطیہ! صحت و حوصلے سے کام لو اللہ خیر کرے گا۔“ رات کے دو بج گئے تھے۔ خولہ گھر نہیں آئی تھی، عطیہ خاتون پر غشی کے دور سے بڑھ رہے تھے۔ آصفہ اور زوہان کو سنبھالے ہوئے تھیں جبکہ نعمان اور ظفر صاحب نجائے کہاں کہاں کی خاک چھان رہے تھے۔ ہر جگہ معلوم کر لیا تھا مگر کہیں پتا نہیں چلا۔

”آصفہ.....! میں شہباز صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گی.....؟ میں قیل ہو گئی ہوں آصفہ.....! کتنا مان، کتنا بھروسہ تھا شہباز صاحب کو مجھ پر۔ وہ خولہ کو میرے دھند میں ڈھلا دیکھنا چاہتے تھے۔ کیا میں بھی اتنی کمزور تھی اندر سے.....؟ کیا میرے اندر بھی ایسی کوئی خالی تھی.....؟ جمبول تھا جو میری تربیت کے ذریعے خولہ کے اندر، خولہ کے کردار، اس کی سوچ میں ڈھل گیا.....؟ یا اللہ.....! میں شہباز صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گی.....؟ مجھے اس وقت سے پہلے موت دے دے۔ اے پروردگار.....! میری فریاد سن لے، میں نے شہباز صاحب کے ساتھ بدعہدی کی ہے، مجھے نہیں جینا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی نظروں میں گروں، میں خود کو ختم کر دوں گی۔“

عطیہ خاتون آج بری طرح ٹوٹ گئی تھیں۔ انہوں نے کتنی محبت، ایمان داری سے یہ ذمہ داری قبول کی تھی، کتنی محبتوں سے پالا تھا خولہ کو۔ شاید کئی اولاد پر اتنی محبت نہ لٹا تیں۔ جتنی اس لڑکی پر لٹائی تھی اور اسی نے کتنی سفاکی سے انہیں آسمان کی وسعتوں سے نیچے پاتال کی گہرائیوں میں پھینک دیا تھا۔ وہ دیوار سے زور زور سے سرنگر رہی تھیں، وہ اتنی سٹیرک ہو رہی تھیں کہ آصفہ اور زوہا سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔

”عطیہ.....! پلیز اپنے حواس بحال کرو، اللہ سے خیر کی بھیک مانگو، نجانے اسے کیا حادثہ پیش آیا ہے.....؟ اللہ کرے وہ سلامت ہو اور خیریت کے ساتھ واپس آ جائے۔“

”نہیں آصفہ.....! نہیں چاہیے اس کا خالی وجود مجھے، اس نے میری، اپنے باپ، خاندان کی عزت، اعتماد، مان، بھروسہ داغدار کیا ہے۔ اللہ کرے اس کا ایکسڈنٹ ہو اور وہ مر جائے۔ اگر وہ زندہ آگئی تو ناتوا..... تو آصفہ.....! نہ وہ رہے گی اور نہ میں۔ میں چاہتی ہوں شہباز صاحب کو ہم دونوں کی موت کی خبر ملے۔ خولہ کی بے وفائی یا میری تربیت کی ناکامی کی خبر نہ ملے، میں ان کا سامنا نہیں کر سکتی۔“ عطیہ خاتون صدے سے بار بار بیہوش ہو رہی تھیں۔ اس وقت بھی وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئیں۔ آصفہ بری طرح گھبرا گئیں۔



”زوہا! اپنے پاپا کو فون کرو، جہاں ہیں، آجائیں! عطیہ کو ہاسپٹل لے جانا ضروری ہو گیا ہے۔“  
 اوہ! شکر ہے آپ لوگ آگئے۔ کوئی خبر.....؟ کوئی آتا ہوتا.....؟“  
 آصفہ کی بات ابھی جاری تھی کہ ظفر اور نعمان آگئے۔  
 ”نہیں.....! ہر جگہ معلوم کر لیا ہے، کوئی نشان مل کر نہیں دے رہا۔“ ظفر صاحب تھک کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”پاپا! میری بات مانیں تو شہباز صاحب کو اطلاع کر دیں یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ عطیہ آنٹی کی حالت بھی اچھی نہیں، ان کو اطلاع دینا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔“  
 ”یہ سب بھی ہو جائے گا بیٹا.....! پہلے گاڑی نکالو عطیہ کو ہاسپٹل لے چلتے ہیں۔“ ظفر نے عطیہ کی نہیں دیکھ کر نعمان سے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔

”پاپا! خولہ کے موبائل پر.....“ زوہا کی بات پر ظفر دُکھ سے مسکرائے۔  
 ”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے اس کے موبائل پر کال نہیں کی.....؟ بیٹا! اس کا موبائل ناٹ رسپانڈنگ پر ہے۔ اللہ جانے کیا صورت حال ہے اس کے ساتھ.....؟ چلو آصفہ! اور زوہا بیٹا! عطیہ بہن کو احتیاط کے ساتھ گاڑی میں بٹھاؤ۔“  
 ظفر صاحب نے نعمان کو آتے دیکھ کر کہا اور سب نے بیہوش پڑی عطیہ خاتون کو گاڑی میں ڈالا اور ہاسپٹل کی طرف چلے گئے۔

”آپنی.....! کہاں ہیں آپ.....؟ آپ نے تو ماما کو بابا کے سامنے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ ماما تو سب لٹا کر بھی بابا سے ہار گئی ہیں۔ یہ آپ نے کیسا انتقام لیا ہے ماما سے.....؟ آپنی.....! آپ کی خود سری نے سب کچھ..... سب کچھ جلا کر بھسم کر ڈالا ہے۔ ماما سے انتقام لیا یہ اتنا خوف ناک، بھیا تک طریقہ کیوں اپنایا آپ نے.....؟“

گھڑی نے تین بجائے تو جواد کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ وہ جو سارا شہر چھان کر تھک چکا تھا، ٹوٹ کر قالین پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

ارمغان کی حالت بھی بہت عجیب تھی۔ جواد تو رو سکتا تھا بھائی تھا علیزہ کا مگر وہ اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ صبر، ضبط اور تھکن کا غبار ارمغان کی آنکھوں میں ڈھواں بن کر بھر گیا تھا، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، وہ ہار کر جواد کے قریب بیٹھ گیا تو جواد اس کی گود میں سر رکھ کر شدت سے رو پڑا۔

”آپنی.....! کہاں ہوں گی مانی بھیا! ہم نے تو شہر کا کونا کونا چھان مارا ہے۔ وہ..... وہ کہاں چلی گئیں.....؟ کیا حادثہ پیش آ گیا ہے ان کو.....؟ آپنی.....! خدا کے لیے آ جاؤ.....!“

”جو لوگ اپنی ان دیکھی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے خود سری سے گھر کی دہلیز چھوڑتے ہیں ناں جواد.....! وہ اکثر راستے بھول جایا کرتے ہیں۔“ ارمغان کو احساس ہی نہیں ہوا۔ ہوا تو تب جب گریبان تر ہو گیا۔

”بھائی.....! ماما کو بتادیں کیا.....؟“

”نہیں.....! انتظار کے جگنو ابھی منتظر ہیں اور میں نا اُمید نہیں ہوا ہوں۔“ ارمغان کی بات اُدھوری تھی کہ فون کی تیل پر دونوں برق رفتاری سے فون کی طرف لپکے۔

●●●

”کیا واقعی شرجیل اب یہاں سے چلا جائے گا.....؟“

یہ بات سوچتے سوچتے ہادیہ کو کتنی دیر ہو گئی، کتنے لمحے اس حقیقت کو لیے چپکے سے آگے بڑھ گئے، نہ جانے کب سے وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی مسلسل شرجیل کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ جب وہ آیا تھا، کتنا عجیب سا تھا کہ اسے اس سے خوف سا آتا تھا مگر اب اس کے چلے جانے کے خیال سے اک اُداس سی شام دل کے آگن میں اُتر آئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہی شرجیل جس سے وہ بے حد چڑتی تھی اور اس کے چلے جانے کی دُعاں کیا کرتی تھی، اس کے چلے جانے کا خیال پانی بن کر آنکھوں میں تیرنے لگے گا۔

وسیع آسمان پر اب شام کے دُھند لکے اُتر آئے تھے اور وہ یوں ہی کھڑی شرجیل کو سوچے جا رہی تھی جس کی شخصیت یوں نکھر کر سامنے آئی تھی کہ وہ اس کے آئیڈیل کے پیکر میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز، اس کے لہجے کا اعتماد، اس کی ٹیبلر آواز، اس کا دراز قد، ڈرینگ میں وقار اور نفاست، عزت اور اس کی معصوم شرارتیں، بے ساختہ جملے، سب ہی کچھ تو اس کی پسند کا تھا۔

”جب ہم کسی کی پروا کرنے لگتے ہیں، جب کسی کا آنا جانا ہمارے لیے اہمیت اختیار کر لیتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو اس بندے سے محبت ہے۔“

شرجیل کی بوجھل آواز میں دُھلا یہ جملہ اس سے اپنی محبت کا اقرار کروا گیا تو وہ اُلجھ سی گئی۔  
 ”کیا مشکل ہے.....؟ کیوں سوچے جا رہی ہوں میں ایک بونگے شخص کے بارے میں.....؟ جاتا ہے تو جائے، مجھے کیا.....؟“

ہادیہ نے اُکتا کر گود میں رکھا کشن دیوا پر مارا اور اُٹھ کر کھڑکی زور سے یوں بند کی گویا شرجیل پر اپنی سوچوں اور خیالوں میں آنے پر پابندی لگا رہی ہو۔

”اس کے جانے کی مجھے پروا نہیں ہے تو اس بیقراری کا سبب کیا ہے.....؟ یہ بے چینی کس نام کی ہے.....؟ یہ آنسو بے نام کیوں ہیں.....؟“ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بری طرح رو دی۔ انسان اس وقت زیادہ اُلجھتا ہے جب وہ ایک حقیقت کو مان لینا بھی چاہتا ہو اور اس سے انکاری بھی ہو۔ ایسی درمیانی سی کیفیت کی لہریں بار بار جب ساحل تک لاتی لے جاتی ہوں تو انسان بے دم ہو جاتا ہے۔ وہ شرجیل کو چاہنے لگی ہے اور اس کو اس کے چلے جانے کا دُکھ ہے۔ یہ حقیقت تسلیم کرنے اور انکار کرنے والی کیفیت سے دو چار وہ مغرب کی نماز پڑھ کر کتنی دیر روتی رہی۔

عالیہ بھابی کے بلانے پر وہ نیچے آگئی اور آتے ہی شرجیل سے مڈ بھیر ہو گئی جو ابھی ابھی مسجد سے لوٹا تھا۔ اسے دیکھ کر شوخیاں شرجیل کی آنکھوں میں رقصاں ہو گئیں۔ ہادیہ کے چہرے اور آنکھوں سے صاف لگ رہا تھا وہ شدت گریہ کا شکار رہی ہے۔ وہ اس کی متورخم آنکھیں دیکھ کر جاتے جاتے پلٹا اور پوی کو گود میں اٹھا کر ہادیہ کو



دیکھنے لگا۔

”یار پوی.....! لگتا ہے کہیں بہت موسلا دھار بارش ہوئی ہے۔“

”نہیں تو چاچو.....! بارش تو بالکل بھی نہیں ہو رہی۔“

”اچھا.....! خیال تو میرا بھی یہی ہے مگر اپنی پچھو سے پوچھو بارش کیوں ہوئی ہے.....؟ بے سبب تو“

نہیں سکتی۔“

شرجیل کے دل پر ان دیکھی نمی اک ادا سی پیدا کر رہی تھی۔

”پچھو.....! بارش ہوئی ہے کیا.....؟ نہیں ہوئی ناں.....؟“

شرجیل کی آنکھوں کے اشارے کو سمجھتے ہوئے پوی نے اپنی بات دہرائی تو ہادیہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے ایک

تیز نظر شرجیل پر ڈالی اور پھر پوی کو اس کی گود سے لے لیا۔

”بہت فضول بولنے لگے ہو، کوئی بارش وارش نہیں ہوئی۔“ وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی تو شرجیل اس

سامنے آن کھڑا ہوا۔ کچھ دیر اس کی غم پلکیں دیکھتا رہا۔

”بارش تو ہوئی ہے، یہ بھیگی پلکیں گواہی دے رہی ہیں کہ بارش ہوئی ہے اور کتنی دیر تک ہوئی ہے۔“

اب وہ شرجیل نہیں تھا کہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا۔ یہ ایک پراختیاد مرد تھا مگر عورت کے آنسو اس سے

پہلے برداشت ہوتے تھے نہ اب۔ بھیگی پلکوں میں اسے ماہم اور اپنی مہم کی مجبوری نظر آئی اور ہادیہ بھی تو اس کے

دل کے کینوں میں سے تھی۔ اس کے آنسو، اس کی بھیگی پلکیں کیسے برداشت کرتا، بس کوفت سی ہو رہی تھی۔ ہونا تو

یہ چاہیے تھا کہ اسے ان سے غرض نہیں ہونی چاہیے تھی مگر ہادیہ تو اس کے دل میں ابھرنے والا وہ لطیف احساں تھا

جو اس سے قبل اس نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اگر اسی کا ہام محبت تھا تو اس نے ہار ہا چکے چیکے اعتراف محبت

لیا تھا اور وہ اب جانے کیوں جاننا چاہتا تھا یا اندر کہیں یہ خواہش تھی کہ وہ کہہ دے کہ یہ بارش تمہاری وجہ سے ہوئی

ہے۔ تب ہی تو وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور دوسری طرف ہادیہ کو غصے کے ساتھ پھر رونا آ رہا تھا۔ اس وقت وہ

اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کجا وہ اب ان آنسوؤں کی وجہ ہو کر بھی انجان بنا پوچھ رہا تھا، وہ چڑ گئی۔

”ہاں.....! ہوئی ہے بارش اور بہت ہوئی ہے، آپ سے مطلب.....؟“

وہ غصے سے بولی اور آگے بڑھنے لگی۔ شرجیل نے پھر ہاتھ بڑھا کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

”ہوں.....! گڈ.....! درست فرمایا آپ نے، بھلا مجھے کیا مطلب ہے اور کوئی مطلب ہو یا نہیں.....؟“

چاہیے.....؟“ وہ قدرے برہم سا بولتا آگے بڑھا، وہ خفگی سے اس انجان کی پشت کو بھیگی پلکوں سے دیکھ رہی

تھی کہ وہ ایڑیوں پر گھوم کر ایک سرعت سے اس کی طرف مڑا کہ وہ نمی کا بھرم بھی نہ رکھ پائی۔ وہ اس کے قریب

آگیا، ذرا سا جھکا۔

”لیکن کیا کریں مس ہادیہ.....! کہ کبھی کبھی کسی انجان اجنبی سے ایسا تعلق بن جاتا ہے کہ اس سے بے باق

رشتے کی ڈور بندھ جاتی ہے کہ وہ انجان اجنبی ہماری پہچان، ہمارا حوالہ بن جاتا ہے اور میرے ساتھ بھی کچھ ایسا

ہی ہوا ہے کہ ایک اجنبی میری پہچان بن گیا ہے۔ مہمان بن کر دل میں آیا اور میزبان بن گیا، کیا کریں.....؟“

ہمارے راستے ان بھیگی پلکوں تک آ کر ختم ہو جاتے ہیں، ہمارے راستوں کی منزل انہی بھیگی پلکوں کی اوٹ میں

چھپی ہے۔“

شرجیل کی گھیسر آواز میں اس کے خواب اس کی تمنائیں لفظوں میں ڈھل کر مسکرائیں تو ہادیہ نے ایک نظر

اسے دیکھا اور پلکوں کی اوٹ پر اٹکے دو آنسو پ سے گرے اور اس کے ہاتھوں میں چھپ گئے۔

”اگر.....! اگر ایسا ہے تو پھر.....“

وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ خود داری آڑے آگئی۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئی مگر کبھی

کبھی ادھوری بات بھی زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے اور شرجیل بھی کتنی ہی دیر اس ادھوری بات کے بحر میں مچور سا ہو

کر اس طرف دیکھتا رہا جہاں سے ابھی ہادیہ گئی تھی۔

”تھینک یو ہادیہ.....! تمہارے اس ادھورے جملے نے میری زندگی، میری محبت مکمل کر دی ہے۔ جانا تو

مجھے ہے ہی، جاؤں گا تو تمہیں لینے آؤں گا۔“ وہ وہیں کھڑا جانے کب تک آنے والے لمحوں کی آہٹیں سنتا کہ

عرفان آگئے۔

”ارے شرجیل صاحب.....! یہ اکیلے اکیلے کیوں مسکرایا جا رہا ہے.....؟ ہمیں بھی اپنی مسکراہٹوں میں

شریک کر لیجئے۔“

”کیوں نہیں عرفان بھائی.....! آپ ہی کا تو سب سے زیادہ ان پر حق ہے کیونکہ اللہ نے آپ ہی کو تو

وسیلہ بنایا ہے میرے ہونٹوں پر ایسی زندگی سے جبر کرنا مسکراہٹیں لانے کا۔“

اپنی گزشتہ زندگی کا تصور اس کی مسکراہٹ کی روشنی کو کم کرنے لگا تو عرفان نے اس کا دھیان دوسری طرف

کر دیا۔

”اور جناب.....! یہ جان کر آپ کو اور بھی خوش ہوگی کہ رات اباجان آرہے ہیں پھر جناب.....! ہم سب

آپ کو آپ کے گھر چھوڑ کر آئیں گے۔“

”ارے.....! انکل آرہے ہیں.....؟ لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ ابھی کچھ دن.....“

”ہاں.....! پہلے ان کا بھی ایسا ہی پروگرام تھا مگر جب انہوں نے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں نے

ساری تفصیل سمجھائی تو انہوں نے کہا میں آرہا ہوں۔ تمہارے بارے میں بہت کرید کرید کر پوچھا ہے انہوں

نے۔“

”میں کیوں.....؟“ شرجیل کے لیے عرفان کے والد کا اپنے لیے یوں فکر مند ہونا حیران کن تھا۔

”آئی ڈونٹ نو یار.....! اب آئیں گے تو ہوتا چلے گا، کیوں.....؟“

دونوں مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔

● ● ●

”آج ایک عجیب سا سکون و اطمینان ہے ماہم.....! کہ جیسے..... جیسے شرجیل سامنے کھڑا ہو۔“

قرآن شریف پڑھ کر، چوم کر، سینے سے لگا کر آمنہ نے ماہم پر اور خود پر پھونک مار کر کہا۔ آج ان کے

چہرے پر عجیب سے سکون کی کرنیں تھیں۔ ماہم نے پیار سے ان کو دیکھا۔

”جی ماما.....! وہ سامنے ہی تو کھڑے ہیں۔ بس دروازہ کھلنے کی دیر ہے۔“ ماہم کا دل چاہا کہ ماما کو بتا دے



کہ ان کی تمام دعائیں سن لی گئی ہیں مگر شرجیل کی طرف سے ہدایت تھی جب تک وہ نہ کہے وہ نہیں بتائے گی۔  
واصف کی ان دونوں طبیعت بہت خراب تھی، ماہم بری طرح گھبرا گئی، اس نے گھبرا کر عارف چاچو کو سب کچھ بتا دیا۔

”ارے بیٹا..... اتنی بڑی خوشخبری تم چھپائے بیٹھی ہو.....؟ بھائی جان کی حالت دیکھی ہے تم نے.....؟  
وہ تو احساسِ جرم کی وجہ سے اندر ہی اندر گھلتے جا رہے ہیں۔ ایسی بات تم نے چھپائی کیوں.....؟ کہاں ہے شرجیل.....؟ مجھے ابھی لے چلو اس کے پاس۔“

عارف نے ذرا تند لہجے میں ماہم کی خبر لے ڈالی تو ماہم ان کو تیمور کے ساتھ شرجیل کے پاس لے گئی۔  
شرجیل کو دیکھ کر پہلی نظر میں تو عارف چونک گئے، وہ اسے ساتھ لگائے کتنی دیر روتے رہے، اس کے گھر سے چلے جانے کا سب کو دکھوں کی دلدل میں دھکیلنے کا ذمہ دار چونکہ ان کا اپنا بیٹا تھا اس لیے وہ خود کو مجرم سمجھتے تھے۔

”مجھے معاف کر دو بیٹا.....! تمہاری اس در بدری کا ایک سبب میں بھی ہوں۔“ عارف کے لہجے میں ندامت تھی۔

”ایسا نہ کہیں چاچو.....! کوئی کسی کا مجرم نہیں، اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے، راز ہوتا ہے اور ہمیشہ انسان کی بہتری کے لیے ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں موبی کی باتوں کی وجہ سے گھر سے نکلا ضرور تھا لیکن نہ میں جانتا تھا اور نہ کوئی اور کہ میرا گھر سے نکلنا کتنا بہتر ہوگا میرے لیے، سب کے لیے۔ دیکھئے ناں، میں گھر سے یوں ذرا دل بہلانے کے لیے، موبی کی باتوں کے اثر کو زائل کرنے کے لیے نکلا تھا مگر کیا خبر تھی کہ یہ انجان راستے مجھے شعور کی منزل کی طرف لے جائیں گے۔ انہی اجنبی راستوں پر ایک مہربان شناسا میرا منتظر ہے جو اننگی پکڑ کر مجھے میری منزل کی طرف لے جانے کا خطر ہے۔ دیکھئے ناں، یہ بات کتنی درست ثابت ہوگئی کہ سفر وسیلہ ظفر بن گیا۔ ذرا موازنہ کیجئے اس شرجیل سے جو کل تھا اور جو آج ہے، اسی در بدری کی بدولت تو ممکن ہوا ہے۔ اللہ نے وسیلہ تو بنانا ہی ہوتا ہے، تو بس اب آپ خود کو کوئی الزام نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے کتنا اچھا کیا ناں کہ آپ کا وہ پاگل، جھلا شرجیل آج اتنا خوب رو، اسٹارٹ، سمجھ دار نو جوان بن گیا ہے۔ ہے ناں ماہم.....!“

شرجیل نے عارف چاچو کے آنسو صاف کرتے ہوئے ماہم کو دیکھا جو بس اپنے پیارے بھائی کو دیکھ دیکھ کر جی رہی تھی۔ اس نے شرجیل کے ہاتھ پر پیار کر لیا۔

”میرے بھیا جیسا تو کوئی ہے ہی نہیں، اللہ تیرا شکر ہے۔“  
”شرجیل.....! موبی نا سمجھ ہے، میں اس کی حمایت نہیں کروں گا مگر درخواست ضرور کروں گا کہ تم اسے معاف کر دینا۔“

عارف کو اب بھی شرمندگی ہو رہی تھی کہ موبی کی وجہ سے شرجیل کو اتنا سفر کرنا پڑا۔  
”کیسی باتیں کرتے ہیں چاچو.....! میرا بھائی ہے، اپنا تو میں اس کو خون بھی معاف کر سکتا ہوں مگر ماہم کے ساتھ اب اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو.....“ حدادب ملحوظ رکھتے ہوئے شرجیل کی آواز میں سختی آگئی۔

”نہیں بیٹا.....! اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا لیکن اب گھر چلو، بھائی جان کی حالت اچھی نہیں، وہ بھی

اپنے اندر مجرم بنے لمحہ لمحہ ختم ہو رہے ہیں۔“  
”جی چاچو.....! میں خود بے تاب ہوں مگر ابھی عرفان بھائی کے ابا جان آنے والے ہیں، ان سے مل کر آؤں گا، میں خود بہت بے تاب ہوں ماما پاپا سے ملنے کے لیے۔“ شرجیل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

خاموش بیٹھے عرفان نے کہا۔  
”انکل.....! آپ پہلے جا کر واصف انکل کو آہستہ آہستہ یہ بتائیے کہ شرجیل کے بارے میں اچھی خبر ملی ہے، ایک دم سے اتنی بڑی خوشخبری ایک ہارٹ پیڈنٹ کے لیے خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔“ سب نے ہی ان کی بات پر اتفاق کیا۔

گھر واپس آ کر عارف، واصف اور آمنہ کے کمرے میں چلے آئے۔ آمنہ جائے نماز پر سر جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھیں اور چہرے پر حزن و ملال لیے واصف چھت کو خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عارف نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں پر پڑے دینر پردے پیچھے کھسکا دیئے۔

”باہر اتنی خوبصورت روشن صبح ہے اور آپ لوگ آج پردے گرائے بیٹھے ہیں.....؟“ آمنہ نے ایک نظر واصف پر دوسری عارف پر ڈالی اور کچھ بولے بغیر پڑھتی رہیں، البتہ واصف کو عارف کا یہ انداز اچھا نہیں لگا، کچھ بدگمان وہ ان سے یوں بھی تھے کہ ان کے بیٹے کی وجہ سے شرجیل گھر چھوڑ کر گیا تھا۔

”پردے گرا دو عارف.....! جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو پردے گرا دیئے جاتے ہیں۔“ ان کی آواز میں غمگینی نمایاں تھی۔

”لیکن جب کچھ شروع ہوتا ہے تو پردے اٹھالیے جاتے ہیں بھائی جان.....! اچھا خیر.....! آپ نے میڈیسن لے لی ہے ناں.....؟“ عارف ان کی غمگینی کو محسوس کر گئے تھے مگر اب وہ مطمئن تھے کہ شرجیل مل جائے گا تو ان کی ساری ناراضگی ختم ہو جائے گی۔

”نہیں کھائی دو انہوں نے، ان کا بیٹا ہی ان کا سب کچھ ہے، مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ نہ جین گے نہ جینے دیں گے۔“

آمنہ جو اتنے عرصے سے صبر کر رہی تھیں آج نجانے کیوں سارے دامن ہاتھ سے چھوٹ گئے اور وہ بہہ گئیں۔

”بھابی.....! ہمت اور حوصلے سے کام لیں، اب تو منزل بہت قریب ہے۔ میرا یہ مطلب ہے کہ بھائی صاحب خاصا تنگ کرتے ہیں آپ کو۔ بھائی جان.....! میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ شرجیل آپ کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتا ہے۔“

عارف کی بات پر واصف نے کچھ ایسی زخمی اور شاک کی نظر ڈالی کہ عارف کو اپنی بات کا افسوس ہونے لگا۔

”ہاں.....! میں مانتا ہوں کہ میں مجرم ہوں، صرف میں ہی مجرم ہوں میرے ہی گناہوں کی سزا ملی ہے مجھے، کوئی یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ میرا بیٹا میری زندگی ہے.....؟ میرے سینے میں دھڑکنے والا دل ہے.....؟ آنکھ کا نور ہے.....؟ میری رگوں میں دوڑنے والا خون ہے.....؟ زندگی کا احساس ہے.....؟ ارے.....! کوئی اسے بتا دو میں نہیں رہوں گا، میں نہیں جی پاؤں گا اس کے بغیر، کوئی تو اسے بتا دو، ایک بار، ایک بار لوٹ آئے، مجھے



معاف کر دے، میرے سینے میں لگی آگ بجھا دے، کوئی تو اسے بتا دے کہ میں سانس لے رہا ہوں تو صرف اس کے لیے، صرف اس کے لیے۔“

واصف بری طرح رو پڑے تو آمنہ جس کو اپنے رویے اور بات کا شدید احساس ہوا تھا اٹھ کر ان کے قریب آگئیں اور ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

”صرف..... صرف بیٹا ہی آپ کی زندگی ہے واصف..... میں کہاں ہوں؟ ماہم کہاں ہے؟.....؟“

”بھائی جان.....! آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری کون سی ہو سکتی ہے؟“ عارف کی بات پر واصف نے پھر شاکہ کی نظر ان پر ڈالی۔

”سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھ رہے ہو.....؟ میرے شرجیل کے آنے کی خبر مل جائے تو..... تو میں اسے دیکھ کر ایک بار سینے سے لگا لوں تو پھر چاہے میری جان نکل جائے۔“ واصف کے دل میں دودھ بولنے لگا۔

آمنہ نے چونک کر ان کو دیکھا پھر عارف کو دیکھا جو پریشان ہو گئے۔ انہوں نے بات بکے بکے ہلکے انداز میں شروع کی۔

”ایسا ہے تو پھر تو ہم آپ کو ہرگز خوشخبری نہیں سنائیں گے۔ بھئی.....! آپ کو اپنا بیٹا عزیز، ہمیں ہمارا بھائی اور بھابھی کو اپنا شوہر پیارا، کیوں بھابھی.....!“

”عارف.....! عارف تمہارے انداز میں مجھے خوشی بھانکتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ کہو ایسا ہی ہے ناں.....؟“

میرے شرجیل ہی کے بارے میں کوئی خبر ہے ناں.....؟ تم ایک مدت کے بعد اسے بھرپور انداز میں مسکرائے ہو۔ بولو.....! کیا خبر ہے میرے بیٹے کے بارے میں.....؟“

آمنہ نے بیقراری سے عارف کو پکڑ لیا تو ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ اسی طرح آہستہ آہستہ یہ خبر دونوں کو سنانا چاہتے تھے۔

”عارف.....! آمنہ کیا کہہ رہی ہے.....؟ کوئی خبر ہے میرے بیٹے کے بارے میں.....؟ اچھی خبر.....؟ جلدی بتاؤ ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔“

واقعی واصف کا بیمار دل بے ترتیب ہونے لگا تھا، ان کے چہرے پر عجیب سے رنگ آنے لگے تھے، چہرے اور ہاتھوں میں اترتی نمی عارف کو خوفزدہ کر گئی۔

”بھئی.....! جائیں بھائی صاحب.....! آپ بھی ناں اتنے کمزور دل ہیں کہ ہمیں اچھی خبر دیتے ہوئے بھی خوف آرہا ہے کہ.....“

”نہیں.....! میرا دل بہت مضبوط ہے، دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پلیز.....! مجھے اچھی خبر سنا دو.....!“

میرے شرجیل کے بارے میں.....“

واصف نے بیقراری سے عارف کے ہاتھ تھام لیے۔ ان کی ظاہری حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے اندر درد کا جہاں آباد ہو گیا ہے مگر اب بتانا بھی ضروری تھا۔

”دیکھا، آپ کے دل نے پھر ڈرامہ شروع کر دیا ناں.....؟ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو آپ کا بیٹا مجھے معاف

نہیں کرے گا۔“

عارف نے آہستہ آہستہ اصل بات کی طرف آرہے تھے۔

”عارف.....! بتاؤ ناں کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہو.....؟ میں اب اتنا بھی کمزور دل نہیں۔ ارے یار.....! ایک آدھ ہارٹ ایک نے مجھے اتنا بزدل مشہور کر دیا کہ..... آمنہ.....! اسے بولو ناں کوئی خوشخبری ہے تو چھپائے نہیں، بتا دے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

کمال ضبط سے واصف نے اٹھتی ٹیسوں کو دبایا تو آمنہ نے عارف کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ دیا۔

”اگر میری ذرا بھی پرواہ ہے تو بتاؤ کیا بات ہے.....؟ کیا خبر ہے.....؟“

”توبہ ہے بھابھی.....! ایک تو آپ دونوں میاں بیوی ناں..... خیر جناب کوئی سکون سے تھوڑی بیٹھے ہوئے تھے.....؟ ہم نے چاروں طرف گھوڑے دوڑائے ہوئے تھے جنہوں نے اب خبر دی ہے، بہت ہی اچھی خبر ہے کہ ہمارا بیٹا شرجیل جہاں ہے بالکل ٹھیک ہے، خوش ہے۔“

”کک..... کک..... کہاں ہے میرا بیٹا.....؟ میرا شہزادہ.....؟ مجھے ابھی..... ابھی اسی وقت اس کے پاس جانا ہے یا اسے اپنے سامنے دیکھنا ہے، میں اسے سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ یار عارف.....! تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائے.....؟ چلو ابھی چلتے ہیں، میرے بیٹے کے پاس، میں خود اسے منا کر لے کر آؤں گا۔“

”اس..... اس خبر میں واقعی کوئی حقیقت ہے یا صرف اپنے بھائی کو بہلا رہے ہو عارف.....!“ آمنہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔

”دوسروں کو دھوکا دینا، بھلانا بہت آسان ہوتا ہے بھابھی.....؟ لیکن خود کو نہیں۔ آپ دیکھیں میں کتنا خوش اور مطمئن ہوں۔ کیا میری مسکراہٹ کا اطمینان، میری آنکھوں کی چمک، میرے لہجے کی کھنک اس خبر کی سچائی کی ضمانت نہیں دیتی.....؟ بولے بھابھی.....!“

”ہاں ہاں.....! تمہارے چہرے کی ہر مسکراہٹ نے تو ہی میرے اندر بھی روشنی پھیلا دی تھی۔ کہاں ہے شرجیل.....؟ تم نے اسے ان کے ماما کی تڑپ کے بارے میں کچھ بتایا نہیں.....؟ اسے بتایا نہیں کہ اس کی بہن ماہم کس طرح حرف زعابن کر رہی گئی ہے.....؟“

”ارے.....! بہن کی چھوڑیے، بہت گھنی ہے، سب سے پہلے اسی کو اس کی خبر ملی تھی شرجیل کے بارے میں۔“

”ارے عارف.....! تم..... تم ابھی یہیں کھڑے ہو.....؟ چلو مجھے میرے بیٹے کے پاس لے چلو، آج میں خود گاڑی ڈرائیور کروں گا۔“ واصف خوشی سے دیوانے سے ہو رہے تھے۔

”پاپا.....! ہم بھائی کے پاس جائیں گے لیکن کل، ہمارے لیے یہ کیا کم ہے کہ بھائی ہمیں مل گئے ہیں.....؟“ اسی وقت ماہم اندر آئی۔

”کیوں ماہم.....! آج کیوں نہیں.....؟“ بیقرار باپ، بیتاب ماں بیٹے کے لیے چل چل گئے مگر عارف اور ماہم نے ان دونوں کو سنبھال ہی لیا۔



”کیا بات ہے شرجیل.....! ابا جان سے مل کر، ان کی باتیں سن کر تم خوش نہیں ہوئے.....؟“

”ایسا نہیں ہے عرفان بھائی.....! لیکن یہ ضرور ہے کہ کچھ خوشیاں اپنے دامن میں عجیب سے دھکوں کی خبریں بھی لاتی ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس شخص کی وجہ سے ہم نے زندگی کو نہیں زندگی نے ہمیں جیا ہے وہی شخص میرے محسن کا باپ ہوگا۔ اس شخص کا باپ جس کے لیے میں جان بھی دے سکتا ہوں، جس نے مجھے ڈوبنے سے بچایا، مجھے بے یقینی کی دلدل سے نکالا، اس محسن کے باپ..... کیا مشکل ہے عرفان بھائی.....! کہ ہمارے قاتل کا بیٹا ہمارا میاں نکلا۔ میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا تھا عرفان بھائی کہ اس شخص حسن کی وجہ سے ہم نے کتنی مشکل اور ایب نارمل زندگی گزاری ہے۔“

شرجیل عہد گزشتہ کا ایک ایک لمحہ یاد کر کے دھکی ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو اسے اپنے محسن عرفان سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی جس کا اس سارے قصے میں کوئی قصور ہی نہیں تھا۔

”شرجیل.....! تمہیں تو یہ حقیقت آج پتا چلی ہے ناں، مجھے یہ سب اسی روز معلوم ہو گئی تھی، تب ہی تو شرجیل.....! میں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھا اور تم پر خاص توجہ دی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ کہیں نہ کہیں میرے اپنے والد کی غلطی بھی ہے اور میں اپنے طور پر اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب نجانے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں مگر تمہاری غلطی دیکھ کر تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔“

”نہیں عرفان بھائی.....! یہ آپ نے کیسے کہہ دیا.....؟ ارے آپ تو سو فیصد سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اگر مجھے اس بتانی تک لانے میں آپ کے والد کا ہاتھ تھا تو ڈوبنے سے بچانے میں بھی ان کے بیٹے کا ہاتھ ہے۔ میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اتفاق ہے.....؟ یہ زندگی کے راستوں کا کیا موڑ ہے.....؟“ حسن جھباہر کھڑے یہ گفتگوں رہے تھے اندر آگئے، نادم لہجے میں بولے۔

”بیٹا شرجیل.....! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کتنی نفرت کرتے ہو اور کرنا بھی چاہیے کیونکہ میری کمزوری کی وجہ سے تم کو تمہاری ماں کو زندگی کی اتنی مشکلات دیکھنی پڑیں مگر تم اجازت دو تو میں کچھ کہوں.....؟“

شرجیل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس کا نام بچپن سے سنتے سنتے اور اس نام کے حوالے سے اس کی ماں اور یہ دونوں بہن بھائی سزا بھگتے آرہے تھے تو اس وقت وہ کتنی شدت سے دُعا مانگا کرتا تھا کہ کاش یہ شخص کہیں مل جائے تو وہ اس کا گلا دبا دے جس نے ان کی زندگی بھیم بھار رکھی تھی۔ اس کے نام کی سزا وہ بھگتتے ہوئے ایب نارمل ہو گئے تھے۔ آج جب دُعا میں قبول ہوئیں، وہ شخص سامنے آ بھی گیا مگر کس حیثیت سے، اس کے محسن کے باپ کی حیثیت سے۔ وہ صوفے پر سر جھکائے اپنے اندر ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ ان کی باتیں سنتا رہا جن کی باتیں سچ تھیں، حقیقت تھیں۔

”بیٹا.....! میں مانتا ہوں میں نے گھٹیا پن کیا، محبت اور دولت میں سے میں نے دولت کا انتخاب کیا اور آئندہ کو بلندی پر چڑھا کر خود غرضی سے میڑھی ہٹائی، میں خود تو عاقب ہو گیا، یہ تک نہیں سوچا کہ آئندہ کی زندگی پر میری بے وفائی نے کیا کہانی رقم کر دی ہے۔ میں عرفان کی والدہ کے ساتھ زندگی کی خوشیاں چنتے ہوئے ہر گز نہیں سوچ سکتا تھا کہ آئندہ کو اور اس کے بچوں کو میری بے وفائی کی کیا قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا، دولت جوانی اور خود غرضی کا نشہ اُترتا تو مجھے پتہ چلا کہ واصف نے آئندہ اور بچوں کو میری وجہ

سے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تب مجھے بے حد دکھ ہوا مگر اپنی غلطی کا شدت سے احساس مجھے اس وقت بڑی بری طرح ہوا جب مجھے پتا چلا کہ آئندہ کا بیٹا اپنی پہچان کھو بیٹھا ہے۔ تب میں خدا کے حضور رویا، گڑ گڑایا کہ ہمارے گناہوں کی سزا تم لوگوں کو ملی۔ واصف اگر مردانگی کا ثبوت دیتا تو آئندہ کو معاف بھی کر سکتا تھا مگر افسوس کہ واصف بھی میری طرح کمزور مرد ثابت ہوا، آئندہ کو معاف کرنے کی بجائے اسے اس گناہ کی سزا دیتا رہا جو اس نے کیا ہی نہیں۔ بہر حال دکھ تو اس بات کا ہے کہ آئندہ کی زندگی میں دو مرد آئے، دونوں ہی کمزور، خود غرض اور کم ظرف۔ میں آئندہ کے اور تم دونوں کے لیے جلتا رہا، کڑھتا رہا، دُعا میں کرتا رہا کہ پروردگار ایسا کوئی معجزہ کر دے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے اور خدا نے میری دُعا میں سن لیں۔ یہ سب ہوا تو کسی مگر میرے ہاتھوں نہیں میرے بیٹے کے ہاتھوں۔ جب عرفان نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میں خدا کے حضور سجدے میں گر گیا کہ اس کی پاک ذات کا شکرانہ کس طرح ادا کروں۔ تب میں نے عرفان سے کہا تمہیں میرے آنے تک روکے اسی لیے تمہیں عرفان نے میرے کہنے پر روکا تا کہ یہ حقائق میں تمہارے گوش گزار کر کے تم سے معافی مانگ سکوں۔ بیٹا.....! جو کچھ ہمارے ماضی میں ہوا اس میں آئندہ اور تم دونوں بچے بے قصور ہو، واصف اور میں گناہ گار ہیں۔ چاہو تو معاف کر دو، چاہے تو سزا دے دو میں حاضر ہوں بیٹا.....! اصل میں میں ذمہ دار ہوں تم لوگوں کی بربادی کا، برائے خدا مجھے معاف کر دو پلیز.....! درگزر کے معاملے میں اپنے باپ والا رویہ اختیار نہ کرنا ورنہ یہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ بیٹا.....! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو ورنہ میرے اندر عداوت اور شرمندگی کی آگ کبھی نہیں بجھے گی اور مجھے سکون نہیں آئے گا۔“

”یہ.....! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں.....! انکل.....! کیوں گناہ گار کر رہے ہیں مجھے.....؟ ٹھیک ہے ہم نے آپ کی وجہ سے بہت..... بہت مشکل اور اذیت ناک زندگی گزاری ہے، ماضی میں اگر آپ ایسا نہ کرتے یا پھر پچھتاہی بڑے پن سے ماما کو معاف کر دیتے تو یہ سب نہ ہوتا۔ بہر حال اگر میرے الفاظ سے آپ کی تسلی ہوتی ہے تو کم از کم میں نے آپ کو معاف کیا لیکن انکل.....! آپ اندر سے ایک اچھے اور بہترین انسان ہیں اس کا اندازہ عرفان بھیا کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ انہوں نے جن حالات میں جس طرح میرا ساتھ دیا ہے اس کے بعد تو آپ اس قابل ہیں کہ آپ کو پیلوٹ کیا جائے۔ کجا آپ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔“ شرجیل نے انہیں گلے لگا لیا، عرفان قریب کھڑے غم آنکھوں سے دونوں کو دیکھتے رہے۔

”جیتے رہو بیٹا.....! جیتے رہو، اب میں کسی حد تک پرسکون ہو گیا۔ اصل سکون مجھے اس دن ملے گا جب آئندہ مجھے صدق دل سے معاف کر دے گی ہر چند کہ میری بے وفائی، میری خود غرضی اس قابل نہیں مگر پھر بھی.....“

”میں اب چلوں گا عرفان بھائی.....!“ شرجیل کھڑا ہو گیا تو دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

”مگر ابھی رات ہو رہی ہے، سردی بھی بہت ہے۔“

”تو کیا ہوا عرفان بھیا.....! آپ تو جانتے ہیں کہ باہر کے موسم کبھی بھی اتنے پادریل نہیں ہوتے کہ انسان کے عزائم کا راستہ روکیں۔ بس اندر کے موسم اچھے ہونے چاہئیں۔“

”اچھا جی.....! ہماری ملی ہم ہی سے میاؤں.....؟ چلو میں خود تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔“ عرفان اپنا منظر



لیٹتے ہوئے اٹھے۔

”نہیں بھائی..... اس کی بھی ضرورت نہیں، آپ نے میری راہوں میں اتنے چراغ روشن کر دیئے ہیں کہ یوں بھی مجھے اپنا اعتماد آزمانے دیں۔“

”شرجیل درست کہہ رہا ہے بیٹا..... ابھی اسے خود جانے دو، تمہارے لیے اسے جگہ بھی بنانی ہوگی ناں والدین کے دل میں۔“

حسن صاحب کی اس قیافہ شناسی پر شرجیل نے حیرت سے ان کو دیکھا۔ اس پس و پیش کی یہی وجہ تھی کہ نجانے پاپا ماما اس حقیقت کو جان لینے کے بعد کیا رویہ اختیار کرتے کہ وہ اپنے حسن کی نظروں میں گر جاتا اور شاید یہ بات وہ دونوں بھی سمجھ رہے تھے۔

”جی انکل..... ایسی ہی بات ہے، اب اجازت دیں۔“

شرجیل جا رہا تھا، کتنا عرصہ اس نے اس گھر میں گزارا تھا، کتنی محبت کتنی توجہ دی تھی اس گھر کے ہر فرد کے سوائے ہادیہ کے اور ہادیہ سے خود اسے محبت ہو گئی تھی۔ کتنے عجیب ہوتے ہیں زندگی کے راستے، محبتوں کے سلسلے، کیا تھا جب وہ یہاں آیا تھا اور کیا بن کر جا رہا تھا، بچوں اور عالیہ بھابھی سے مل کر بے اختیار اس کی نظریں ہادیہ کے کمرے پر پڑھ گئیں، وہ باہر نہیں آئی۔

”بھابھی.....! ہادیہ سے کہہ دیجئے گا کہ کہاں سے آئی ہے، نجانے کیا کچھ کہتا رہا اس کو.....؟“ شرجیل جانتا تھا ہادیہ سونے کا بہانہ ضرور کر گئی تھی مگر وہ جاگ رہی ہوگی۔

”میں بلا وجہ کی پیا مبر کیوں بنوں بھئی.....؟ خود جاؤ، خود کہہ دو، سوئی نہیں ہے وہ۔ جاؤ میں عرفان کو بھابھا دوں گی، یوں بھی وہ تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔“ بھابھی راز داری سے بولیں۔

”اور یہ تم اتنے اُداس کیوں ہو رہے ہو.....؟ ارے.....! اب تو سارے راستے صاف ہو گئے ہیں، اب تو دو خاندان ملیں گے اور نئے رشتے استوار ہوں گے۔“ بھابھی نے اس کے ویران اُداس چہرے کو دیکھا، اک انجان سا سایہ اس کا حصار کیے ہوئے تھا اور نظریں ہادیہ کے دروازے پر جمیں۔

”آئے والے وقت کا کس کو پتا.....؟“ شرجیل نے گمبیر لہجے میں ڈھلے الفاظ ہادیہ کے خوابوں کو چکنا چور کر گئے۔

”کیا مطلب شرجیل.....؟“ بھابھی ننکی زبان بنی ہوئی تھیں۔

”مجھے نہیں معلوم بھابھی.....! مگر اتنا جانتا ہوں ہم لوگوں میں درگزر کی عادت نہیں ہے، اپنے انتقام میں اندھے ہو کر ہم سارے دروازے مقفل کر لیتے ہیں تاکہ نہ اندر کی گھٹن کم ہو سکے نہ ہی معافی کی روشنی اندر آ سکے۔“

وہ آگے بڑھا، ہادیہ کے دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی سسکیاں بوجھل احساس کے ساتھ اس کے ہمراہ ہو گئیں۔

اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑے اس کے احساسات عجیب ہو رہے تھے۔ کتنی ڈھیر ساری یادیں وابستہ تھیں، موبی کی بدتمیزی، ماہم کی محبت، سب کچھ یاد آ رہا تھا، سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے، وہ دبے

پاؤں اپنے پورشن کی طرف آگیا۔ کافی ٹھنڈی مگر کوریڈور میں سرد ننگے فرش پر بیٹھیں ماما پر اس کی نظریں جم گئیں۔

”مما.....!“

رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ کچھ کہاوتوں کو وقت اسی طرح سچ ثابت کرتا ہے کہ ان کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ ردا کو اپنی آنکھ کا نور کہنے والی فاطمہ بیگم کو جب معلوم ہوا کہ یہ لڑکی جوان کو دیکھتے ہی اتنی بھائی تھی کہ فوراً انہوں نے شہرام کے لیے اسے پسند کر لیا تھا اور خود شہرام ردا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے تو ردا کو مومی کی بیٹی ہونے کی سزا دی جا رہی تھی۔ وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھیں مگر گھر بھر اُداس ہو گیا تھا۔

”مما.....! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ابھی تک انسان کو طبقاتی کسوٹی پر پرکھتی ہیں.....؟ ٹھیک ہے ماضی میں مومی اور بھائی کے ساتھ آپ نے زیادتی کی، دونوں برداشت کر گئے لیکن اب آپ شہرام کے ساتھ..... نہیں ماما.....! اب ہم یہ سب ہونے نہیں دیں گے۔“ لیلیٰ شہرام کی وکیل بنی ماں سے اُلجھ پڑی تھیں۔

فاطمہ نے تنک کر انہیں دیکھا۔

”تو..... تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ایک ملازمہ کی بیٹی کو بہو بنا لوں.....؟ اپنے حسب و نسب میں غلام خون کو شامل کر لوں.....؟ قطعی نہیں.....!“

فاطمہ بیگم کے لب و لہجے میں آج بھی وہی جاہ و جلال تھا جو مومی اور خرم کے وقت تھا۔ خرم تو پہلے کی طرح آج بھی چپ تھے، کل جو جھیل چکے تھے اذیت کے جن صحرائے آبلہ پا وہ گزر رہے تھے اسی صحرائے گزرنے کے لیے شہرام کو تیار کیا جا رہا تھا۔ وہ باپ تھے، خود پر ہر زیادتی تو برداشت کر سکتے تھے مگر بیٹے کے لیے تڑپ تڑپ گئے تھے مگر ان کی جنگ جو پہلے پہلے نہ لڑ سکیں اب وہ ماں کے سامنے کھڑی تھیں ان کے تمام دلائل کا جواب دینے کے لیے۔

”حسب و نسب، خاندان، یہ سب کیا ہے.....! یہ ذات پات، خاندان، حسب و نسب انسان کے اپنے بنائے دائرے جن کے گرد چکر کاٹنے پر وہ خود کو اتنا پابند کر لیتا ہے، اسی کے گرد گھومتے گھومتے جان دے دیتا ہے۔ یہ دولت، حیثیت، مرتبہ خود دولت مندوں کے بنائے اصول ہیں۔ ممما.....! انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تو تمام انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے، برے وقت نے تو بڑے بڑے بادشاہوں کو گدا بنا دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ کس طرح وقت اور حالات کی چکی میں پے اور دولت سے کھیلنے والے ہاتھ بھیک کے لیے پھیلائے گئے۔ اگر حسب و نسب ہی آپ کا مطمح نظر ہے تو کیا خبر ہمارا تعلق کسی غلام خاندان سے ہو.....؟ اللہ کی مہربانی سے آباؤ اجداد کے ہاتھ خزانہ لگ گیا ہو اور ہم حسب و نسب والے بن بیٹھے.....؟ اور یہ بھی کون جانتا ہے کہ مومی کا خاندان بہت نسب والا ہو مگر حالات نے ان کو دوسرے گھروں کے کام کرنے پر مجبور کر دیا ہو.....؟ بتائیے ممما.....! کوئی بھی بات یقین سے کہی جاسکتی ہے.....؟ ماضی میں آپ نے مومی کو بھائی کی زندگی سے نکال دیا کہ ماسی کی بیٹی کو بہو بنانا آپ کو گوارہ نہیں تھا مگر ردا، ردا تو آپ کی کلاس کے آدمی کی بیٹی ہے، یہ تو افتخار بھائی کی شرافت ہے کہ یہ سب بتا دیا ورنہ یہ ردا وہی تھی جو اب ہے۔ پہلے آپ اسے اپنی جان کہہ رہی تھیں اور آج اس کو دیکھنا گوارہ نہیں.....؟ آپ کو کیا خبر اور نہ ہی آپ نے یہ جاننے کی ضرورت ہی تھی کہ افتخار صاحب کا حسب



و نسب پوچھ لیں.....؟ وہ چونکہ دولت مند ہیں، معاشرے کی اونچی کلاس سے تعلق ہے تو بس باقی ساری باتیں معنی ہو گئیں.....؟ کیا خبر یہ افتخار کس خاندان سے ہیں.....؟ اور یہ دولت انہوں نے کیسے حاصل کی ہو جو آج ان کے خاندانی ہونے کی ضامن ہے.....؟ لیکن ماما.....! ہم آپ کو محض دولت کی کسوٹی پر انسانیت کو حسب و نسب پر کھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ جو گستاخی ہم نے ماضی میں نہ کی شاید اب کر گزریں، اگر آپ نہ مانیں تو کیونکہ شہرام کو رونا ہوا آپ تو دیکھ سکتی ہیں میں اور بھائی نہیں۔ آپ نے تو ثابت کر دیا کہ آپ بہت بہادر ہیں۔ بیٹے کو دکھی دیکھ سکتی ہیں تو پوتے کیوں نہیں.....؟ لیکن اب تاریخ دہرائی نہیں جائے گی۔“

لیلیٰ اور خرم اپنے والدین کے بہت اچھے بچے تھے۔ انہوں نے جو کہا انہوں نے وہی کیا مگر شہرام کو ادا اس دیکھ کر لیلیٰ ماں کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ خرم میں تو اب بھی جرأت نہیں تھی کہ بیٹے کے لیے بول سکیں۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی، گھر میں جہاں سہیہ اور شہرام کی لڑائیاں، جھگڑے اور قہقہے گونجا کرتے، اب ویرانی تھی۔ سنی ادا سی کمرے میں بند رہتی، شہرام بالکل مرجھا کر رہ گیا تھا، وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ ان کے قہقہے پھر سے گھر میں گونجنے لگیں۔

•••

”ردا.....! ردا میری بچی.....! مجھ پر یقین نہیں.....؟ اپنی ماں پر نہیں تو اللہ پر تو ہے ناں یقین.....؟ بیٹا.....! تم یقین کرو مجھے افتخار صاحب سے کوئی لالچ نہیں تھا، بس ان سے عقیدت تھی، یہ جب اولاد کے لیے دکھی ہوتے تو مومی اور مجھے بے حد دکھ ہوتا مگر ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر جب تم پیدا ہوئیں تو ان کے ہاں بھی بیٹی پیدا ہوئی مگر بد قسمتی سے بچی اسی روز وفات پا گئی تو بھائی پائل ہی ہو گئیں، ان کو اتنا صدمہ ہوا کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ جب ڈاکٹر نے کہا کہ اس صدمے میں ان کی جان بھی جاسکتی ہے۔ پھر میں نے اور مومی نے صرف ایک انسانی زندگی بچانے کے لیے تمہیں ان کی گود میں ڈال دیا۔ بیٹا.....! ایک زندگی بچانے کے لیے ہم نے تمہیں خود سے جدا ضرور کیا ہے اگر اب تم مجھے مجرم سمجھتی ہو تو جو چاہو سزا دے لو مگر اپنی ماں سے، مجھ سے بدگمان نہ ہو اور نہ ہی دولت کا لالچی کہہ کر ہمیں گالی دو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہیں افتخار صاحب کی گود میں ڈال کر میں نے ان کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ تمہارے سامنے بیٹھے ہیں پوچھو ان سے۔“

افتخار صاحب نے اختر اور مومی کو پاکستان بلا لیا تھا کیونکہ ایک تو ردا اپنے والدین سے بچ کر بھاگ کر بدگمان ہو گئی تھی اور دوسرا شہرام سے منگنی ختم ہونے پر وہ بری طرح بکھر گئی تھی اور اختر بیٹی کو سمجھا رہے تھے، اس کی عدالت میں اپنی بے گناہی پیش کر رہے تھے۔

”یہ ٹھیک ہے ردا بیٹی.....! تمہارے والدین کتنے اچھے انسان اور خود دار لوگ ہیں تم نہیں جانتیں، تمہیں ہمیں دے کر اختر نے ہماری جاب چھوڑ دی کہ کہیں ہماری نظریں ان کے احسان کی وجہ سے جھک نہ جائیں یا ہم ان لوگوں پر زیادہ مہربان نہ ہو جائیں۔ میں جانتا ہوں جاب چھوڑ کر ان لوگوں نے کتنے مشکل حالات کا سامنا کیا ہے، تم کہہ رہی ہو لالچی۔ ارے بیٹا.....! اس شریف آدمی نے تو ساری مراعات جو تمہاری پیدائش سے پہلے دی تھیں وہ بھی واپس کر دی تھیں، تم تو دنیا کی خوش نصیب لڑکی ہو جس کے والدین اتنے اچھے، اتنے مخلص اور بے غرض، بے لوث انسان ہیں۔“

حقیقت جان لینے کے بعد بدگمانی کی دھند چھٹ گئی تو ردا کو اپنے ماں باپ بہت بلندی پر نظر آئے۔

”سوری.....! سوری ماما.....! پاپا.....! میں نے کتنا غلط سمجھا۔“ وہ ماما اور پاپا سے معافیاں مانگ رہی تھی۔

”کیسی سوری.....؟ میری جان.....! والدین کبھی اولاد سے ناراض ہوتے ہیں نہ بدگمان، تم اب جاؤ اپنے بھائیوں کے پاس، دونوں ترستے رہتے ہیں کہ کب ان کی آپنی کا موڈ اچھا ہو تو وہ ان سے بات کریں۔“

مومی نے ردا کے بال سنوارتے ہوئے پیار سے کہا تو ردا کو اپنی ڈھیر ساری زیادتیاں یاد آ گئیں۔ فہد اور شہاب اسے کتنا چاہتے تھے، اس سے بات کرنے کے لئے آگے بڑھتے تو وہ سفاکی سے آگے بڑھ جاتی، اب جلدی سے بھاگ کر ان دونوں کے پاس چلی گئی۔

”مومی.....! پھر اب کیا کریں.....؟ آئی نے تو منع کر دیا ہے ردا کے لیے۔“ مسز افتخار نے ردا کے جاتے ہی مومی کو کانٹوں پر کھینچا۔ ماضی کی ایک ایک یاد آنکھوں میں تیرنے لگی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تاریخ یوں اپنے آپ کو دہرائے گی۔ بھابھی.....! ساری کہانی آپ کو بتا تو چل گئی ہے، بتائیے میں کیا سکتی ہوں.....؟ مسز فاطمہ زہرا اپنے سرکل سے کبھی نہیں نکلتیں، نہ ہی کسی کو اس میں داخل ہونے کی اجازت دیتی ہیں۔ یہ دوانے کیا کیا.....؟ اسی آئینے میں اپنا روپ سنوارنے لگی جو اس کی ماں سے چھین کر توڑ دیا گیا تھا.....؟“ ایک ایک لمحہ ٹپکا گیا مومی کو، کتنا ترپے تھے وہ اور خرم ایک دوسرے کے لیے مگر فاطمہ بیگم نے اس سے پچھا چھڑانے کے لیے اسے خرم کی زندگی ہی سے نکال دیا تھا مگر دل سے نکالنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔

”علیہ.....! یہ دروازہ تو لاگڑ ہے، ہم کیسے نکلیں گے.....؟“ خولہ رونے لگی، خواس تو علیہ کے بھی معطل ہونے لگے مگر اس وقت اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”رو نہیں، اللہ سے دعا کرو عزت بچا کر جہاں سے نکل جائیں۔“ علیہ نے خولہ کو ڈانٹا اور خود تیزی سے طلحہ کی طرف بڑھی جس کے بارے میں یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ تھا کہ مر چکا تھا۔

”یہ..... یہ رہی جانی.....!“ علیہ کو جو خیال آیا تھا وہ یہی تھا کہ دروازے کی چابی طلحہ کے پاس ہوگی۔

”خدا یا تیرا شکر.....!“ دونوں خوف سے بند ہوتے دل کے ساتھ ہانپتی کانپتی روڈ تک آ گئیں، صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے، سڑکوں پر ابھی ٹریفک کا اتنا رش نہیں تھا، دونوں بری طرح بوکھلائی ہوئی تھیں، اندھا دھند بھاگ رہی تھیں۔ اس بار جب روڈ کراس کرنے لگیں تو سامنے سے آتے ابراہم کی گاڑی کے سامنے آتے آتے بچیں، ابراہم جو کسی ضروری کام سے لیلیٰ کے پاس جا رہے تھے، شدید غصے میں بریک لگا کر باہر نکلے۔

”یو اسٹو پڈ گرلز.....! کون ہو تم لوگ.....؟ اس ات یہاں کیا کر رہی ہو.....؟ اب اگر میں بریک نہ لگا لیتا تو تینوں مرتے۔“

وہ غصہ میں ان کو ڈانٹے جا رہے تھے جو بری طرح خوفزدہ تھیں اور روئے جا رہی تھیں، ابراہم کھٹک گئے۔

”کون ہو تم لوگ.....؟ اور اس وقت.....؟“

”انکل.....! آپ جو کوئی بھی ہیں، ہمارا شجرہ نسب بعد میں جان لیجئے گا، پلیز.....! ہمیں یہاں سے لے



جائیے، ہم آپ کے احسان مند رہیں گے، آپ ہماری بات کا یقین کیجئے ہم سچ کہہ رہے ہیں، ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، ہم اس وقت خطرے میں ہیں۔ انکل.....! پلیز اس وقت ہمیں یہاں سے لے چلئے۔“  
دونوں اس وقت جس حال اور حلیے میں تھیں، وہ ان کو مظلوم بھی بناتا تھا اور غلط بھی قرار دے رہا تھا۔ کیا غلط تھا، کیا صحیح تھا وہ اس وقت اس کا فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ انہوں نے دونوں کو بیٹھا لیا، دونوں اب خود کو محفوظ سمجھ رہی تھیں۔

”یہ آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں انکل.....!“ اجنبی راستوں کی طرف جاتے دیکھ کر دونوں چلائیں۔

”جب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کا پتا نہیں دو گی تو میں تمہیں پھر روڈ پر کسی غلط آدمی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ فی الحال میرے ساتھ چلو، پھر ہم خود تم لوگوں کے گھر چھوڑ آئیں گے۔“  
ابرار ان دونوں کو لپٹی کے گھر ہی لے آئے۔

”ہوں.....! تو لڑکیو.....! اب بتاؤ تم لوگ کون ہو.....؟ اور یہ سب کیا ہے.....؟“  
خولہ کو اس لباس اور حلیے میں دیکھ کر لپٹی کو لگا کہ وہ آئینہ دیکھ رہی ہیں مگر پھر خیال آیا کہ ان کی بیٹی تو شہباز کے پاس ہے، وہ بھلا اس طرح تھوڑی ہو سکتی ہے۔ علیہ خولہ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ محفوظ ہیں، ان کی جان بھی اور عزت بھی مگر اب اپنے خاندان کا آنا پنا کیسے بتائیں۔

”بیٹا.....! اگر تم لوگ نہیں بتاؤ گی تو ہم خود ہی کوئی کارروائی کریں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔ خود بتاؤ.....! کیا بات ہے تاکہ ہمیں اندازہ ہو کون غلط ہے اور کون درست.....؟“ لپٹی نے جانے کس خواہش سے بے قابو ہو کر خولہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا کہ بتائیں یا نہ بتائیں مگر لپٹی کے قرب اور اس میں جانے کیا سحر تھا کہ خولہ کا دل چاہا وہ اس عورت کے سینے سے لگ کر سب کچھ اگل دے اور پھر وہ اس خواہش کے زور پر بند نہ باندھ سکی اور لپٹی کو تمام بات بتا دی۔ اس کی باتوں سے انہیں معلوم ہو گیا تھا یوں وقت اور حالات کی راہوں میں بے مول ہونے والی کوئی اور نہیں انہی کی بیٹی ہے جسے اس کا سفاک باپ بے دردی سے ان کی گود سے چھین کر لے گیا تھا، آج اللہ نے اسے کن حالات میں ان کی گود میں لوٹا دیا تھا۔

● ● ●

غزین بڑی گہری اور شوخیاں لٹاتی نظروں سے وردہ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی بے باکی، اس کے جملے اور اس جملے کے پیچھے چھپی کسی سازش کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہی خیال آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر ناگوار سایہ بن کر اتر آیا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ غزین جو کہہ رہا ہو وہ کوئی دھوکا، فریب نہ ہو.....؟ اس کی محبت ہو، خواہش ہو، طلب ہو.....؟“

دل تو سدا کا دیوانہ تھا، ہر بار غزین کی حمایت کر جاتا تھا، دماغ کی ہر دلیل کو محبت کی کلیوں میں لپیٹ کر مہکا جاتا تو وہ الجھ جاتی اور اس وقت بھی دھڑکنوں کی اسی شوخ سرگوشی نے رُخساروں کے رنگ بدل دیئے تھے، آنکھوں میں خوبصورت ان دیکھے خوابوں کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔

”کاش.....! ایسا ہی ہو، یہ شخص جو اوپر سے اتنا خوبصورت اور وضع دار ہے اندر سے بھی ایسا ہی ہو۔ واقعی دل سے طلبگار ہو تو.....! تو اس خود برو وجہہ شخص کے ساتھ زندگی کتنی خوبصورت ہو جائے گی۔“  
وہ دور کہیں خوابوں کی راہ گزر پر نکل گئی تو اندر کا سارا حسن وردہ کے رُخساروں پر اتر آیا۔ غزین گہری نگاہوں سے دیکھے گیا پھر چٹکی بجا کر اسے واپس لے لیا۔

”کہتے ہیں میڈم.....! سائل کو زیادہ انتظار نہیں کروانا چاہیے۔ خالی کاسہ بددعا بھی دے سکتا ہے اس لیے ارماتوں بھرے دل کی دُعا لیجئے اور ہاں کا سکڑ ڈال دیجئے اس میں۔“  
گہرے لہجے میں بولتا وہ اب بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ وردہ نے ایک تیز نگاہ اس پر، دوسری اس کے پھیلے ہاتھ پر ڈالی۔

”کچھ کھکھول ایسے ہوتے ہیں ڈاکٹر غزین آفاق صاحب.....! کہ ہاں تو کیا ان کے مقدر میں کسی کی ایک نگاہ التفات کا سکڑ نہیں ہوتا۔“ نجانے کیوں ایسا ہوتا تھا کہ اس کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ راستہ بدل لیا کرتی تھی، اس کے زہر خندانہ لہجے پر غزین کو تاؤ تو بہت آیا مگر جانے کیا تھا اس لڑکی میں کہ وہ ہر بات برداشت کر جاتا یا دل برداشت کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کی بات پر وہ بغور اسے دیکھتا رہا۔

”کچھ کھکھول ہوتے ہی اتنے معتبر نہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ ان میں ایک نگاہ التفات تو کیا اپنی ہاں سمیت آن بیٹھتے ہیں اس کھکھول میں۔ اس لیے شرافت سے بتاؤ کہ مجھ سے شادی کرو گی ناں.....؟“  
وہ مزید اس کے قریب جھکا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”آپ سے بحث کرنا بے کار ہے۔“ وردہ تیز نظروں سے اسے دیکھتی آگے بڑھنے لگی تو وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بحث بیکار ہے، ہاں کر دو گی تو ساری بحث، لڑائی جھگڑا دھرے رہ جائیں گے اور ہم تمام عمر جو نہیں لڑاتے زندگی گزار دیں گے اور ہمارے بچے.....“  
”مسٹر غزین.....! آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔“ وردہ غرائی۔

”اس تمام کا حل ہے شادی.....! دیکھو ناں اب تو ہمیں ڈاکٹر مان لیا گیا ہے، اب ہمیں اپنی عملی زندگی کی ابتداء کرنی ہے تو کیوں ناں میں اور تم.....“

تیز تیز بولتے کسی کسی جملے پر اس کا لہجہ گہرا ہو جاتا، آنکھوں میں قندیلیں روشن ہو جاتیں، اس لمحے میں وردہ بھی کچھ ڈول سی جاتی مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ غزین پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”مسٹر غزین.....! یہ کیا آپ نے شادی، شادی کی رٹ لگا رکھی ہے.....؟ میں شادی کروں گی، ضرور کروں گی مگر آپ کے ساتھ نہیں کسی بہت اچھے قابل انسان کے ساتھ، جس پر مجھے اتنا اعتماد ہوگا، جو مجھے اتنا چاہے گا کہ میں جھوٹ بھی بولوں تو وہ سچ سمجھے۔ رہی آپ کی بات تو آپ دُنیا کے آخری مرد بھی ہوتے تو نیور.....! سوری.....!“

◆ ◆ ◆



”مستر غزین.....! بہت بد نصیب ہوتے ہیں آپ جیسے لوگ جو اپنی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے نہ تو کسی کے دل میں جگہ بنا پاتے ہیں اور نہ ہی نظروں میں عزت بنا پاتے ہیں۔“ جاتے جاتے پلٹ کر وردہ نے اپنا غبار نکالا کیونکہ اگر ابھی وہ اسے کچھ نہ کہتی تو خود کو ملامت کرتی رہتی کہ اس نے اسے منہ توڑ جواب کیوں نہ دیا مگر اس کی بات پر غزین کے ہونٹوں پر ایسی معنی خیز اور گہری مسکراہٹ آگئی جو وردہ کی جان را کھ کر گئی۔

”مجھے کسی کی نظر کی پروا ہے نہ دل کی پروا، ہے تو اس کی نظر کی اور اپنے دل کی پروا ہے۔“ غزین نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ اسی وقت شہلا دونوں کے قریب آگئیں۔

”وردہ.....! چلیں بیٹا.....! کافی دیر ہو گئی ہے۔ غزین بیٹا.....! تمہارے والد یا تمہارا کوئی گھر والا نہیں آیا.....؟“

”کس نے کہا کوئی نہیں آیا.....؟ میرا دل، میری نظر، میری محبت سب کچھ نہیں تو ہے۔“ اس نے اک ادا سے وردہ کی آنکھوں میں دیکھا، وہ نخوت سے مڑی تو وہ شہلا کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ناراض پشت کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”آئی.....! آپ نے ایسا کہا مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں تو آپ لوگوں کو ہی اپنا سمجھتا ہوں، میرے گھر والے تو آپ ہی لوگ ہیں، افسوس ہوا کہ.....“

غزین کے لہجے میں جانے کہاں سے درد سمٹ آیا، چہرے پر کرب کا سایہ چھا گیا تو وردہ اس بہترین ایکٹر کو گھور کر رہ گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کتنا جھیت لگ رہا تھا اور اب کسی بچے کی طرح محسوس اور جھپٹوں کا ترسا ہوا لگ رہا تھا۔

”ارے غزین بیٹا.....! ایسی کوئی بات نہیں، میں تو صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ چلو اسی بہانے تمہارے بابا سے ملاقات ہو جاتی۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ.....“ شہلا کی بات پر اس نے گہرا سانس لیا، یوں جیسے اندر کی ساری کشاف کو باہر نکالا ہو۔

”جن چاہتوں کے راستے میں بہانے آتے ہیں ناں آئی.....! میری نظر میں وہ چاہتیں پاور فل نہیں ہوتیں۔ چاہت کی طاقت تو یہ ہے آئی.....! کہ انسان انجام کو سوچے جانے بغیر آگے بڑھے اور ہاتھ تھام لے۔ کیوں ڈاکٹر وردہ.....! ایم آئی رائٹ.....؟“

وہ چند قدم دور کھڑی وردہ سے مخاطب تھا جس کے دل میں اس کے خلاف پھر طوفان سا اٹھا۔ وہ غصے سے پلٹی اور شعلہ بار نظروں سے غزین کو گھورا۔

”آف کورس ناٹ.....! چلے ماما.....! بہت دیر ہو رہی ہے، سنی پریشان ہو رہی ہوگی۔“

وردہ نے شہلا کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھی۔ شہلا کا دوسرا ہاتھ غزین کے ہاتھ میں تھا۔ ایک طرف وردہ، ایک طرف غزین، شہلا درمیان میں کھڑی مسکرا رہی تھیں، غزین نے ایک گہری نگاہ وردہ پر ڈالی جس کے چہرے پر غصے کی سرخی اسے شوخ کر گئی۔

”دیکھو وردہ.....! میرے اور تمہارے درمیان کتنا مضبوط برج ہے۔ کیوں آئی.....! ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں.....؟“ نظریں وردہ پر، سوال شہلا سے اور اس سے پہلے کہ شہلا اس کی بات کا جواب دیتیں ان کے دور کی

وردہ کے لہجے کی سختی، اس کے الفاظ کی سچائی کی ضمانت دے رہی تھی۔ اس کے الفاظ کا ڈھواں غزین کی آنکھوں سے ہوتا ہوا اس کے دماغ کو چڑھ گیا اور کچھ دیر پہلے دل کی جس خواہش نے بڑی خوبصورتی سے، بہت آہستگی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا وہی لطیف احساس غبار بن کر زکوں میں ڈھواں بھر گیا تو اس کے وجہہ چہرے پر تناؤ سا آ گیا، اس کے ہونٹ سمجھ گئے، اس کی نازک کلائی اس کی مضبوط مردانہ گرفت میں آگئی تو مارے تکلیف کے ایک لمحے کے لیے اسے دم زکنا ہوا محسوس ہوا اور آتی باوقار تقریب میں اس کا جنگلی پن اور اپنی بے بسی آنکھوں میں تیر گئی۔

”آخری مرد.....؟ ہاں، آخری مرد.....؟“ اس کا جملہ اس کی مردانگی کے پرچے اڑا گیا تھا۔ وہ کھول کھول اٹھا، دانت پیستے ہوئے شعلہ بار لگا ہوں کو اس پر جمائے وہ سلگ اٹھا۔

”دور اس وقت سے وردہ وہاں.....! کہ تم اس آخری مرد کے لیے روؤ، تڑپو اور یہ آخری مرد تمہیں ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے..... اور.....“

”شٹ آپ.....! چھوڑو میرا ہاتھ اس سے پہلے کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔“

کلائی چھڑانے کی اپنی سی کوشش میں ناکامی کے بعد وردہ نے دبی دبی، تھٹی تھٹی دھمکی دہی تو غزین کا جی چاہا اس وقت بے بس سی اس خود سر لڑکی کو مزید ہراساں کرے یا پھر ابھی سب کے سامنے اس کے ساتھ شادی کا اعلان کر کے اسے مزید تنگ کرے مگر جانے کیا بات تھی اندر کہیں اس کی محبت نے اشارہ کر دیا کہ محبت کو سوا نہیں کرتے یا پھر کوئی ایسا خیال چپکے سے غیرت کو چھوٹا ہوا گزر گیا کہ اس نے جھٹکے سے اس کی کلائی اس طرح چھوڑ دی کہ وہ گرتے گرتے پچی۔ اس کی حرکت پر آنسو موٹے موٹے قطروں کی صورت رُخساروں پر پھیل گئے۔ غزین کو یہ بارش اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔ اس نے نشو ووردہ کی طرف بڑھایا، اپنی حرکت پر ہلکی سی عداوت چہرے پر آگئی۔

”یہ لو.....! اور آنسو صاف کر لو کیونکہ ہمیشہ بے وقت بے موسم کی بارش موضوع گفتگو بن جاتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے یہ آنسو لوگوں کے ذہنوں میں کسی کہانی یا افسانے کو جنم دیں جس کا کوئی انجام نہ ہو۔“



کوئی ڈاکٹر نظر آگئیں تو وہ غزین کو ایکسکیز کر کے ان کی طرف بڑھ گئیں۔ وردہ کو بھی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

”مما کو برج بنا کر آپ یہ مت سوچنے گا کہ مجھ تک پہنچ جائیں گے.....؟ کبھی کبھی پل ٹوٹ بھی جایا کرتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں اس کی نظر سے اس کے لیے نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ چند قدم چل کر اس کے قریب آگیا۔

”کبھی کبھی انسان نفرت میں وہ کہہ جاتا ہے جو نہیں کہنا چاہیے، وہ کہہ جاتا ہے جو نہیں کرنا چاہیے۔ یہ جس پل کو آپ ٹوٹ جانے کی بددعا دے رہی ہیں آپ کی بے حد لوگن ممانیں۔ کتنا بڑا پتھروں جیسا حوصلہ ہے تمہارا کہ دوسری بار بھی ماں کو کھود دینا چاہتی ہو.....؟ میری تو ساری زندگی ایک ماں کی تلاش میں غرق ہو گئی اور تم مجھ سے اتنی نفرت کہ اپنی جنت کو دوسری بار گنوانے کا حوصلہ ہے تم میں.....؟ شیم آن پو.....! ارے.....! مجھ سے پوچھو اس جنت کی قدر، بچپن سے آج تک کھوج رہا ہوں، ڈھونڈ رہا ہوں، خاک چھان رہا ہوں اس جنت کی تلاش میں مگر مجھے اس کا نشان نہیں ملتا، کوئی اُتہ پتہ نہیں ملتا، ایک بار مجھے جنت مل جائے تو ایک ایک سانس اس کے نام کر دوں، اپنی زندگی بچھا کر اسے روشن کر دوں، میں مرجاؤں وہ جی جائے۔ کاش.....! کاش ایسا ہو جائے کہ میں جاؤں اور وہ جی جائے۔“

اس کا لہجہ جو کسی شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا اسی شعلے کی طرح بھڑکتے بھڑکتے نہ صرف لوگم ہو گئی، آہستہ آہستہ وہ بچھ سا گیا۔ اس وقت وہ کتنا مختلف لگ رہا تھا، نہ چہرے پر عیاری مکاری، نہ شوخی، نہ شرارت۔ اس وقت اس کے وجہ چہرے پر کرب کے سائے تھے، ایک عجیب سی بے نام سی تلاش کا بھجان تھا، انجانی موج کی انجانی ان دیکھی جنت کی متلاشی تھی۔ اس وقت اتنا مختلف اور ڈھکی لگ رہا تھا، اتنا صاف واضح اور سچا لگ رہا تھا کہ وردہ اسے دیکھے گئی اور ہمدردانہ جذبے کے ساتھ کوئی اور جذبہ بھی چپکے سے دبے پاؤں اندر اتر گیا کہ وہ روک بھی نہیں پائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ایسی صورت حال میں کیا کرے، وہ اپنی بے اعتباری کے اتنے ریکارڈ قائم کر چکا تھا کہ ہمدردی یا تسلی کا ایک لفظ کہنا نہیں چاہتی تھی، نجانے اس کی والدہ حیات تھیں یا والدین میں علیحدگی ہو چکی تھی، ایسا ہی کچھ تھا جس نے اس کی زندگی کو اُدھور کر رکھا تھا، کیا راز تھا، کیا حقیقت تھی، یہ جاننے کی وردہ کی شدید خواہش تو تھی مگر یہ خواہش اس کے قدموں کی زنجیر نہیں بنی۔ جب ہی وہ بظاہر بے نیازی سے آگے بڑھی۔

”میری اس جنت کی تلاش میں میری مدد کرو گی.....؟ پلیز.....!“

بہت دھیمے سے لہجے میں التجا کی مگر وہ پلٹے بغیر ٹھہر گئی۔ دل تھا کہ ہاتھ بڑھانے پر مصر ہو گیا، دماغ تھا کہ پہرے دار بن گیا، جلاد نگران بن گیا، گردن کو مڑنے کی اجازت دی نہ پلک اٹھانے کی۔

”آئی..... آئی نیڈ یو وردہ.....! آئی نیڈ یو وردہ.....!“ التجا میں اصرار ابھرا، گردن ذرا سی خم ہوئی، دل تڑپا، دماغ نے پھر ڈپٹ کر ٹھایا۔

”پلیز وردہ.....! ہیلپ می.....! کیونکہ تمہاری ہیلپ کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں۔“

اس کی اُنا، خودداری کا زیادہ امتحان لینے کی بجائے وہ سوالی بنا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تو ایک لمحے کے

لیے وہ اس خور و، عجیب شخص کو دیکھ کر رہ گئی جو باقاعدہ ہاتھ پھیلائے سوالی بنا کھڑا اس کی مدد کی بھیگ مانگ رہا تھا اور ابھمن، کشمکش سے مڑتی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ آیا اس کا یہ روپ اصلی ہے، آیا واقعی اس روپ کی کوئی کہانی ہے، حقیقت ہے یا یہ بھی ڈرامہ ہے، دھوکہ ہے، غریب ہے۔

”نہیں.....! غزین ڈھکی ہے، محروم تنہا ہے، اس کے اس روپ کے پیچھے یقیناً کوئی کہانی ہے ورنہ اس قدر اسارٹ، پنڈسم، خور و شخص ایسا کیوں ہونے لگا.....؟ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

دل تو ہوتا ہے دیوانہ، اس مشورے نے ثابت کر دیا تو دماغ نے غزین کی اس حرکت کو سمجھداری سے سمجھنے کا حکم دیا۔ اس نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو انور کیا اور آگے بڑھ گئی اور اس کا یہ انداز غزین کو کھولا گیا۔ اس نے اس کی کلائی پھر زور سے پکڑ لی اور اسی چہرے پر جس پر کچھ دیر قبل ایک اُداسی ویرانی اور کھوج تھی اسی چہرے پر تہاؤ آگیا، اک ایسی تحریر جو وردہ سے پڑھی نہیں گئی مگر تھی اس کے نام۔ اس کے بازو پر اس کا دباؤ بڑھا تو وہ سسک پڑی۔

”لسن ٹو می کیئر فلی ڈاکٹر وردہ وجاہت.....! مجھے تمہاری ضرورت ہے، تم محض میری ضرورت ہو، اوکے.....! تمہارے دل یا ذہن کے ہزاروں حصے میں بھی اگر یہ خوش فہمی یا غلط فہمی ہے تو اسے دھو ڈالو، اس لیے کہ تم میری محبت نہیں میری ضرورت ہو، تم اگر میری محبت ہو میں ناں تو میں ہرگز ہاتھ پھیلا کر تمہارا طلبگار نہ بنتا، التجا نہ کرتا کیونکہ میں کمزور مرد نہیں ہوں کہ محض محبت میں اتنا مجبور ہو جاؤں کہ نفرت کرتی ہوئی محبوبہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دوں۔ تم محض میری ضرورت ہو، میری کھوئی ہوئی جنت کا پتہ ہو، انڈرا سٹینڈ.....! چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے تمہیں میری ضرورت پوری کرنا ہے، نہیں تو آئی دل کل پو تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر قتل نہیں کر سکتے.....؟ جیل نہیں جاسکتے.....؟ تم نے اگر میرا کام نہ کیا تو یہ سب کچھ سچ ہو جائے گا، سچ.....!“

ایک ایک لفظ کو دانتوں تلے پیستے ہوئے غزین نے دھیمے اور سرد لہجے میں کہا اور پہلے کی طرح جھٹکے سے اسے خوش فہمی یا غلط فہمی سے نکالتا ہوا آگے بڑھ گیا اور وہ گم ہوتے حواسوں کے ساتھ اسے بلیک سفاری کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر طوفانی انداز میں گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی مین روڈ پر ایک ساتھ گئی بریک چر چرائے۔

”اللہ حافظ غزین.....!“ اس کی سلامتی کی یہ دعا مخالفت کے اتنے بڑے ہجوم سے رستہ بناتی جانے کیسے لیوں کو چھوٹی غزین کا حصار کر گئی اور وہ ایک ممکنہ حادثے سے بال بال بچ گیا اور وہ گم سم سی شہلا کے ساتھ گھر آگئی۔ تمام رات اپنے ہاتھ پر اس کا لمس محسوس کرتی وہ اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے جانے کب سو گئی۔

● ● ●

”آج تو انکل کی طبیعت کافی بہتر لگ رہی ہے غزین.....! عجیب سی روشنی ہے ان کے چہرے پر۔“ اسد نے آفاق صاحب کو غور سے دیکھتے ہوئے خوش ہو کر کہا تو غزین نے پلٹ کر چھٹی نظروں سے ان کو دیکھا۔

”مجھے ان کی صحت اور زندگی بخش کرنوں سے کوئی غرض ہے نہ خوشی ہے جن کی روشنی میں مجھے میری گمشدہ جنت نظر نہیں آتی، میری زندگی کا سکون نظر نہیں آتا، مجھے اس سے خوشی کیونکر ہو سکتی ہے.....؟ لیکن اب.....“



غزین کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے اور طوفان کی شدت کا اندازہ اس کی آنکھوں سے با آسانی ہو رہا تھا۔  
 ”اور..... اور اب وہ ہوگا اسد.....! جس سے میں جان بچاتا رہا، چھپتا رہا، دعائیں کرتا رہا کہ ایسا نہ ہو،  
 میں ایسا نہ کروں مگر کبھی کبھی زندگی ہمیں ایسے راستے پر ڈال دیتی ہے جس پر ہم چلنا نہیں چاہتے مگر اس پر چلنا  
 ہماری مجبوری، ہماری سزا بنا دیا جاتا ہے اور.....“ بولتے بولتے اس کی آواز دبنے لگی۔

”پھر سوچ لو غزین.....! مت چلو اس راستے پر جس کی کوئی منزل نہیں، سب کچھ کھودو گے تم.....! سب  
 کچھ گنوا دو گے تم.....! وردہ کو کھودو گے.....؟ وردہ تمہاری محبت ہے، محبت گنوا دو گے تو تمہارا دل سودا کی کے گھر کی  
 طرح دیران اور سنسان ہو جائے گا، اتنی گھٹن اور اندھیرا ہوگا کہ تمہارا دم کھٹنے لگے گا۔“

”تو اب تک میں نے سانس لیا کب ہے.....! اسد.....! میرا گھر آباد ہوا کب ہے.....؟ کد اُجڑ جانے کا  
 اندیشہ ہو.....؟ وردہ میری محبت ہے، سب کچھ نہیں۔ یہ وردہ، اس کی محبت، اس سب کا ایک حصہ ہے، ایک جزو  
 ہے جو میرے پاس نہیں۔ جس کی تلاش میں، جس کی چاہ میں میں پاگل دیوانہ ہو گیا ہوں، ایک دیوانے کو اتنا جی  
 حق نہیں کہ وہ خرد کا لمحہ ہی جی لے.....؟ سکون کے ایک پل کا جگنو اپنی مٹی میں بند کر لے.....؟ کیوں.....؟  
 کیوں حق نہیں دیتے یہ لوگ ایک دیوانے کو جس نے اپنا یہ حق مانگا، اس سے میں نے مانگا، درخواست کی، التجا کی  
 مگر اس نے حقارت سے ٹھکرایا اور آگے بڑھ گئی۔ کیا اس میں اتنا بھی طرف نہیں کہ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کو  
 ہاتھ بڑھا کر ڈوبنے سے بچالے.....؟ ٹھیک ہے، ایسا ہے تو ایسا ہی، اب وہی ہوگا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔  
 قسم سے بہت درد ہے دل میں۔ اسد.....! اب تمہیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اب نہیں، اسے آنا ہی ہوگا،  
 آج ڈاکٹر سے ڈاکو بھی بنا پڑا تو پرواہ نہیں۔“

اس کے جو عزائم تھے اسد کو معلوم ہو چکا تھا۔ وہ خوف سے باہر جاتے غزین کی طرف بڑھا۔  
 ”غزین.....! زک جاؤ.....! تم تباہی کی طرف جا رہے ہو..... زک جاؤ.....!“

● ● ●

”شہباز.....! شہباز کہاں ہو تم.....؟ اس طرح لوٹائی ہے میری بیٹی مجھے.....؟ قدموں کی دھول کی  
 صورت.....؟ ایک گالی، ایک بدنامی کی صورت.....؟ یا اللہ.....! یہ کیا ہے.....؟ کس کے گناہوں کی سزا  
 ہے.....؟ میرے اس شوق کی سزا یا شہباز کے غرور اور بڑے بولوں کی سزا ہے.....؟ میرے پروردگار.....! مجھے  
 بتا یہ سب کیوں ہوا.....؟ میں نے بیٹی دوبارہ مانگی تھی میرے پروردگار.....! مگر اس ذلت کے لبادے میں لپٹی  
 ہوئی نہیں.....؟ شاید تیری ذات واحد کو ایسا ملاپ ہی منظور ہو لیکن یہ ساری برائیاں انسان خود کرتا ہے، اپنے نفس  
 کے ہاتھوں مجبور ہو کر کرتا ہے، پھر کہتا ہے خدا کو ایسا ہی منظور تھا، نہیں.....! خدا کو ہمیشہ اچھا اور بہتر منظور ہوتا ہے،  
 اللہ کبھی اپنے بندے کے لئے برا نہیں کرتا، اچھا کرتا ہے، انسان خود اپنے لیے برا کرتا ہے اور.....! اور ہم نے  
 اپنے لیے برا کیا۔ شہباز.....! کہاں ہو.....؟ آؤ دیکھو.....! جس بیٹی کو تم ایک مثالی لڑکی بنانے کے لیے ماں کی  
 گود سے چھین کر لے گئے تھے آج وقت اور حالات نے کس طرح، کس انداز میں ماں کی گود میں ڈالی ہے کہ  
 میری گود بھڑک اٹھی ہے شعلوں سے.....؟“

خولہ کے بارے میں سارے حقائق جان کر لیلیٰ گویا غم و غصے کی شدت سے پاگل ہو گئیں۔ ان کا بس چلنا

تو ابھی اسی وقت شہباز کو بلا تیں اور اپنے سارے زخموں کا حساب مانگتیں۔ وہ خولہ کو ساتھ لگائے پاگلوں کی طرح  
 رو رہی تھیں اور خولہ جس نے ماں کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ خود غرض، خود پرست عورت تھی، اپنے شوق  
 و جنوں میں اس نے بیٹی کی بھی پرواہ نہیں کی اور اس کہانی کے لفظوں کو جوڑ کر خولہ نے جو اپنی ماں کی تصویر بنائی تھی  
 وہ ایسی تو نہ تھی یوں پردے میں لپٹی لڑکیوں کی مدد کے لیے ادارہ چلاتی جس کے کردار کی پاکیزگی اس کے چہرے  
 اور آنکھوں میں کرنوں کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ جیسا باپ نے بتایا ہے وہ ایک بے حد  
 حسین، بے باک عورت ہوگی جو ماڈلنگ کر کے یا ایکٹنگ کر کے اپنے حسن کی نمائش کرتی ہوگی۔ تب ہی تو اس  
 نے اپنی ماں کو کسی اچھی اور پاکیزہ سوچ میں نہیں ڈھالا تھا لیکن جانے اللہ کی کیا مصلحت تھی کہ آج جب وہ بظاہر  
 ذلت کے لبادے میں لپٹی تھی تو اللہ نے ماں کی گود میں لاڈ لگایا۔

لیلیٰ کی طبیعت بگڑنے لگی تو خرم نے بڑھ کر اسے ساتھ لگالیا۔  
 ”میرا دلکے ہو میری بہن.....! تمہیں تمہاری بیٹی خدا نے واپس کر دی۔“ لیلیٰ کے ساتھ انہوں نے خولہ کو  
 بھی ساتھ لگالیا تو خولہ کو ایک لمحے کے لیے اپنے بابا سے نفرت محسوس ہونے لگی کہ کتنا خود غرض انسان تھا کہ اسے  
 اپنے پیارے رشتوں سے دور رکھتا ہے۔

”بھائی.....! یہ میرے اللہ کا مجھ پر کرم ہے کہ اس نے مجھے بیٹی لوٹا دی مگر بھائی.....! شہباز نے اسے کن  
 حالات کے سپرد کر دیا اور یہ میرے پاس کن حالات میں آئی ہے.....؟ بیٹیاں تو عزت ہوتی ہیں، اعزاز ہوتی  
 ہیں، اس خود غرض انسان نے اسے ذلت کی صورت سے لوٹا لیا ہے، جن عزائم کے ساتھ لے کر گیا تھا اگر اسی طرح  
 ایک مکمل مسلمان اور مشرقی اطوار کے سانچے میں ڈھل کر خولہ کو لوٹاتا تو میں اسے سب کچھ معاف کر دیتی مگر.....“  
 ”لیلیٰ.....! خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، شہباز نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی اس کی سزا بھی تو  
 اس کو ملنی تھی ناں.....؟ اگر وہ اپنے عزائم کے مطابق تربیت کر پاتا تو اسے کیسے احساس ہوتا کہ تم بے قصور تھیں اور  
 بے قصور کو سزا دینے کا انجام کیا ہوتا ہے.....؟ اسے بھی معلوم ہونا چاہیے۔“

”تو پھر اسے جلدی سے بلائیں بھیا.....! میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے میری گود اُجاڑ کر  
 میری کلیوں جیسی بیٹی کو حالات کے کانٹوں کے حوالے کیسے کر دیا.....؟“  
 لیلیٰ بار بار خولہ کو ساتھ لگائے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔

”لیلیٰ.....! خدا کا شکر ہے کہ ہماری بیٹی ہمارے پاس پہنچ گئی ہے۔“  
 ”اب رہا.....! پہلے تو آپ خولہ کی کثیر فکر عطیہ خاتون کو بلائیں۔“

”نہیں ماما.....! ماما.....! عطیہ خاتون بہت اچھی ہیں، میں نے اگر ماں کو پہچانا ہے تو عطیہ خاتون کے  
 ذریعے، ماں ایسی ہو سکتی ہے کہ اپنی خوشی، آرام، سکون پر اولاد کو ترجیح دیتی ہے تو یہ روپ میں نے عطیہ خاتون  
 کے روپ میں دیکھا۔ ہاں.....! اگر کوئی میرا مجرم ہے تو بابا ہیں، عطیہ خاتون بہت اچھی ہیں، ماما.....! ان کو کچھ  
 مت کہے گا، پلیز.....!“

خولہ کو عطیہ خاتون سے بہت محبت تھی، وہ بری طرح گھبرا گئی کہ اب جانے ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔  
 ”ارے نہیں خولہ بیٹی.....! ہم آپ کی عطیہ خاتون کو کچھ کیوں کہیں گے.....؟ بس ان سے عزت کے



ساتھ شہباز کے بارے میں پوچھیں گے اور ان کا شکریہ ادا کریں گے کہ انہوں نے ہماری بیٹی کا خیال رکھا، اس کی تربیت کی۔“

”میں..... ماما! میں بہت بری ہوں، بہت خود سر اور ہٹ دھرم ہوں، میں عطیہ خاتون سے نظریں نہیں ملا سکتی، مجھے چھپا لیجئے میں ان کا سامنا نہیں کر سکتی۔“ خولہ کو واقعی شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ خود کو عطیہ خاتون کا سامنا کرنے کے لائق نہیں سمجھتی تھی، وہ لیلیٰ کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ کتنا تحفظ، کتنا سکون تھا اس پناہ گاہ میں جتنا اسے لیلیٰ سے محبت اور سکون محسوس ہو رہا تھا، اتنا ہی اسے شہباز سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جس نے اسے جنت اور محبت کے اس ٹھنڈے میٹھے چشمے سے محروم رکھا۔

ان سب باتوں سے الگ گم سمی علیزہ حیرت اور دکھ سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ یہ سب دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ خولہ کو تو ذلت کی اس دھول سے موتی مل گئے اور جواد جیسے بھائی کا اعتماد، ماما کی آنکھوں میں عزت اور ارمغان جیسے اچھے انسان کی محبت کیا نہیں گنوا بیٹھی تھی.....؟ وہ سنعیہ اور شہرام، خرم کے کہنے پر اس کا بہت خیال کر رہے تھے مگر وہ جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ اس کا سب کچھ نفرت، حسد اور خود مہر کی کے ریلے میں بہہ گیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں کوئی اعزاز نہیں رہا تھا۔ اب کون اس کا منتظر ہو گا وہ ایک رات باہر گزارنے والی لڑکی تھی، اسے کون قبول کرے گا۔ یہ سب سوچیں دھواں بن کر آنکھوں میں اتر رہی تھیں، عجیب ٹھٹھن ہو رہی تھی اندر کہیں، وہ پھٹ پڑنا چاہتی تھی، چیخنا چاہتی تھی مگر اس کے اور خولہ کے حالات بہت مختلف تھے، وہ خالی خالی آنکھوں سے سارے منظر دیکھ رہی تھی۔

”خرم.....! میں نے پتہ کروایا ہے عطیہ خاتون ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں، ان کی حالت کل سے خراب ہے اس لیے ہمیں خود ہاسپٹل جانا چاہیے۔“ ابرار نے بتایا۔

”عطیہ خاتون بیمار ہیں.....؟ انکل.....! کیا ہوا ہے عطیہ خاتون کو.....؟ ہاں.....! معلوم ہے مجھے ان کو کیا ہوا ہے.....؟ وہ..... وہ میری وجہ سے ہاسپٹل گئی ہیں۔“ آف میرے خدا.....! میں کتنی بری ہوں، اپنی عطیہ خاتون کی بات نہیں مانی، اپنی خود سری اور ہٹ دھرمی سے میں نے ان کو بابا کی نظروں میں گرا دیا۔ عطیہ خاتون نے کہا تھا کہ اگر میں نے ایسی ویسی حرکت کر کے ان کی عزت بابا کی نظروں سے گرا دی تو..... تو وہ زندہ نہیں رہیں گی۔ کہیں..... کہیں عطیہ خاتون نے خود.....“ خولہ روتے روتے چیخی اور دروازے کی طرف بھاگی۔ خود ابرار اور خرم کے قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ خولہ کو شبہ ہی نہیں یقین تھا کہ اس کی اس حرکت کی وجہ سے عطیہ خاتون نے یقیناً خودکشی کر لی ہوگی۔

”خولہ.....! خولہ بیٹا.....! ہم ہیں ناں.....؟ ہم دیکھ لیتے ہیں کیا بات ہے.....؟ تم زکو.....!“

”نہیں.....! نہیں ماموں.....! میں عطیہ خاتون کی مجرم ہوں، مجھے ان کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگنی ہے اگر ایسا نہ ہوا تو میں بھی خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”خولہ.....! میری گڑیا.....! تم نے قصور ہی کیا کیا ہے.....؟“ لیلیٰ ماں تھیں ناں، بیٹی کو یوں تڑپا دیکھ کر چل گئیں۔

”آپ.....! آپ نہیں جانتیں ماما.....! کہ میں نے کیا کیا ہے.....؟ کتنا دل دکھایا ہے عطیہ خاتون کا،

میں نے ان کو بابا کی نظروں میں گرا دیا ہے، وہ یہ ذلت ہرگز برداشت نہیں کر پائیں گی، وہ زندہ نہیں رہیں گی ماما.....! اور اگر میری عطیہ خاتون کو کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔“

”چپ رہو.....! باپ کے پاس تھی تو زندگی کے لیے لڑتی رہیں اور اب ماں کو ملی ہو تو مرنے کی باتیں کر رہی ہو وہ بھی ایک غیر عورت کے لیے.....؟“ لمحہ بھر کے لیے لیلیٰ کو عطیہ خاتون سے حسد محسوس ہوا خولہ کی محبت دیکھ کر۔

”کیا کہا آپ نے.....؟ غیر عورت.....؟ عطیہ خاتون غیر عورت ہیں.....؟“ اس نے ایک جھٹکے سے لیلیٰ کو خود سے الگ کر دیا تو اسی جھٹکے نے خولہ کی زندگی میں عطیہ خاتون کی اہمیت بتادی تو وہ اپنی سوچ پر شرمندہ ہو گئیں۔ انہوں نے خولہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیار کیا۔

”تو پھر مجھے بھی اپنی عطیہ خاتون کے پاس لے کر چلو جان.....! میں تو اس عورت کو دیکھنا چاہتی ہوں جس نے تمہارا بچپن جیا ہے، تمہارے قرب کا ایک ایک لمحہ محسوس کیا، پہلی بار چلتے ہوئے تمہاری انگلی پکڑی، تمہاری پہلی شرارت دیکھی ہوگی، اسی عطیہ خاتون نے میرے حقوق کو جیا ہے اور میں ترستی رہی۔“ زندگی بھر کی خلش، تڑپ، محرومی لیلیٰ کے لہجے میں اتر آئی۔ عطیہ خاتون کے لیے خولہ کی محبت اور تڑپ نے ایک عجیب بے نام سا احساس کتری اندر اتار دیا تھا۔

”ماما.....! جلدی سے عطیہ خاتون کے پاس چلیں، انہیں کچھ ہو گیا تو.....“

”بس.....! بس آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خولہ.....! میری جان.....! چلو ہم چلتے ہیں۔“ لیلیٰ خولہ کو ساتھ لگائے آگے بڑھیں تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھی علیزہ کی طرف مڑیں۔

”اور بیٹا.....! تم.....! لیلیٰ خود بھی چونک گئیں کہ بیٹی کو پا کر وہ اسے کس طرح نظر انداز کر گئی تھیں۔

”نہیں آنٹی.....! آپ میری فکر نہ کریں، میں اپنے گھر خود چلی جاؤں گی۔“ علیزہ کے گہرے لہجے میں کسی اُجڑے ہوئے، لٹے ہوئے قافلے کے سردار جیسی ٹوٹی ہمت اور تھکن تھی۔

”نہیں بیٹا.....! ہم ذرا ہاسپٹل سے ہوا آئیں پھر میں اور ابرار تمہیں خود چھوڑ کر آئیں گے، تب تک آپ گھر پر زکو۔“ خرم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ ایک نظر ان کو دیکھ کر رہ گئی۔ مزید کچھ کہہ نہ سکی۔

”جی بہتر.....! وہ چپ چاپ بیٹھ گئی، صرف سنی اس کے پاس تھی باقی سب ہاسپٹل جا چکے تھے۔ سنی اس کا دل بہلائے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں اور وہ اندر اترتی ذلت کی شام سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔ بچپن سے اب تک کے واقعات گڈمڈ ہو رہے تھے، شہلا کی محبت، قربانی، پھر ارمغان جیسے اچھے شخص کی محبت، توجہ اور اپنی حقارت، بے وجہ کی نفرت، حسد، جس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر ڈالا تھا۔ وہ آگے کی رہی تھی نہ پیچھے کی۔ وردہ کتنے فائدے میں رہی تھی، ہر وقت ہر لمحہ اس نے ماما کی محبت کے موتی سمیٹے تھے، ارمغان جیسا اچھا شخص تو واقعی اسے ہی ملنا چاہیے تھا۔

”آپ.....! آپ کیا سوچ رہی ہیں.....؟“ سنی نے دوسری بار اس کے سامنے چائے اور دیگر لوازمات لا کر رکھے جن کو اس نے پہلے بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب بھی لگانے کا ارادہ نہیں تھا۔

”آ.....! آپ کہاں جا رہی ہیں.....؟ سب کو آنے دیں ورنہ پھپھو اور پاپا مجھے ڈانٹیں گے۔ ابھی مت



جائیں۔“ علیزہ کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر سنی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تو علیزہ نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم بہت پیاری لڑکی ہو، اپنی اب تک کی زندگی کا نچوڑ تمہیں بتاؤں کہ کبھی اپنی خود سری میں اپنے چاہنے والوں کا دل مت توڑنا ورنہ خود ٹوٹ کر اتنے ٹکڑوں میں بٹ جاؤ گی کہ سینٹا مشکل ہو جائے گا۔ بڑے جو کہیں اسی پر عمل کرنا ورنہ رات باہر گزارنے والی لڑکیوں کی زندگی میں رات کی تاریکی ٹھہر جاتی ہے، کبھی سحر نہیں ہوتی، کبھی روشنی نہیں پھیلتی، واپسی کا راستہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو ختم نہیں ہوتا، کبھی ختم نہیں ہوتا۔“ علیزہ ٹوٹے لہجے میں بولی باہر نکل گئی۔

”ٹھیک ہے، آپ جو کہہ رہی ہیں درست کہہ رہی ہیں، میں آپ کی بات پر عمل بھی کروں گی مگر آپ جائیں تو نہیں، پاپا نے کہا تھا کہ میں آپ کا خیال رکھوں۔“ سنی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ وہ نہ جائے مگر علیزہ قدم اٹھا چکی تھی، اس کی بات پر وہ پھر پلٹی۔

”جو لوگ خود اپنا خیال نہیں رکھ سکتے ناں سنی.....! وہ اس قابل ہوتے ہی نہیں کہ کوئی ان کا خیال رکھے، خدا حافظ.....! پھر ملیں گے اگر خدا نے ملایا۔“ پھر سنی روکتی ہی رہ گئی، وہ اسے خدا حافظ کہتی نکل آئی۔ کتنی اُدھوری ہو گئی تھی وہ، کتنی تنہا سی، جب گئی تھی تو اس کے ساتھ اس کی عزت و قار، خود سری، ہٹ دھرمی سب ہی کچھ تو تھا اس کے پاس مگر اب خالی دامن خالی ہاتھ بڑھ رہی تھی، قدم مردہ تھے، دل سنسان تھا، آنکھیں ویران تھیں۔

وہ اپنے چھوٹے بھائی کی عدالت میں تمام اعتراضات کے ساتھ بیٹھی تھی مگر جواد نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا نہ اسے دیکھا۔ ارمغان اپنے کمرے میں بند تھا۔ علیزہ کا یہ روپ اسے قلمی گوارہ نہیں تھا، شرمندگی سے جھکی آنکھیں اسے پسند نہیں تھیں، اسے تو وہی علیزہ پسند تھی جو ہٹ دھرم تھی، اس سے لڑتی ضرور تھی مگر مکمل تھی، اب وہ اپنے ہونے کا زعم کہیں گنوا آئی تھی، وہ اپنی خود سری ہٹ دھرمی کا سودا کر آئی تھی، اپنے ناز و انداز کھو آئی تھی۔ ارمغان نے اسی اکڑ بد مزاج علیزہ کو چاہا تھا جس کی آنکھیں ندامت سے نہیں جھکی تھیں۔ علیزہ جیسے ہی مردہ قدموں اور ندامتوں کے بوجھ سے جھکی گردن کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی ارمغان کے لیے یہ منظر قابل برداشت تھا اور اسی وقت سے اپنے کمرے میں بند تھا جبکہ جواد بھی نہ ہونے کا ثبوت دے رہا تھا اور دونوں کے اسی سرد خاموش رویے نے علیزہ کو اپنی نظروں میں گرا دیا تھا۔ اس کے اندر طوفان اُٹھ رہے تھے، وہ چاہتی تھی جواد اور ارمغان مل کر اسے خوب برا بھلا کہیں، اسے ڈانٹیں، اس طرح ان کی نظروں سے گر کر اسے جینے کا کوئی شوق نہیں رہا تھا۔ وہ اٹھی اور قالین پر بیٹھے جواد کے قدموں میں جا بیٹھی۔ جواد نے چونک کر اسے دیکھا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”جواد.....! مت موڑ میری طرف سے منہ، مت پھیر و نظریں، مجرم کو سزا دی جاتی ہے، گناہ گار کو سزا دی جاتی ہے، میں بھی مجرم ہوں، گناہ گار ہوں، مجھے سزا دو۔ لیکن..... ٹھیک ہے..... سزا تو تم دونوں نے دے دی ہے مجھے، مجھ سے نظریں پھیر کر، مجھ پر اعتماد نہ کر کے نفرت سے منہ موڑ کر، سزا دے تو دی ہے تم دونوں نے مجھے اب مار بھی ڈالو، قتل کر دو۔ میرے بھائی.....! میں مجرم ہوں، گناہ گار ہوں، مجھے سزا دو، میں بری ہوں،

خود سر ہوں، ہٹ دھرم ہوں۔ مگر..... مگر میرا یقین کرو جواد بھائی.....! میرے کردار کی چادر اب بھی شفاف ہے، بے داغ ہے، ہم نے گناہ کیا ضرور ہے تم لوگوں کی بات نہ مان کر، اپنی خود سری دکھا کر، محبتوں کو جھٹلا کر جو گناہ مجھ سے ہوا اس کی سزا تو ملنی چاہیے تھی مگر میرے پروردگار نے میری عزت محفوظ رکھی، میری اور خولہ کی عزت بچائی، اگر اب بھی یقین نہ آئے تو میں تمہیں اپنا خون معاف کرتی ہوں، جان سے مار دو مجھے کیونکہ میں ماما کو منہ دکھانے قابل نہیں رہی ہوں، نہ ہی ارمغان جیسے انسان کی محبت کے قابل رہی ہوں۔ میرے بھائی.....! میں نے تمہارا دل دکھایا اور اس رشتے کا الزام لگایا جس کا اظہار کبھی سوتیلی ممانے نہ کیا، میں نے اس رشتے کے نبھانے کا الزام لگا دیا۔ میں غلط تھی۔ بھائی.....! میں تمہاری گناہ گار ہوں پلیز.....! مجھے معاف کر دو.....!“

علیزہ پھر اس کے پیروں پر گری تو جواد تڑپ اٹھا اور اس نے جھک کر بہن کو ساتھ لگا لیا۔ دونوں کتنی دیر روتے رہے۔

”جواد.....! تمہیں میری بات پر یقین ہے ناں.....؟“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے اپنی بات کی سچائی کی تصدیق چاہ رہی تھی۔

”ہاں آپنی.....! مجھے اس بات پر یقین ہے، اس یقین کو منوانے کے لیے شاید سب سے جنگ کرنا ہوگی اور شاید آپ یہ جنگ جیت بھی جائیں مگر ایک شخص.....“

جواد کچھ کہتے کہتے رہ گیا تھا کیونکہ وہ ارمغان کی دیوانگی کو بھی جانتا تھا کہ ارمغان علیزہ کے لیے جان بھی دے سکتا تھا مگر جب سے یہ بات ہوئی تھی وہ بالکل چپ تھا۔ اس کی خاموشی کے ایک نہیں کئی مطلب تھے اسی لیے وہ خاموش ہو گیا۔

”ہاں.....؟“ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا جواد کبھی کبھی وہ انسان جسے ہم اپنی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ اس کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا وہی شخص کتنا اہم ہو جاتا ہے کہ اس کی خاموشی بھی تیر کی طرح دل کو لگتی ہے جیسے ارمغان۔

وہ ارمغان جسے وہ ورہ کے لیے بھی پسند نہیں کرتی تھی اس کی لائق پریشان کر رہی تھی، اس کے کمرے کا بند دروازہ کچھ کے لگا رہا تھا، دل چاہ رہا تھا وہ باہر نکلے، اسے برا بھلا کہے، اپنا حق جتائے، اپنی محبت کا اظہار کرے مگر کیوں؟ دل کیوں چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار معاف کر دے، کیوں وہ چاہ رہی تھی کہ اس کی بات کا یقین کرے؟ اگر یہ سب کچھ محسوس ہو رہا تھا، دل یہ سب چاہ رہا تھا تو دل اعتراف محبت کیوں نہیں کر رہا تھا؟ خود سری کی اوٹ میں وہ اسے چاہتی رہی ہے جیسی تو دل ایک بار اسے دیکھنے کی ضد کر رہا تھا جو اسے دیکھتے ہی کمرے میں بند ہو گیا تھا۔

”میں غلط تھی پروردگار.....! تیری ذات واحد نے مجھے بچا لیا، میں تیری شکر گزار ہوں۔ بس اب اللہ پاک.....! ان لوگوں کی بدگمانی دُور فرما دے۔“

عصر کی نماز کے بعد وہ دُعا مانگ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ارمغان کمرے سے نکلا ہے اور جواد سے کوئی بات کر رہا ہے۔ اس کا دل بری طرح خوفزدہ ہو کر دھڑکنے لگا تھا۔

”مجھے ارمغان کی پرواہ کیوں ہے.....؟ میرے بارے میں وہ کوئی بھی رائے رکھتا پھرے مجھے تو اس کی



پرواہ نہیں ہونی چاہیے، اس کی حیثیت ہی کیا ہے میری زندگی میں.....؟ لیکن شاید اس کی وہ حیثیت ہے جس کو میں نے آج تک مانا ہی نہیں۔“ اس نے تھک کر سوچا۔

”مافی بھیا.....! میں نے سارے حقائق آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں، اب آپ کی کیا رائے ہے.....؟“

آپ علیزہ آپنی سے شادی کریں گے ناں.....؟“

جواد کو ارمغان علیزہ کے لیے بے حد پسند تھا، جب سے یہ واقعہ ہوا تھا وہ اسی بات سے خوفزدہ تھا، اس سے زیادہ انتظار نہیں ہوا، اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ارمغان سے سوال کیا جس بات کا پہلے یقین تھا اب وہ خوف بن گیا تھا۔ جواد نے سوال کیا تو علیزہ نے جواب سننے کے لیے سانس روک لیا۔

ارمغان کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے، حالات نے اسے کس دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا، اس نے ہمیشہ علیزہ کو چاہا اور گزرتے ہر پل نے اس کی محبت اور طلب میں اضافہ ہی کیا تھا اور وہ علیزہ کو کسی اعزاز کی طرح اپنانا چاہتا تھا مجبوراً نہیں۔ اس نے سرخ انگارہ تپتی آنکھوں سے دروازے کی اوٹ میں کھڑی علیزہ کے پاؤں کو دیکھا، دل میں ایک ٹیس اٹھی، اس نے محبت کے جس پودے کی آبیاری کی تھی آج وہ اپنے خود ہی نوچ کر پھینک رہا تھا۔ اس نے آنکھیں میچ کر ٹیس کی شدت کو دبایا اور جواد کی طرف دیکھنے لگا جو اس کی خاموشی سے کسی حد تک جواب سمجھ چکا تھا۔

”اور اگر میں بھی تم سے یہی سوال کروں جواد.....! تم بھی خولہ کو بہت چاہتے ہو ناں.....؟ کیا تم خولہ سے اب شادی کر لو گے۔“ ارمغان کو اپنا لہجہ اپنی آواز ہی اجنبی سی لگی۔ جواد اسے دیکھ کر رہ گیا، پھر گہرا سانس لے کر مضبوط لہجے میں بولا۔

”درست کہا آپ نے مافی بھیا.....! میں خولہ کو واقعی بہت چاہتا ہوں لیکن پہلے اگر میں اس سے شادی نہ کر پاتا تو شاید یہ برداشت کر جاتا لیکن اب..... اب میں اس سے شادی ضرور کروں گا کیونکہ اب ہی تو ان لوگوں کو ہمارے سہارے کی ضرورت ہے۔“ جواد بڑے پر جوش انداز میں بولا تو درد کی ایک شدید لہر ارمغان کو بے قرار کر گئی۔

”محبت ضرورت نہیں ہوتی، سہارا نہیں ہوتی، بیساکھی نہیں ہوتی جواد.....! اور جو محبت بیساکھی بن جاتی ہے وہ محبت نہیں ہوتی، وہ ترس ہوتی ہے رحم ہوتی ہے۔“

ارمغان کے گنبد لہجے میں ڈھلے الفاظ علیزہ کو اپنی نظروں میں گراتے چلے گئے۔ ارمغان نے پلٹ کر پھر اس دروازے کی دہلیز میں دیکھا۔ اب علیزہ کے پاؤں نظر نہیں آئے، وہ گہرا سانس لے کر جواد کی طرف مڑا۔

”تم ابھی بچے ہو، تم نہیں سمجھو گے، تمہارے سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔“ ارمغان تیزی سے باہر نکل گیا۔ جواد نے کمرے میں بند ہو کر دروازہ لاک کر لیا۔

علیزہ کو لگا وہ آسمان سے بغیر کسی رکاوٹ کے زمین پر پڑی ہوئی ہو۔ وہ کارپٹ پر گر سی گئی۔

•••

”عطیہ خاتون.....! میں..... میں آپ کی مجرم ہوں۔ پلیز.....! مجھے معاف کر دیں، میں ساری دنیا کو ناراض کر کے خوش رہ سکتی ہوں مگر آپ کو ناراض کر کے میں ایک سانس بھی نہیں لے سکتی۔ میرا دم گھٹ رہا ہے

عطیہ خاتون.....! میں..... میں نے کچھ گنوا یا، اللہ نے میری عزت بچالی ہے، میں بالکل ویسی ہوں، آپ مجھے نہیں معاف کریں گی تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گی۔“

خولہ عطیہ خاتون کے قدموں سے لپٹی تڑپ رہی تھی مگر وہ پھرائی آنکھوں سے چپ چاپ سن رہی تھیں۔

”عطیہ خاتون.....! ہوش میں آئیے اور مجھے بتائیں کہ میری بیٹی اس راستے پر کیسے گئی.....؟ وہ کیسے راہوں کی دھول بنی.....؟ کیسے اس کی جان، اس کی عزت خطرے میں پڑی.....؟ کیا یہی تربیت کی ہے آپ نے اس کی.....؟ اور کہاں ہے اس کا غیرت مند باپ جس نے جلاد بن کر ماں کی گود اس لیے برباد کی کہ وہ اسے ایک بہت انوکھی اور منفرد اپنی سوچ اور آئیڈیل کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا.....؟ اس کو اس لیے مجھ سے چھینا تھا کہ وہ راہوں کی دھول بن جائے.....؟ انھیں عطیہ خاتون.....! آپ دونوں جواہدہ ہیں، مجرم ہیں میرے، میرے سوالوں کے جواب دیں۔“

لپٹی دہلیزوں کی طرح چلائے گئیں اور کمزور نحیف عطیہ خاتون کو جھنجھوڑ ڈالا۔ تب ہی ابراہار جلدی سے آگے بڑھے اور لپٹی کو شانوں سے پکڑ کر الگ کیا۔

”بی بیو عائشہ.....! یہ دیکھو وہ شاہک میں ہیں، خولہ کو انہوں نے بیٹی کی طرح پالا، اس کا گھر سے یوں چلے جانا، رات باہر گزرا نا، کتنے صدمے کی بات ہے.....؟ جبکہ خولہ ان کی بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔“

”ہونہہ.....! یوں بھائی جاتی ہیں ذمہ داریاں.....؟ گہری نیند سو کر.....؟ دروازے کھلے چھوڑ کر.....؟“

لپٹی بہت زیادہ تلخ ہو رہی تھیں ان حالوں میں خولہ کا ملنا ان کو پاگل کر گیا تھا۔

”آپ عطیہ خاتون کو کچھ مت کہئے۔ پلیز ماما.....! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ان کا کوئی قصور نہیں، آج اگر مجھے زندہ دیکھ رہی ہیں تو اللہ کی کرم نوازی کے بعد عطیہ خاتون کی محبت توجہ اور دعا ہے، یہ عورت نہیں فرشتہ ہے، انہوں نے بچپن سے اب تک میرے اندر نیکی اور اچھائی کے چراغ ہی روشن کیے ہیں، یہ میری اپنی کمزوری ہے ماما.....! کہ میں آپ کو اس حال میں ملے۔“

”خدا کے لیے ہوش میں آئیے عطیہ خاتون.....! میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں، دیکھئے تو سبھی آج میں ماں کی گود میں لوٹا دی گئی ہوں، آپ کو بھی میری ماما سے ملنے کا شوق تھا ناں.....؟ اٹھئے.....!“

خولہ کا دروازہ کھلا تھا۔ اسے بچپن سے عطیہ خاتون کی محبت ہی نظر آتی تھی۔ انہوں نے کبھی اسے پھول کی چھری نہیں لگائی تھی وہ اب تک ماں کے بغیر زندہ تھی مگر اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور اب تو اس کی وجہ سے عطیہ خاتون کا یہ حال ہوا تھا۔ وہ اس قدر شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح ان کو ہوش میں لے آئے۔

”کاش.....! میں اسی وقت مر گئی ہوتی جب مجھے میری ماں کی گود سے جدا کیا گیا تھا، جب ماں کے بغیر جی لیا، عطیہ خاتون سب کچھ بن گئیں میری اب وہ مجھ سے خفا ہو گئی ہیں تو مجھے بھی نہیں جینا۔ بابا سے مجھے نفرت ہے، آج ان حالوں میں ان کی وجہ سے ہوں، ادھوری نامکمل زندگی گزاری ہے میں نے ترس ترس کر، ایک ماں کی محبت کا نعم البدل عطیہ خاتون تھیں یہ بھی خفا ہو گئیں تو میری ماں تو میری جدائی کی عادی ہو گئی ہے، اب بھی سبھی..... نہیں جینا مجھے اب بدنامیوں کے ساتھ، عطیہ خاتون کی بدگمانی کے ساتھ نہیں جینا۔“



خولہ نے ایک فیصلہ کر کے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈا، اس کی سرد آواز پر عطیہ خاتون کا سکتہ ٹوٹ گیا، انہوں نے پلٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”عطیہ خاتون.....! میں جانتی ہوں میری خطا بہت بڑی ہے، آپ کا کہنا نہ ماننا، دل توڑنا، معمولی جرم نہیں ہے میرے۔ عطیہ خاتون.....! جان سے مار ڈالیں مگر مجھ سے بدگمان نہ ہوں، خفا نہ ہوں، پلیز.....! میں اللہ کے فضل اور آپ کی دعاؤں سے بچ گئی ہوں، پروردگار نے میری اور علیہ کی عزت محفوظ رکھی، میری بات پر یقین کریں ورنہ آپ کے قدموں پر جان دے دوں گی۔“

خولہ بری طرح رو رہی تھی، عطیہ خاتون نے اسے صرف جہنم نہیں دیا تھا مگر ساری کی ساری مٹا اس پر لٹائی تھی، اس کی پلک نہ بھیکے اسی کوشش میں وہ بہت مشکل فیصلے کر جایا کرتی تھیں، آج وہ ان کے قدموں سے لپٹی رو رہی تھی۔

”صرف جہنم نہ دینے کی سزا تم مجھے نہیں دے سکتیں خولہ.....! اپنی مٹا کو بچھا اور کیا ہے تم پر، میرا یقین تو تم سے شروع ہو کر تم پر ختم ہوتا ہے میری جان.....! مگر اب میں شہباز صاحب سے نظر ملا ہونے کے لائق نہیں رہی۔“

خولہ کو ساتھ لگا کر عطیہ خاتون باقی سب کی موجودگی اور اہمیت کو بھول گئیں۔

”عطیہ خاتون.....! اب آپ اپنے گھر نہیں ہمارے گھر چلیں گی۔“ لیلیٰ نے کہا۔

”خولہ بیٹا.....! یہ بات تم عطیہ خاتون کو سمجھا دو، ہم باہر ڈاکٹر سے بات کر رہے ہیں، تم ان کو تیار کرو۔“

ابراہیم خولہ کو ہدایات دیتے باہر نکل گئے۔ خولہ عطیہ خاتون کو دیکھنے لگی۔ چوبیس گھنٹوں میں پیش آنے والے حادثے نے عطیہ خاتون کو بالکل نچوڑ کر رکھ دیا تھا، ان کے سینے پر بے درجہ وار چرے پرانچا نے خوف کے سائے تھے۔ یہ عورت ماں نہیں تھی مگر ماں والی ہر ضرورت ہر خواہش پوری کی تھی اس کی، ہر نانہ خرہ اٹھایا تھا اس کا، شہباز کے سامنے اس کی غلطیاں بھی چھپائی تھیں، بہت اہم تھیں یہ عطیہ خاتون اس کی زندگی میں۔

”آپ.....! آپ کو میری بات پر یقین آ گیا ناں.....! میں خود سر، ہٹ دھرم ضرور تھی مگر خدا نے ہماری عزت بچالی، میں غلط تھی مگر آپ مجھے معاف کر دیجئے پلیز.....!“

خولہ سب کے جانے کے بعد پھر ان سے لپٹ کر شدتوں سے رو دی تو انہوں نے پہلے جیسی محبت میں سمیٹ لیا۔ عطیہ خاتون بہت خوفزدہ ہو گئی تھیں، وہ رات انہوں نے خدا کے حضور شکر اُٹانے کے بعد دوں میں گزاری کہ خولہ با عزت لوٹ آئی تھی۔ خولہ شہباز کی امانت تھی اور اگر خدا انہو استہ امانت میں خیانت ہو جانی تو وہ خود کو خود سزا دیتیں اور اب وہ لیلیٰ کی عدالت میں بیٹھی سوالوں کے جواب دے رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ شہباز قصور وار ہے کہ لیلیٰ، اگر کہیں لیلیٰ قصور وار تھی تو شہباز اس سے زیادہ قصور وار تھا۔

”یہ سارے قدرت کے فیصلے ہیں لیلیٰ.....! کس نے سوچا تھا کہ ماں بٹی کا لاپ اس طرح ڈرامائی انداز میں ہوگا لیکن آپ کو دیکھ کر اور جو کہانی شہباز صاحب نے مجھے سنائی اس میں لپٹا ہے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے یا شاید کسی کمزور مرد کی طرح شہباز صاحب نے بھی..... بہر حال میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میاں بیوی کی لڑائی کی چکی میں پسنے والی معصوم اور بے قصور اولاد ہوتی ہے جو ماں اور باپ دونوں کے ساتھ پرسکون اور نارمل زندگی گزارنا چاہتی ہے مگر والدین اپنی اپنی اُنا کے خول میں بند ہو کر اسے وقت اور حالات کے طوفان کے سپرد کر

دیتے ہیں۔“

عطیہ خاتون کو ایسے ہی کسی موقع کا تو انتظار تھا کہ وہ لیلیٰ اور شہباز دونوں سے پوچھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔

”لیلیٰ.....! مجھے جو کہانی سنائی گئی اس کے مطابق آپ اگر ان کی بات مان جاتیں تو.....“

”بس عطیہ خاتون.....! آپ نے تصویر کا ایک رخ دیکھا ہے دوسرا رخ بھی دیکھ لیں پھر بتائیں قصور کس کا ہے.....؟ میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوئی، شہباز نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنا شوق جاری رکھوں مگر ایک شیطان کے کہنے میں آ کر مجھ سے دوبارہ غلطی ضرور ہوئی تھی اور اگر رتی برابر طرف بھی اس شخص میں ہوتا تو مجھے معاف کر سکتا تھا مگر اس نے مجھے معاف نہیں کیا اور چند روز کی میری بچی مجھ سے چھین کر میری گود میں ویرانی کی آگ بھڑک چلا گیا۔“ لیلیٰ وہ وقت یاد کر کے تڑپ اٹھیں۔

خولہ نے ہاں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

”مما.....! میں آپ کے پاس ہوں، بابا نے مجھے آپ سے چھیننا ضرور تھا ممما.....! مگر مجھے پایا نہیں، آپ کو پتہ ہے ناں میں نے آپ کی گود کی جنت کھو کر اتنی زندگی دوزخ میں گزاری ہے۔ ترستی رہی ہوں ہر خوشی کے لیے، ہر ضرورت کے لیے، ہر خواہش کی تکمیل کے لیے مگر بابا نے زندگی کو آپ کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی سزا بنا دیا۔ ممما.....! میری ہر عمر کی ہر خواہش کو مٹل دیا، ٹی وی کو میری کمزوری بنا دیا۔ ممما.....! میں اپنی کسی عمر کو انجوائے نہیں کر سکی ہوں، میں نے اب نارمل زندگی گزاری ہے، میری فریڈ ز اپنے ممما پاپا کے ساتھ نارمل زندگی گزارتی تھیں اور میں.....“ خولہ کا لہجہ سب کو دکھائی دے رہا تھا۔

”چلو بیٹا.....! اب تو سب ٹھیک ہو گیا ناں.....!؟ کچھ لو وہ سب درد کے لمحے تھے جو ہم پر گزرے، ان کو اک خواب پریشان سمجھ کر بھول جاؤ۔“ خرم اپنی آنکھیں صاف کرتے خولہ اور لیلیٰ کو ساتھ لگا کر بولے مگر لیلیٰ چپ نہ رہ سکیں۔

”بھائی.....! بات ختم نہیں ہوئی ہے، جواب دینا ہوگا شہباز کو ایک ایک ظلم کا، بلائیں اس کو۔“

● ● ●

”مما.....!“

شرجیل تیزی سے آگے بڑھا۔ آمنہ نے آنکھیں کھولیں تو شرجیل پر جیسے نظریں جم گئیں۔ کیا یہ ان کا اپنا بیٹا شرجیل ہی تھا، ہاں! بھلا ایک ماں اولاد کو پہچاننے میں غلطی کب کر سکتی ہے لیکن کتنا فرق تھا کل کے شرجیل اور اس وقت ان کے قریب بیٹھے شرجیل میں۔ وہ بے یقینی سے دیکھنے لگیں پھر اپنے سرد ہاتھوں سے اس کو محسوس کرنے لگیں۔

”مما.....! کیا دیکھ رہی ہیں.....؟ میں آپ کا بیٹا.....! آپ کا شرجیل ہوں ممما.....!“

”اولاد کو ماں سے اپنے تعارف کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی میری جان.....! میرے شہزادے.....! ماں کو اولاد کی خوشبو آ جاتی ہے۔ میں تو یہ یقین کر لیتا چاہتی ہوں کہ کیا میں میری جیسی گناہگار ماں بھی اس قابل ہے کہ اس کا بیٹا اس کے پاس لوٹ آئے.....؟ میرا چاند.....! میرا بیٹا.....! لوٹ آیا۔ یا اللہ.....!“



تیرا شکر ہے، یا اللہ.....! تیرا شکر ہے۔“ بیٹے کو سینے سے لگانے سے پہلے وہ سجدے میں گر کر شکرانہ ادا کرنے لگیں۔

”مما.....! اللہ نے آپ کی ساری دعائیں سن لی ہیں۔ دیکھئے تو میں کیا تھا اور اس جدائی نے کیا بنا دیا مجھے.....؟ میں نے یقین کی منزل پالی ہے مما.....! میں آپ کا بیٹا ہوں۔“ دونوں ماں بیٹا جانے کب تک ٹھنڈے سرد فرش پر بیٹھے رہے جدائی کا ایک ایک لمحہ شمار کرتے رہے۔ آمنہ بیٹے کے ہونے کا یقین کرتی رہیں، اسے پیار کرتی رہیں۔

”مما.....! ماہم سو گئی ہے کیا.....؟“

”ماہم کے بھائی نے آنا ہوا اور ماہم سو جائے.....؟ ایسا ہو سکتا ہے.....؟“

ماہم کو معلوم تھا شرجیل کو آنا ہے، دوسرا اس نے ہادیہ کو فون کر کے کنفرم کر لیا تھا۔ وہ بے تابی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اس نے تو سر پرانے کے چکر میں مما کو بھی شرجیل کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب وہ بھائی کے ساتھ لگی خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

”پاپا تو سو رہے ہوں گے ناں مما.....! چلیں رہنے دیں میں صبح مل لوں گا ان سے۔“ وہ اب اعتماد کی اس منزل پر تھا جہاں سب کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

”کیوں.....؟ صبح کیوں.....؟“ آمنہ نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ وہ سمجھ رہی تھیں وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔

”پاپا کو شروع سے یہ بات پسند نہیں کہ ان کی نیند خراب ہو اور اب تو ان کی طبیعت بھی خراب ہے اس لیے۔“ شرجیل کے لہجے میں باپ کے لیے احترام تھا۔

”میں جاگ گیا ہوں میرے بیٹے.....! میرے شرجیل.....! وہ تو غفلت کی نیند تھی۔ میرے بچے.....! جو کمزور لوگ ہوتے ہیں ناں ان کو غفلت کی نیند بہت عزیز ہوتی ہے لیکن میرے شہزادے.....! تمہاری جدائی کے جھٹکے نے وہ غفلت کی نیند توڑ دی ہے، اب میں جاگ گیا ہوں میرے بیٹے.....! میرے شرجیل.....!“

انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے بازو پھیلا دیئے اور شرجیل بھاگ کر ان میں سما گیا اور واصف نے بچپن سے چھپائے ہوئے پدرانہ شفقت کا خزانہ ان چند لمحوں میں لٹا دیا تو شرجیل کو لگا جیسے ایک مدت تک وہ تپتے صحرا میں چلتا رہا ہو، بھوک ٹھکن سے اس کا برا حال ہو مگر آج پاپا کے سینے سے لگ کر ہر بات کا احساس مٹ گیا تھا۔ پاپا کی محبت ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی محرومی تھی، اسی محرومی نے تو اسی کو بے یقینی کے سمندر میں طوفانی لہروں کے حوالے کر دیا تھا، آج جیسے اسے کنارہ مل گیا تھا۔ اگر یہ محبت، یہ پیارا سے پاپا کی طرف سے بچپن سے ملتا تو وہ ایسا کیوں ہوتا، کیوں گھر سے بے گھر ہوتا۔

”پاپا.....! آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟ آئی ایم سوری پاپا.....! لیکن یقین کریں میں جان بوجھ کر گھر سے

نہیں گیا تھا اور اس ارادے سے تھوڑی گیا تھا کہ پھر واپس نہیں آؤں گا۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں.....؟“

”میں اپنی ہر غلطی مانتا ہوں میرے بیٹے.....! اعتراف کر چکا ہوں کہ میں غلط تھا، میں نے تمہاری ماں کے ساتھ بھی زیادتی کی، بلا وجہ اپنی اور تم سب کی زندگی عذاب کر دی، بات ساری درگزر کی ہوتی ہے، میں آمنہ کو

معاف کر دیتا تو ہم آج پرسکون زندگی گزار رہے ہوتے اس لیے بیٹا.....! اب تم ماں بیٹا اور میری بیٹی مجھے معاف کر دو، میں دست بستہ معافی مانگ رہا ہوں۔“

واصف نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے تو آمنہ نے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔ شرجیل اور ماہم واصف کے سینے سے لگے تو جیسے ان کو ٹھنڈ پڑ گئی۔

شرجیل نئے روپ کے ساتھ لوٹا تھا۔ گھر کے سارے لوگ ہی بے حد خوش تھے۔ خاص طور پر عارف چچا تو بے حد خوش تھے مگر موبی شرمندہ تھا، وہ شرجیل سے واقعی بہت نادم تھا مگر کھلی آنا آڑے آرہی تھی کہ اس نے اس سے معذرت نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی شرجیل گھر کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا، کتنا بھرپور اعتماد تھا اس کے انداز میں، کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی یہ لڑکا عدم اعتماد کا لمحہ بھر کے لیے بھی شکار رہا ہے اور یہ بات ہی موبی کو شرمندہ کرتی رہتی کہ انسان اگر برے وقت میں کسی کا ساتھ دے تو وہ ہمیشہ کے لیے معتبر ٹھہر جاتا ہے جیسے ثاقب، بیورو وغیرہ کل بھی شرجیل کے دوست تھے اور آج کتنے اعتماد سے اس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ موبی کو ایک تو سب نے خوب شرمندہ کیا تھا، دوسرا اسے شرجیل کو دیکھ کر بہت ندامت ہو رہی تھی اسی لئے وہ سب کو کھیلتا چھوڑ کر چپکے سے وہاں سے آنے لگا تو کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چونک کر دیکھا، ماہم بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں.....؟ ڈرتے ہوئے میرے بھائی سے.....؟ ذرا غور سے دیکھو موبی.....! یہ وہی لڑکی ہے شرجیل جس کا مذاق اڑایا کرتے تھے تم.....! آج کیا ہوا.....؟ جاؤ اس شرجیل کا جواب اللہ کے فضل و کرم سے شرجیل بن چکا ہے مقابلہ کرو۔“ اسی وقت شرجیل آگے بڑھا۔

”نہیں ماہم.....! اب نہیں، اب ہمیں یہ مقابلے بازی کو ختم کرنا ہوگا، ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کرنا ہوگا، اگر نہیں کریں گے تو ہر دور میں، ہر نسل میں موبی، ماہم اور شرجیل پیدا ہوتے رہیں گے۔ ٹھیک ہے جو کچھ ہوا غلط ہوا، میں موبی کو وہ سب معاف کرتا ہوں اور یوں ایک طرح سے تو میں موبی کا احسان مند ہوں کہ اس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ اصل میں ہر اچھائی انسان کے لیے اللہ کی طرف سے ہوتی ہے بس وسیلہ وہ جسے چاہے بنادے اور میرے یقین کی طرف پہنچنے کا وسیلہ اللہ نے موبی کو بنا دیا تو ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔“

شرجیل نے نادم سے کھڑے موبی کی طرف بازو پھیلا دیئے تو موبی اس کے گلے لگ کر رو پڑا۔

”سوری.....! اور یہ سوری شرجیل.....!“

”اوکے.....! آج کے بعد پرانی کسی بات کا ذکر نہیں ہوگا۔ ماہم.....! ٹھیک ہے ناں.....؟“ شرجیل نے ماہم کو تنبیہ انداز میں کہا تو وہ بھائی کو دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی۔

”جی بھیا.....!“

”سوری ماہم.....!“ موبی نے شرمندگی سے ماہم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ماہم نے خوش دلی سے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا۔

زندگی کا یہ رنگ اتنا روشن اور خوبصورت تھا جس نے سب کو خوش کر دیا تھا۔ زندگی میں نکھار سا آ گیا تھا۔



واصف بے حد خوش تھے۔ شرجیل نے ساری ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔

”یار شرجیل.....! میں تو بالکل ہلکا ہو گیا ہوں، کوئی ذمہ داری نہیں، کوئی پرہیز نہیں، میں تو اب خود کو جوان سمجھنے لگا ہوں، ہواؤں میں اڑنے لگا ہوں۔ خدایا.....! میں تیرا شکر ادا نہیں کر سکتا، اتنی خوبصورت زندگی پروردگار نے دے دی ہے۔“

”واصف.....! کیا خیال ہے.....؟ اب ہمیں بھولے آئی چاہیے ناں.....؟“

آمنہ نے آنکھوں میں جگنو لیے شرجیل کو دیکھا۔ اس بات پر ایک انجانا سا سایہ اس کے دجیبہ چہرے پر آکر گزر گیا۔

”کیوں نہیں.....؟ آمنہ.....! میرے آنکھ میں اب نئے پھول کھلنے چاہئیں۔“

”شرجیل بیٹا.....! کتنی بار تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے اپنے اس محسن سے ملا دو جس نے تمہیں آج.....“

آمنہ نے بار بار کہا تھا عرفان سے ملا دے، ہادیہ کو دکھا دے مگر وہ ہر بار بات ٹال دیتا۔

”چھوڑیں ناں ماما.....! پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔ پاپا.....! ہم باہم کی شادی کی بات کیوں نہیں کرتے.....؟ جبکہ لڑکا بھی اپنے گھر ہے، بڑے تایا کو تو میرے خیال میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ماما، اور تیسور کے رشتے پر۔“

ہمیشہ کی طرح وہ پھر ہادیہ کے ذکر سے بچ کر گزرنا چاہتا تھا۔

”ہاں.....! کسی کو کسی بات پر اعتراض نہیں بیٹا.....! مگر میں اب بہو اور داماد ایک ساتھ گھر میں دیکھنا

چاہتی ہوں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں مجھے عرفان کے گھر لے چلو۔“

ماما نے آمنہ کو بتا دیا تھا کہ شرجیل ہادیہ کو بہت چاہتا ہے اس لیے آمنہ نے سوچ لیا تھا کہ بیٹے کی زندگی میں پہلی بار کچھ مانگا ہے، چاہا ہے تو اسے اس کی چاہت ضرور مٹنی چاہیے جبکہ شرجیل خوفزدہ تھا کہ جب آمنہ کو پتہ چلے گا کہ ہادیہ کس کی بیٹی ہے تو شاید واصف اور آمنہ ان کے احسان کا بھی پاس نہ کریں اور کوئی ناپسندیدہ صورت حال پیدا نہ ہو جائے اسی لیے وہ ان کو پردے میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ عرفان کی بے حد عزت کرتا تھا اور ہادیہ کو چاہتا تھا اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ کوئی غلط صورت حال پیدا ہو۔

”ماما.....! چھوڑیں بھی، اگر آپ کو بھوتی لانی ہے تو گھر میں بھی بہت اچھی لڑکیاں ہیں، کسی کو بھی دیکھ لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا.....! گھر میں بھی بہت اچھی لڑکیاں ہیں مگر ہادیہ کیوں نہیں.....؟ مجھے ماما نے سب کچھ

بتا دیا ہے، ذرا میں بھی تو دیکھوں میرے بیٹے کی پسند کیسی ہے.....؟“

اور پھر آمنہ واصف کا ہادیہ کے لیے اور عرفان کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے اتنا اصرار بڑھا کہ شرجیل کو عرفان سے ملنا ہی پڑا۔ اس نے ساری صورت حال عرفان کو بتا دی۔

”اب کیا کریں عرفان بھائی.....! ماما تو کسی صورت مان کر نہیں دے رہیں۔ وہ کہتی ہیں میں نے اپنے محسن سے ملنا ہے۔“

”کرنا کیا ہے.....؟ میں چلتا ہوں ان کی عدالت میں پیش ہو جاتا ہوں جو سزا دیں گے قبول کر لوں گا اب

اور کیا ہو سکتا ہے.....؟“

”نہیں عرفان بھائی.....! میں خوفزدہ ہوں، ان لوگوں کے ظرف کا تو ہمیں اندازہ ہو ہی گیا ہے۔ ماما پاپا

آپ کو کچھ کہیں یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“

شرجیل بہت خوفزدہ تھا کہ کہیں اس کے والدین عرفان کے ساتھ برا رویہ نہ اپنائیں مگر عرفان نے اس کی

ایک بات نہیں سنی بلکہ حسن بھی شریک ہو گئے۔

”بیٹا.....! عرفان درست کہہ رہا ہے، ہمیں اب ماحول ختم کرنا ہوگا، ہمیں اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے

ان کا ازالہ کرنا ہوگا۔ تم خوفزدہ نہ ہو، ماضی میں جو کچھ ہوا اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ چلو میں چلتا ہوں آمنہ اور

واصف کے پاس۔“

اور پھر شرجیل کے منع کرنے کے باوجود حسن اور عرفان اس کے ساتھ آ گئے اور جب آمنہ واصف کو

اپنے محسن کا پتہ چلا تو لمحے بھر کے لیے عرفان کا احسان مٹی میں مل گیا۔ شرجیل ماں باپ کے چہرے کے تاثرات

سے ہی خوفزدہ ہو گیا کہ اب بچانے کیا ہوگا۔

”واصف.....! آمنہ.....! اس وقت میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کے کیا تاثرات ہیں.....؟ مگر.....“

”شٹ آپ حسن.....! جو ایک لفظ بھی آگے کہا ہو تو۔ ارے.....! میں تو دھوکے ہی میں ماری گئی۔ کاش

کہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرے بیٹے کو تمہارا بیٹا سہارا دے گا، چلنا سکھائے گا تو میں خدا سے دعا کرتی کہ شرجیل

جیسا ہے ویسا ہی رہے۔ میرے بیٹے کو زندگی کی طرف لانے والا، اسے ڈوبنے سے بچانے والا، میرا محسن تمہارا

بیٹا ہوگا.....؟ مجھے یہ پہلے سے پتہ ہوتا تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو شوٹ کر دیتی مگر تمہارے بیٹے کا احسان

نہ لیتی۔ تم جیسے گھٹیا، کم ظرف انسان کے بیٹے کا ہرگز احسان نہ لیتی۔“

آمنہ نے حسن کے حوالے سے زندگی کو نکلیں زندگی نے آمنہ کو جیتا تھا، ایک ایک سانس پر ان کو زندگی نے

حسن کا نام لے لے کر کوڑے لگائے تھے تو وہ اب اس حسن کو معاف کیسے کر دیتیں، ان کے بیٹے کو اپنے محسن کی

حیثیت سے کیسے قبول کر لیتیں۔ وہ یہی طرح چلائے گئیں۔ وہی ہوا تھا جس کا شرجیل کو اندیشہ تھا۔ واصف بالکل

خاموش تھے، اس خاموشی کی آوٹ میں خیر کی خبر تھی یا شر کا طوفان تھا کوئی کہہ نہیں سکتا تھا۔ عرفان اور شرجیل بے

بس سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”شرجیل.....! جب تم جانتے تھے کہ یہ..... یہ شخص وہی ہے جس نے ہماری زندگی عذاب بنا دی تھی پھر تم

اسے لے کر کیوں آئے.....؟ میں کہتی ہوں حسن.....! نکل جاؤ میرے گھر سے بالکل اسی طرح جس طرح کبھی

میرے دل سے چوروں کی طرح نکلے تھے دھوکے فریب کے دروازے سے۔ اب بھی نکل جاؤ، ایسا نہ ہو کہ میں نہ

تعلیم کا بھرم رکھ سکوں اور نہ خاندانی وضع داری کا پاس کر سکوں، نکل جاؤ۔“

آمنہ نے اس کے حوالے سے جس طرح زندگی گزار دی تھی یہ وہی جانتی تھیں۔ انہوں نے خاصے ہنگ

آمیز انداز میں عرفان کے احسانات کو بالائے طاق رکھ کر ان لوگوں کو نکل جانے کو کہا تو شرجیل کھڑا ہو گیا۔

”ماما.....! پلیز ایسا مت کریں، ماضی میں جو کچھ ہوا وہ ہم سب نے جھیلا ہے مگر یہ دیکھئے کہ ان کے بیٹے

کا احسان بڑا ہے کہ انکل کی خطا زیادہ بڑی ہے.....؟“ شرجیل کو بہت شرمندگی ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ



کاش وہ ان لوگوں کو لے کر نہیں آتا تو اچھا تھا۔

”نہیں شرجیل.....! اس شخص نے جو ماضی میں کیا اس کے سامنے اس کے بیٹے کے احسان کی کوئی حیثیت نہیں اور یوں بھی یہ کوئی احسان نہیں، میں نہیں مانتی۔ اس احسان سے کہیں بہتر تم اسی طرح پاگل، ایب نارل رہتے، بے یقینی کے جنگل میں بھٹکتے رہتے تو وہ زیادہ اچھا تھا لیکن اب اس کے احسان کے بوجھ تلے میرا دم کھٹنے لگا ہے۔ پہلے باپ نے مارا، اب بیٹے نے احسان سے مار ڈالا، کیوں آگئے ہو تم لوگ زندگی میں دوبارہ.....؟“

آمنہ بالکل اپنے حواسوں میں نہیں تھیں۔ ماضی میں جو کچھ ان کے ساتھ ہوا ایک ایک لمحہ پراذیت گزارا۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ کبھی بھی زندگی میں حسن سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کا گریبان ضرور پکڑیں گی لیکن ستم تھا وقت اور حالات کا کہ وہ مجرم ملا بھی تو ایک حسن کے باپ کے روپ میں مگر وہ اتنی بھگت چکی تھیں کہ ان کو یہ احسان اور محسن دونوں گوارہ نہیں تھے۔ حسن اور واصف شرمندگی کی ہلکے مارے نظریں جھکائے خاموش بیٹھے تھے کیونکہ دونوں نے اس عورت کو خوار کیا تھا، دونوں نے اس کا مان نہیں رکھا تھا، دونوں میں سے اگر ایک ہی اس کی عزت، آنا کا پردہ رکھ جاتا تو آج وہ زخم زخم چلا نہ رہی ہوتی۔ شرجیل اور عرفان ماضی کی اس طرانی اینگل لو اسٹوری کے ان کرداروں کو دیکھ رہے تھے جنہوں نے صرف محبتوں کے دعوے کیے، محبت کی روح کو نہ جانا نہ پہچانا۔

”چلیں ابو.....!“ عرفان گہرا سانس لے کر کھڑے ہوئے اور حسن کا ہاتھ پکڑ کر ان کو کھڑا کیا۔ آمنہ کی حالت اچھی نہیں تھی، حسن نے ایک بھری نظر آمنہ پر ڈالی۔ وہ اپنی آنکھوں میں اترتی دھند کو لیے آگے بڑھے۔ واصف اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے مگر شرجیل ندامت سے گڑھ گیا کہ ان بڑے لوگوں کا ظرف اتنا چھوٹا کیوں ہے۔

”سوری.....! سوری عرفان بھائی.....! میں غلط نہیں کا شکار تھا کہ شاید اب کچھ نہیں ہو گا مگر.....!“ اس ساری صورت حال کا سبب شرجیل خود کو سمجھ رہا تھا لیکن اسے نہامت عرفان سے ہو رہی تھی۔ اس نے عرفان کے ہاتھ پکڑ لیے تو عرفان اس کی حالت سمجھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

”تم معذرت کر رہے ہو شرجیل.....! ہم نے تو اپنی سی کوشش کی نفروں کی جنگ ختم کرنے کی، سچے اور نئے رشتوں کو استوار کرنے کی مگر اب ہمارے بڑوں کو ہی یہ بات گوارہ نہیں تو کیا کہہ سکتے ہیں.....؟ چلیں ابو.....!“

عرفان نے دکھ سے گہرا سانس لیا اور حسن سے کہا وہ ان کے ساتھ چل پڑے۔ آمنہ نے نفرت اور حقارت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ حسن پھر پلٹے اور چلتے ہوئے آمنہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

”میں..... میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ میں غلط تھا، میں نے غلط کیا، کم ظرفی کا ثبوت دیا اور اب تو میں اپنی نظروں میں بھی گر گیا ہوں۔ جب سے مجھے پتہ چلا کہ واصف نے میرا حوالہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے عذاب بنا دیا ہے خدا کی قسم.....! میں اس سب کا ازالہ تو نہیں کر سکتا مگر معافی ضرور مانگتا ہوں، میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتا ہوں، خدا کے لیے آمنہ.....! مجھے معاف کر دو، میری کم ظرفی، لالچ کی وجہ سے تم نے اتنی اذیت ناک زندگی گزاری ہے، میں تمہارے بچوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں، ہو سکے تو مجھے برائے خدا معاف کر دینا۔“

حسن کو دل سے اس ساری صورت حال کا دکھ تھا اور احساس تھا کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑے آمنہ سے معافی مانگ رہے تھے۔ آمنہ نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں۔ حسن کتنی دیر کھڑے رہے مگر آمنہ روتی رہیں، گزرا ہوا ایک ایک لمحہ آنسو بنتا رہا۔

”چلیں ابو.....! میری اور شرجیل کی خیر سلگالی کی کوشش ہار گئی، ہمارے بڑے دشمنی کی روایت کو ختم نہیں کرنا چاہتے تو ہم کیا کر سکتے ہیں.....؟ ہم لوگوں نے اپنی سی کوشش تو کی دشمنی عداوت کو مٹا کر دوستی اور محبت کی تحریر لکھی جائے مگر.....“ عرفان کا لہجہ شکستہ سا تھا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں عرفان بھائی.....! میں نے ہی.....“

”نہیں بیٹا.....! تمہارا کوئی قصور نہیں، تم لوگوں نے تو ہم لوگوں کے بوئے ہوئے کانٹے بھی صاف کرنے کی کوشش کی ہے، اب کیا کیا جائے کہ ہم لوگ اتنی زندگی گزار کر بھی سچائی اور حقیقت کو پہچان نہیں سکے.....؟ ہم ہی غلط تھے، ہم ہی غلط ہیں لیکن خدا کے لیے تم لوگ حق سچ کے راستے پر چلتے رہنا۔ آؤ عرفان بیٹا.....! چلتے ہیں۔“

پھر حسن چلے گئے۔ شرجیل اپنے کمرے میں آ کر جانے کیوں شدت سے رو دیا۔ ان آنسوؤں میں کہیں ہادیہ جھانک رہی تھی یا بزرگوں کے رویے کی دشمنی تھی، وہ فیصلہ نہ کر پایا۔ دوسرے دن واصف نے اسے بلایا۔

”بیٹا.....! ہمیں ابھی حسن صاحب کے ہاں جانا ہے۔“

”جی.....؟“ شرجیل نے حیرت اور بے یقینی سے واصف کو دیکھا جو اس تمام عرصے میں چپ بیٹھے رہے تھے۔ جانے کیا سوچ رہے تھے، کیا فیصلہ کر رہے تھے۔

”واصف.....! آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

آمنہ کو واصف کی بات پر دکھ ہو رہا تھا۔ وہ مڑے اور آمنہ کو بغور دیکھنے لگے۔

”سارے مسائل اسی انجام پن کی گود سے تو جنم لیتے ہیں آمنہ.....! آج سے پہلے جو کچھ کہا وہ انجام نے میں کہا، اب جو کرنے جا رہا ہوں جان کر کر رہا ہوں۔ ماضی میں ہم نے کم ظرفی کی جو ایک روایت قائم کی ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ قائم رہے.....؟ میں اس روایت کو توڑنے جا رہا ہوں، تیار ہو جاؤ، ہم حسن صاحب کے ہاں جائیں گے۔“ واصف نے بڑے مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔





”اس لیے واصف.....! میں بھی انسان ہوں اور میرے اندر بھی ایک کم ظرف عورت موجود ہے جو کم از کم حسن چہرے غیبت انسان کو معاف کرنے کا ظرف نہیں رکھتی، سوری.....!“

چپ چاپ، گم سم کھڑا شرجیل دکھ سے اک گہرا سانس لے کر پلٹا۔ واصف نے بچا رگی سے پہلے آمنہ کو دیکھا۔ ان کا اپنا ماضی کون سا ایسا بے داغ تھا کہ وہ آمنہ کو کسی بات پر آمادہ کرتے یا اپنا یہ حکم مان لینے کا پابند کرتے۔ انہوں نے شرجیل کو دیکھا تو دل میں درد اتر آیا، ان کے اس سعادتمند بیٹے نے ان کے ظلم کے سارے موسم برداشت کیے تھے اور اب جبکہ وہ اسے زندگی کی ہر خوشی دینا چاہتے تھے اور خود اس کی ماں جو ہر سرد گرم خود پر جھیل کر ان کو بچاتی رہی، آج زندگی کی اولین خوشی اس سے چھین رہی تھیں، کتنا مظلوم تھا ان کا یہ بیٹا، کبھی باپ نے ستم ڈھائے تو کبھی ماں خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

”شرجیل بیٹا.....! پھر تم کیا کہتے ہو.....؟ عرفان کے گھر چلیں یا نہیں.....؟“

واصف نے کچھ ایسی نظروں سے بیٹے کو دیکھا جن میں عداوت بھی تھی اور محبت بھی۔ شرجیل نے ماما کو ایک نظر دیکھا جو بظاہر اپنے آنسو روک رہی تھیں مگر پھر بھی بے شمار بند توڑ کر پھیل چکے تھے۔

”چلیں گے بیٹا.....! ہم اس دشمنی، عداوت، کم ظرفی کی روایت کو ختم کرنے ضرور جائیں گے۔“ اس کی بات پر آمنہ نے دھکی سی نظر بیٹے پر ڈالی تب ان کی بات کو سمجھتے ہوئے شرجیل نے اپنا اُدھورا جملہ ماں کے ہاتھ تھام کر ایک ہاتھ سے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے مکمل کیا۔

”لیکن بیٹا.....! پرانی دشمنی، عداوت کے اختتام پر ہم کسی نئے رشتے کا پودا نہیں لگائیں گے، کسی نئے تعلق کی آبیاری نہیں کریں گے۔“

شرجیل کی اس بات کا مطلب سمجھتے ہوئے واصف اس کی طرف مڑے اور وہ جانتے تھے کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔

”مگر..... مگر کیوں بیٹا.....!“

”جسٹ فارما.....! بس بیٹا.....! میں چاہتا ہوں کہ ماما کی زندگی میں کوئی ایک مرد تو ایسا ہونا چاہیے جس پر یہ اعتماد کر سکیں کہ اس مرد نے ان کی عزت، محبت کا بھرم رکھا ہے، جس پر یہ اندھا اعتماد کر کے کوئی بھی فیصلہ کر سکیں۔ میں ایسا مرد بننا چاہتا ہوں ماما کے سامنے جس کے سامنے وہ نہ تو جوابدہ ہوں نہ نادم ہوں۔ ماما نے زندگی میں دو مردوں سے دھوکہ کھایا ہے۔ میں مرد پر ماما کا اعتماد بحال کرنے کے لیے سب کچھ قربان کر سکتا ہوں، میری ماں مرد سے بدگمان ہو.....؟ یہ میں نہیں چاہتا۔ ہو سکتا ہے زندگی کے کسی موڑ پہ مجھے ہادیہ سے بڑھ کر کوئی مل جائے مگر شاید ماں کبھی نڈل سکے اس لیے میں آپ کے ساتھ ہوں صرف حسن انکل سے دشمنی ختم کرنے کی حد تک اور ماما کے ساتھ ہوں کسی بھی نئے تعلق کے قائم نہ کرنے پر۔ چلے میں تیار ہوں۔“

شرجیل کے مضبوط گہرے لہجے میں ڈھلے الفاظ نہیں جگنو تھے جو آمنہ کو اپنے اطراف رقص کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے شرجیل کا چہرہ تھام لیا۔

”یا اللہ.....! میں نے اتنا حسین خواب دیکھا تھا نہ دعا مانگی تھی جس کی تعبیر ہو تم.....! تم نے واقعی مردوں کی ذات پر سے اٹھا ہوا میرا اعتماد بحال کر دیا ہے۔ جاؤ میرے بیٹے.....! سدا خوش رہو لیکن.....“

واصف اپنی بات کہہ کر واش روم کی جانب بڑھے مگر پھر پلٹے۔ شرجیل بھی اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور آمنہ بھی چہرے پر سختیاں لیے جوں کی توں کھڑی تھیں۔

”آمنہ.....! میں نے کچھ کہا ہے۔“

”میں نے سن لیا ہے۔“ آمنہ کے چہرے کی سختی ان کے لہجے میں اتر آئی تھی۔

”اس کے باوجود تم وہیں کھڑی ہو.....؟ آج تک تو ایسا ہوا نہیں کہ میں نے کچھ کہا اور تم نے ٹالا ہو.....؟“

”ہیشہ تم نے میرا حکم مانا ہے۔“

واصف کو تکلیف دہ حیرت نے آن گھیرا تھا، ان کو ایک دم غم تھا کہ اب بھی آمنہ ان کے حکم پر مجبور آسما تھا ہو

لیں گی مگر ان کی سماعتوں سے ٹکرانے والا آمنہ کا چھوٹا سا جملہ حیرت حیران کن تھا۔

”شاید آج میں تعمیل کی اس روایت کو قائم نہ کر سکوں واصف.....!“

”آ..... آمنہ.....! یہ تم ہو آمنہ.....! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“ واصف کو سخت دکھ اور حیرت ہو رہی تھی۔

آمنہ کے چہرے پر ماضی کا سارا دکھ اذیت بن کر ان کی آنکھوں میں اتر آیا۔

”کیوں.....؟ کیوں واصف.....! آپ کو یقین نہیں آ رہا.....؟ میں بھی انسان ہوں، چل کر راہ ہو چکی

ہوں اور راہ میں سے کچھ نہیں ملتا اس لیے واصف.....! پلیز اب آپ اس راہ میں اُلگیاں نہ پھیریں، بھرم رہ

جائے گا آپ کا بھی اور میرا بھی۔“

آمنہ بری طرح سسک پڑیں۔ آج سارے زخم پھر سے ادھڑ گئے تھے۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے معاف نہیں کیا آمنہ.....!“

آمنہ نے بیٹگی پلکوں سے زندگی کے اس ساتھی کو دیکھا جس نے دل بھر کر ان کو اس لغزش کی سزا دی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں آمنہ.....! کہ میری اور حسن کی کم ظرفی کی وجہ سے تم نے، سب سے بڑھ کر

ہمارے بچوں نے بہت سہا ہے، بڑی تکلیف دہ زندگی گزاری ہے، جب تم خود اس بات کو مانتی ہو کہ درگزر سے

کام لیا جاتا تو یہ سب نہ ہوتا پھر اب.....! اب تم کیوں درگزر سے کام نہیں لے رہیں.....؟“



آمنہ بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔ اس نے ماں کی پیشانی چوم لی۔  
”آپ بے فکر ہو جائیں ایسا کچھ نہیں ہوگا جو آپ کو پسند نہیں۔“

● ● ●

حسن اور واصف آمنے سامنے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دونوں کی درمیان ایک عورت کی محبت تھی جس نے  
نہ حسن کو دھوکہ دیا نہ واصف کو مگر اسے ان دونوں نے محبت کرنے کی ایسی سزا دی کہ اس کا مرد اور محبت پر سے اعتماد  
ہی اٹھ گیا تھا۔ کافی دیر بیٹھ کر واصف جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

”نہ کچھ کہانہ کچھ سنا نکل.....! اور آپ جانے کے لئے کھڑے ہو گئے.....؟“

عرفان کی بات پر شرجیل نے بھی ہم خیال نظروں سے عرفان پھر حسن اور واصف کو دیکھا۔

”کبھی کبھی خاموشی اتنی پاورفل ہوتی ہے بیٹا.....! کہ الفاظ کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ میں اور حسن

کہانی کے دوا ہم کردار ہیں جن کے رویوں نے جانے کیا کیا طوفان کھڑے کیے.....؟ کون کون اس کی زد میں  
آیا.....؟ یہ سب کچھ ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔ پھر اب اس موقع پر عداوت اور دشمنی کی راکھ پر بیٹھ کر ہم کھلے دل  
سے محبتوں کا ایک نیا سفر شروع کرنا چاہتے تھے، تعلق کی ایک نئی عمارت کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے مگر آج ہم دونوں کو  
اس عورت کا مان رکھنا ہے جس کو ماضی میں ہم دونوں نے چاہنے کا تو دھوکا دیا تھا مگر اسے سمجھا نہیں، اسے عزت نہیں  
دی۔ آج وہ نیا تعلق قائم نہیں کرنا چاہتی تو ہم دونوں اسی کے احترام میں چاہتے ہوئے بھی قدم آگے کی بجائے  
پیچھے کی جانب کر رہے ہیں۔“

واصف کے شفاف لہجے میں اپنی غلطی کا اعتراف بھی تھا اور حسن سے عداوت ختم کرنے کا اظہار بھی۔

”کاش.....! کاش وہ عظیم عورت مجھے بھی معاف کر دیتی تو دل پر بوجھ کم ہو جاتا مگر.....“ حسن کے دل کا

بوجھ بڑھ گیا تھا، واصف کی باتیں سن کر ایک عورت کا مان بڑھ گیا تھا مگر ایک عورت اپنے ٹوٹے خوابوں کی  
کرچیاں سمیٹتے کتنی اہولہان ہو گئی تھی یہ شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے شرجیل نے چپکے سے  
پلٹ کر دیکھا ہادیہ کے کمرے کی کھڑکی کے پردے جو سر کے ہوئے تھے، ایک دم برابر ہوئے اور لائٹ آف ہو کر  
اندھیرے شرجیل کے دل میں اتارے گئے۔ اس نے بمشکل ٹیس کو دبایا۔

● ● ●

دوسری جزیں اب نئی زندگی کی ابتدا کر رہی تھی۔ گھر میں تین تین شادیاں ہو رہی تھیں۔ موبی اور شاکی  
شادی، ثاقب اور مایین کی شادی اور تین اور مایہم کی شادی۔ ہر طرف مصروفیت، افراتفری اور خوشیوں کے رنگ  
نہے ہوئے تھے، ہر کوئی خوش اور مصروف تھا۔ ان میں شرجیل سب سے زیادہ خوش اور مصروف تھا، بہت ہلاکا  
کر رہا تھا، اونچے اونچے قہقہے لگا کر خود کو خوش اور مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ واقعی اتنا ہی خوش

”ماشاء اللہ.....! آمنہ.....! شرجیل کو دیکھا کتنا کونیڈنٹ ہو گیا ہے.....؟ سارے کام خود سنبھال لیے

ہیں کہ یہ سب اس کی ذمہ داریاں ہیں۔ بہت خوش اور مطمئن ہے۔“

”ہاں.....! مجھے بھی کہہ رہا تھا آپ لوگوں نے بہت کام کر لیا، اب مایہم کی شادی کے تمام انتظامات میں

خود کروں گا مگر واصف.....! آپ نے ایک بات محسوس کی اس کی مسکراہٹ کتنی پھمکی اور بے رنگ ہے، اس کے  
قہقہوں کی اوٹ میں انجانی سسکیاں سی سنائی دیتی ہیں، کیا آپ نے یہ سب محسوس کیا ہے.....؟“

”ایسا ہے تو آمنہ.....! یہ سب تمہیں سوچنا اور محسوس کرنا چاہیے، اس کی سسکیوں کی وجہ تلاش کرنی چاہیے،

اس کے قہقہوں کے کھوکھلے پن کی داستان سمجھنی چاہیے اس لیے کہ میں تو جانتا ہوں تم سوچو اور سمجھو.....!“

واصف کے لہجے میں چھپا ہوا آمنہ محسوس کر گئی تھیں اور پھر واقعی انہوں نے سوچنا شروع کیا تو یہ حقیقت  
ان کو دکھی کر گئی کہ ان کے عزیز از جان بیٹے شرجیل نے ان کی خاطر اپنی محبت قربان کر دی تھی، صرف ان کی خاطر  
اپنی خوشیاں نثار کر دی تھیں اور وہ کتنی خود غرض تھیں کہ اپنی نفرت کی بجینٹ چڑھا رہی تھیں اپنے بیٹے کو۔

”ارے ماما.....! آپ کیا سوچ رہی ہیں.....؟“ شرجیل کسی کام سے اندر آیا تو ماں کو سوچوں میں غرق

دیکھ کر ان کے قریب آ گیا تو انہوں نے کچھ دیر بغور اسے دیکھا اور پھر ساتھ لگا لیا۔

”جان بھائی.....! میں سوچ رہی ہوں کہ بہو بھی پسند کر ہی لوں۔“

”کم آن ماما.....! ابھی سکون سے ماہم کی شادی ہو جانے دیں پھر دیکھی جائے گی۔“

”نہیں بیٹا.....! تم بڑے ہو پہلے تمہاری ہوگی، پھر ماہم کی۔“

”ماما.....! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے.....؟ برسوں ماہم کی مہندی ہے اور اتنی جلدی آپ کو بہو کہاں سے ملے

گی.....؟ مہندی کی رسم ہونے دیں، ڈھیر ساری لڑکیاں ہوں گی، کوئی بھی پسند کر لیجے گا میں سر جھکا دوں گا۔“

”ہوں.....! آئیڈیا تو اچھا ہے۔“

آمنہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو شرجیل کے اندر اک اُداس سی شام اتر آئی اور پھر ان دونوں میں نہ

جانے کیا ہوا، کیا تبدیلی آئی کہ مہندی والے روز حسن صاحب عرفان اور ہادیہ کو دیکھ کر شرجیل ششدرہ گیا۔ ان

لوگوں سے تعلق کا ہر تار اسی روز توڑ دیا گیا تھا پھر یہ لوگ کیسے آئے۔

”عرفان بھائی.....! آپ.....؟“

شرجیل تو ان لوگوں کو دیکھ کر بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوش ہو یا ان کو واپس

جانے کو کہے۔ اس پر آمنہ ایک دم آگئیں تو وہ گھبرا کر ان کو دیکھنے لگا۔

”ڈونٹ وری بیٹا.....! ان لوگوں کو میں نے انوائٹ کیا ہے، یہ میرے خاص مہمان ہیں، ان کا بہت

خیال رکھنا۔“

وہ اسے حیرت میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں تو ہادیہ نے پلٹ کر ایک نظر اسے دیکھا جس میں غصہ بھی تھا اور

ناراضگی بھی۔ دراصل آمنہ کو خود اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ واصف کے ساتھ جا کر حسن اور عرفان سے

معذرت کر کے دعوت دے کر آگئی تھیں مگر یہ سب شرجیل کے لیے حیران کن تھا۔ باہر مہندی کی تقریب ہو رہی

تھی، خوب رنگین تقریب تھی، رنگ و بو کا سیلاب تھا، شرجیل حیران پریشان سا تھا، تقریب کے اختتام پر آمنہ

شرجیل کے پاس آگئیں۔

”تم نے کہا تھا ناں بیٹا.....! کہ مہندی کی تقریب میں جوڑی مجھے پسند آئے اسی کو بہو بنالوں.....؟“

”جی.....! وہ تو کچھ بھی نہیں سمجھ پارہا تھا۔“



”تو بیٹا.....! مجھے یہ لڑکی پسند آئی ہے۔ اُمید ہے تمہیں بھی پسند آئے گی.....؟“ آمنہ نے اپنے پیچھے کھڑی ہادیہ کو سامنے کر دیا تو شرجیل کو جیسے چکر سا آگیا۔

”مم..... مم..... مم.....! یہ آپ.....“ وہ ہٹکا کر رہ گیا۔

”دُشمنی، عداوت کی فصل کو کاٹ دینا چاہیے ورنہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔“ آمنہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔

تب ہادیہ نے جھپکتے ہوئے بتایا کہ آمنہ گئی تھیں اور یوں سب کچھ ختم ہو گیا اور نئے رشتے وجود میں آ گئے۔

”اوہ.....! یا اللہ.....! تیرا شکر ہے، تو نے میری دُعائیں سن لیں اور یہ لڑکی میری بیادی۔“ شرجیل شوخی سے اسے دیکھ کر بولا تو ہادیہ شرمائی گئی۔

● ● ●

خود سری، ہٹ دھرمی کے جنون میں انسان کو سوائے اپنے کسی کی پرواہ نہیں ہوتی، کوئی اس کے رویے سے کتنا ہٹ ہو رہا ہے، کوئی حرکت کی کامت بھرا، مان بھرا دل کیسے توڑ دیتی ہے، یہ خود سری کے نشے میں معلوم ہی کب ہوتا ہے لیکن ذرا سی ٹھوکر سے جب نشہ ہرن ہوتا ہے، آئینہ صاف ہوتا ہے تو منظر صاف نظر آنے لگتا ہے تو اپنا ہی چہرہ گرد آلود نظر آتا ہے، اپنی ہی آنکھوں میں انسان خود کو تلاش کرتا رہ جاتا ہے۔ یوں تو زندگی میں اتنا بڑا حادثہ ہو کر گزر گیا تھا مگر رات جب سے ارمغان کا جملہ گونجا تھا کہ وہ اب علیزہ سے شادی نہیں کرے گا، ساری رات وہ جاگتی رہی، اس جملے کی بازگشت نے ایک پل کے لیے بھی پلکوں کو آپس میں ملنے نہیں دیا تھا۔ یہ خود سری کی کیسی داستان تھی کہ وہ بے قصور ہو کر بھی سزاوار قرار پاتی تھی، کبھی جو شخص ایک ناگوار احساس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا آج اتنا اہم ہو گیا تھا کہ اب تک کوئی ایک پل بھی نہیں گزرا تھا جو اس کے خیال سے خالی گزرا ہو۔ اس کی عقلی، ناراضگی کا خیال اتنا اہم کیوں ہو گیا تھا، کیوں دل اسے مٹانا چاہتا تھا، کیوں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا، آخر کیوں۔

”صرف اس لیے کہ تم بھی اسے چاہتی تھیں، وہ اچھا لگتا ہے، اس کی باتیں اچھی لگتی ہیں، اس کا دیکھنا، شوق باتیں کرنا، چھیڑ چھاڑ کرنا سب کچھ اچھا لگتا ہے، صرف اس لیے کہ تم اسے چاہتی ہو، محبت کرتی ہو ارمغان سے ورنہ وہ بدل جائے، بات نہ کرے، تمہیں اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔ کیسے پرواہ نہ کروں، میرا دل چاہتا ہے میں اس کی نظر میں رہوں، اس کی مہکتی باتوں میں رہوں، اس کی شوخیوں میں سمجوں تو..... تو مجھیں بدل گیا ہے وہ، کیوں بدگمان ہو گیا ہے وہ، اعتراف کرتی ہوں کہ محبت ہے مجھے ارمغان سے اور اسی بات کا وہ بھی دعویٰ کرتا رہا اور اب کیا محبت میں اتنی بھی گنجائش نہیں ہوتی کہ محبت کی لغزش کو درگزر کر سکے.....؟ اُف میرے خدایا.....! تو نے مجھے اس احساس سے بے نیاز رکھا ہوتا کہ میں بھی اس کم ظرف کو چاہتی ہوں یا ارمغان کو اتنا ظرف عطا کر دیتا کہ وہ..... وہ جواد کے سوال کے جواب میں ہاں کہہ دیتا۔ ذلت کا یہ طوفان مجھے جاہ کر دے گا، میں کیسے اس کی نظروں کا مقابلہ کروں گی.....؟“

اس اعتراف اور انحراف کی جنگ میں وہ لڑتے لڑتے غل حلال ہو گئی تھی، وہ ساری رات جاگتی رہی تھی، شدید تشنہ میں بھی بیقراری سے نہلتی رہی۔ ارمغان کا ٹھکر دینا اتنا اہم کیوں ہو گیا تھا، یہ کھوجتے کھوجتے جس راز کو سمجھ پائی تھی وہ یہ تھا کہ وہ بھی اسے چاہتی تھی اور اعتراف کا یہ احساس خوشی کی بجائے اسے دکھ اور پچھتاوا دے

گیا تھا، یہ کب اور کیسے ہو گیا تھا، اس نے تو بچپن ہی سے اپنی ذات کے اطراف میں خود سری کی فصیلیں کھڑی کر رکھی تھیں پھر یہ جذبہ کیسے اس تک پہنچ گیا، یہ اس کی کمزوری تھی یا ارمغان کی محبت کی گہرائی تھی جو خوشبو کی طرح روشنی کی کرن بن کر اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی صبح تک، اندر کی اس توڑ پھوڑ نے اسے دہنی اور جسمانی طور پر اتنا توڑ دیا تھا کہ وہ بخار میں پھینک رہی تھی۔

”آپنی.....!“ جواد سمجھ رہا تھا کہ وہ کس جذباتی مرحلے سے گزر رہی ہے۔

”مجھے ماما کے پاس لے چلو جواد.....! میری ماما کے پاس لے چلو مجھے ورنہ..... ورنہ میں مرجاؤں گی، پلیز.....!“

وہ کہاں تک اپنی خودداری کا بھرم رکھتی، ریت کی طرح بہہ گئی تو جواد نے اسے کراچی لے جانا ہی مناسب سمجھا۔ ارمغان نے جواد کے کہے بغیر ان دونوں کے جانے کے انتظامات کر دیئے تھے۔ جواد، ارمغان سے خائف سا تھا اور علیزہ تو اس کے سامنے ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ جب بھی اس کے سامنے جاتا علیزہ چہرہ دوسری طرف کر لیتی تو اک جان لیوا سی ٹیس ارمغان کو بے حال کر جاتی کہ وہ بمشکل خود پر کنٹرول کر پاتا۔ اس نے کب سوچا تھا کہ چاہت کے اس سفر میں ایسا موڑ بھی آئے گا کہ علیزہ سے اسے یوں دستبردار ہونا پڑے گا، خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلاب بانا پڑے گا۔ جواد بچاؤ سے بدگمان تھا، اسے کیسے بتاتا کہ وہ کس قیامت کا سامنا کر رہا ہے۔ انٹرپورٹ پر چھوڑنے گیا تو جواد اس کے گلے لگ گیا۔ ارمغان کی نظریں علیزہ پر اٹھیں، کچھ تو ٹھنڈ اور کچھ شدت ضبط سے چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، کیا شکایت کرتا اس سے کہ اس کے چہرے پر اس کی رقم کی ہوئی داستان تھی۔ کتنا چاہتا تھا اس لڑکی کو اس نے، اس کی ایک نظر کی طلب میں وہ کتنا اس کی نظروں میں رہا تھا اور اب خود ہی اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اسی وقت علیزہ کی نگاہیں اٹھیں، ارمغان سے نظریں ملیں تو ایک قیامت برپا کرتی گزر گئی۔ ہزار ضبط کے باوجود کئی آنسو زخموں پر پھیل گئے۔ ارمغان سے درد سنبھالنا نہ گیا تو وہ جلدی سے قدرے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

”چلیں پھر مانی بھیا.....!“ جہاز کی روانگی کے اعلان کے بعد جواد اس کی طرف بڑھا تو ارمغان نے اسے گلے لگا لیا، نظریں پھر اس لڑکی پر ٹھہر گئیں جو چاہت تھی، محبت تھی، طلب تھی، دُعائی اور آج فقط ایک درد تھی، کسک تھی، آنسو تھی۔

”تمہاری یہ خاموشی مجھے بہت تڑپا رہی ہے جواد.....! مگر کیا کروں محبت میرے لیے اعزاز ہے، ترس یا رحم نہیں، بھیک نہیں۔ میں محبت کو اعزاز کی طرح سینے پر سجانا چاہتا تھا، محبت کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا اس لیے اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

ارمغان جواد کو یہ سب کہہ رہا تھا یا علیزہ کو سن رہا تھا جس کے نازک ہاتھوں کی آپس میں ابھی انگلیاں اس کے اندر ہوتی شکست و ریخت کی غماز تھیں۔

”ہم لوگ ساتھ آئے تھے مانی بھیا.....! آپ بھی ساتھ چلتے تو اچھا تھا۔“ جواد پھر واپس پلٹا تو اک سایہ سا ارمغان کے چہرے پر آگیا۔

”خدا حافظ جواد.....!“ اور پھر ارمغان مڑے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ انٹرپورٹ کی



”تمہیں کچھ اندازہ ہے ارمغان.....! کہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟ یعنی کہ میں تمہارے بچپن سے جو خواب دیکھ رہی ہوں تم نے اتنی آسانی سے اسے توڑ دیا.....؟“

جواد اور علیزہ کے آجانے کے بعد ارمغان چند گھنٹے بھی وہاں نہیں گزرا سکا اور رات کی فلائیٹ سے آگیا تو آتے ہی عفت بیگم نے اعلان کر دیا کہ چاہے تعلیم مکمل ہو نہ ہو مگر وہ اس کی اور علیزہ کی شادی کریں گی۔ تب ارمغان نے سنجیدگی سے انکار کر کے ان کو بھڑکا دیا تھا۔

”سوری ماما.....!“ اپنے اندر اترتی سر دیاہ شام کا سوگ لیے وہ بہت آہستگی سے بولا تو وہ اس کے قریب آ کر بغور دیکھنے لگیں۔

”کیا مطلب ہے اس سوری کا.....؟ ختم کرو یہ مذاق، میں جانتی ہوں تم مذاق بھی اتنے سنجیدہ ہو کر کرتے ہو۔“

”نہیں ماما.....! میں مذاق نہیں کر رہا، کبھی کبھی ہم خود مذاق بن جاتے ہیں اور یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے میں کہ خود مذاق بن گیا ہوں۔“

اس کے لہجے میں اتری شام کیا کہہ رہی ہے، عفت یا تو سمجھ نہیں رہی تھیں یا سمجھ کر یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ خود بھی فیصلہ نہیں کر پائیں۔

”ارمغان.....! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے وردہ کتنی پسند تھی اور میں اسے ہی تمہاری ڈلہن بنانا چاہتی تھی مگر تمہیں علیزہ پسند تھی میں نے وہ بات بھی مان لی۔ اب علیزہ سے بھی مکر رہے ہو.....؟ یہ تم مرد بھی لڑکیاں ٹائیوں کی طرح بدلتے ہو مگر کان کھول کر سن لو میں علیزہ کے علاوہ کسی اور لڑکی کو تمہارے لیے دیکھوں گی بھی نہیں شادی کرنا تو دور کی بات ہے۔“

عفت نے حتی انداز میں اپنا فیصلہ سنایا تو ارمغان کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ سا گیا مگر وہ اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈولتے حوصلے کو سہارا دیا۔

”ماما.....! یہ آپ خواتین بھی ناں بس پتھر پر لکیر کی طرح ایک ہی جگہ ٹھہر جاتی ہیں اور پھر آپ خود انصاف کیجئے یہ کائنات کتنی حسین ہے، کتنے دلکش رنگ بکھرے ہیں۔“

”بکومت.....! اور گاڑی نکالو مجھے ابھی شہلا سے ملنا ہے۔“

”اس..... اس وقت ماما.....! کچھ خوف خدا کریں، آٹھ بج رہے ہیں، آدمی رات ہو رہی ہے اور آپ.....“ وہ اندر سے دہل گیا۔ وہ شہلا کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”یہ..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ارمغان.....! کچھلی بار جب تم آئے تھے تو ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی اور شہلا کے ہاں تو تم سر کے بل ہر وقت جانے کو تیار تھے.....؟ اب کیا ہو گیا ہے.....؟“

ماں نے غور سے کھوجتی نظر ڈالی تو وہ ڈر گیا۔ وہ ان کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”کچھ نہیں ماما.....! مذاق کر رہا تھا۔ چلیں اس سے پہلے کہ آپ کوئی نئی داستان گھڑیں۔“

وہ کرب کی دھند سے باہر نکلتا ہوا بولا تو عفت اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”شہلا.....! تم نے کچھ محسوس کیا اس بار ان سب کے تھوڑے کچھ عجیب سے نہیں لگ رہے.....؟ یوں جیسے کچھ چھپا رہے ہوں.....؟“

بچپن ہی عفت نے جواد اور ارمغان کو دیکھا جن کے چہروں پر وہ رنگ اور روشنی تھی ہی نہیں جو ماحول کو بہت خوبصورت اور رنگین بنا دیا کرتی تھی۔ شہلا نے ایک نظر ان کو دیکھا پھر جواد اور ارمغان کو جو بہت سنجیدہ تھے، ارمغان نے اشارے سے شہلا کو سمجھا دیا کہ عفت کو کچھ معلوم نہیں۔ لہذا ان کے سامنے کچھ نہ کہا جائے۔ شہلا نے اک گہرا سانس لیا اور رخ موڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

”آپ کا وہم ہے بھابھی.....! اور نہ میں نے تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔“

”اچھا.....! ہو سکتا ہے، ارے آؤ علیزہ بیٹا.....! کیسی ہو.....؟ اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے.....؟ مرجھائی ہوئی لگ رہی ہو.....؟“

بات کرتے کرتے عفت کی نظر علیزہ پر پڑی جو ارمغان کو دیکھ کر پہلے تو کترا کر گزر جانا چاہتی تھی پھر عفت کے خیال سے اندر آ گئی۔ علیزہ کے ناز و انداز ہی کہیں کھو گئے تھے، اک ویران آداس کر دینے والی خاموشی نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، وہ خود سری تھی جس کی وجہ سے وہ سب میں منفرد تھی، نہ اکھڑ پن کے وہ انداز جو ارمغان کو اس سے زیادہ عزیز تھے۔

”جی.....! جی ماما.....! میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں.....؟“

علیزہ کے لہجے کی شوخی آداس ویرانی میں ڈھل کر بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وردہ اور شہلا نے ایک ساتھ ارمغان کو دیکھا جس کے دل میں طوفان موجزن تھے مگر چہرے پر لا تعلقی کا بورڈ لگا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو علیزہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جانے کیا کیا بہانے بنایا کرتا تھا، اسے چھیڑنے کے لیے، بات کرنے کے لیے وہ کیا کیا حرکتیں کیا کرتا تھا اور اب علیزہ سامنے بیٹھی تھی اور اس نے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی، بے مقصد ہی اخبار کو دیکھ رہا تھا، اس کا یہ انداز سب کو تو ڈکھی کر گیا تھا مگر علیزہ جسے کبھی اس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی تھی، آج اس کی یہ لا پرواہی، بے نیازی برداشت نہ کر پار رہی تھی۔

علیزہ نے چھری نظر ارمغان پر ڈالی۔ وہ اس کے وجود کو انور کیے اخبار میں گم تھا۔ علیزہ سے مزید یہ بے شوخی برداشت نہیں ہوئی، وہ اٹھ کر چلی گئی، ارمغان بھی باہر آ گیا، وردہ اور شہلا کو جواد نے ارمغان کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا اور دونوں کو اس بات کا شدید دکھ بھی تھا۔

وردہ کو شدید دکھ پہنچا تھا کہ یہ مرد عورت سے جان دینے کی حد تک محبت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اک ذرا سی بھول کی اتنی سزا دیتے ہیں کہ عورت اپنی ہی نظر میں گر جاتی ہے۔

”ایسی بھی کیا جلدی پڑ گئی بھابھی جان.....! آپ لیزہ اور ارمغان کی شادی کی.....؟“ شہلا عفت بیگم سے نظریں چرا کر بولیں تو وہ ان کے مقابل آن کھڑی ہوئیں۔

”اور تم اب ان کی شادی میں دیر کیوں کرنا چاہتی ہو.....؟ بھی.....! تقریباً دونوں کی تعلیم بھی مکمل ہونے والی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اب گھر میں رونق ہو، خوشی ہو۔ تمہارے بھائی اب چھوٹی بہو کو گھر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔“ شہلا کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی، ان کو ارمغان پر بہت اعتماد تھا مگر اس کم ظرفی کے بعد ان کا دل



ارمغان کی طرف سے ٹوٹ گیا تھا۔ انہوں نے ارمغان کو دیکھ کر گہرا سانس لیا۔

”اگر بھابھی جان.....! ارمغان علیزہ کو اتنا ہی چاہتا ہے تو شادی کی بات بھی آپ ارمغان کے ساتھ طے کر لیں، وہ اب علیزہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو جیسا وہ پروگرام بنائے ہمیں منظور ہوگا، کیوں مانی بیٹا.....! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں.....؟“

شہلا چلتے چلتے ارمغان کے قریب آگئیں تو اتنی پیاری پھپھو کی بدگمانی ارمغان کو اپنے دل میں اترتا ہوا خنجر محسوس ہوئی۔

”پھپھو.....! آپ..... آپ کیا سمجھ رہی ہیں کہ.....“ اس کی آواز ڈب گئی۔

”ہونہہ.....! میں تو صرف یہ سمجھی ہوں بیٹا.....! کہ مرد کی محبت دودھ کا اُبال ہوتی ہے اور اُبال بیٹھ جانے کے بعد کچھ نہیں۔“

”یہ..... یہ تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے.....؟“ عفت پریشان ہو گئیں ان دونوں کی معنی خیز باتوں سے۔

”بھابھی جان.....! یہ بات بھی آپ ارمغان ہی سے پوچھ لیجئے.....! ہو سکتا ہے مجھ پر جانبداری کا الزام آجائے۔“

یہ بوجھ بھی شہلا ارمغان پر ڈال کر آگے بڑھ گئیں تو وہ سر ہٹا کر رہ گیا۔

”مانی.....! کیا بات ہے.....؟ تمہاری پھپھو ناراض ہیں کیا.....؟“

”مما.....! وہ ناراض نہیں ہیں بس ذرا بدگمان ہیں، میں ان کو منالوں گا آپ خائف نہ ہوں۔ آپ یہیں

رکیں گی کہ چلیں گی.....؟ اگر آپ کو روکنا ہے تو بہتر ورنہ میں تو جا رہا ہوں۔“

ارمغان کے اپنے اندر توڑ پھوڑ ہو رہی تھی، وہ فرار چاہتا تھا، اس اذیت ناک صورتحال سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

”تم جانا چاہتے ہو مانی.....! یہ وہ گھر ہے جہاں آئے اور ٹھہرنے کے تم بہانے بناتے تھے، آج کیا بات ہے.....؟“

عفت بہت سنجیدہ ہو کر دیکھنے لگیں تو ارمغان خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں بات کھل نہ جائے۔

”بس ممما.....! وہ..... آپ تو جانتی ہیں کہ علیزہ مجھے پسند نہیں کرتی، وہاں رہتے ہوئے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو جان سمجھ بھی لیا ہے اور میں سمجھ گیا ہوں کہ میری اور علیزہ کی انڈر اسٹینڈنگ کبھی نہیں ہو سکتی، بس اس لیے.....“

وہ ماں کو جھانسا دینے کے لیے فرار کے راستے پر دوڑا مگر عفت نے پکڑ لیا۔

”یکومت.....! تمہاری ذہن تو اب علیزہ ہی بنے گی۔“

”کاش.....!“ اس نے دل میں اُٹھتے درد کو دباتے ہوئے زیر لب کہا اور آگے بڑھ گیا۔

● ● ●

”آفاق اکل کی طبیعت خراب ہو جائے گی غزین.....! پلیز.....! سوچ لو.....!“

”سوچ ہی تو رہا ہوں اس بارے میں کہ ان کو کبھی ہمیشہ کے لیے اس اذیت سے نجات مل جائے اور میری

تلاش جو میری رگوں میں اب زہر بن کر دوڑ رہی ہے، ختم ہو جائے۔“

غزین نے الماری سے کچھ تلاش کرتے ہوئے دانت پیس کر کہا تو اسد اس کے سامنے آن کھڑا ہوا وہ اسے اپنے عرازم سے ایک بار پھر روکنا چاہتا تھا۔

”دیکھو غزین.....! جو لوگ ناک کو سیدھے طریقے سے پکڑنے کی بجائے بازو گھما کر پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں ناں، ایک طرف تو احمق لگتے ہیں، دوسری طرف نقصان اُٹھاتے ہیں اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“

”اچھا.....! اور زندگی نے میرے ساتھ جو کیا اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے.....؟ کبھی کبھی ناک کو بازو گھما کر پکڑنے ہی سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں مانی ڈنیر.....!“ غزین اپنا کام کرتا رہا۔

”ایسا کر کے تم اسے ہمیشہ کے لیے کھو بھی سکتے ہو.....؟“

اسد کی اس بات پر غزین کے چلتے ہوئے ہاتھ کچھ دیر کے لیے رُکے، چہرے پر سایہ سالہرا لیا، وہ گہرا سانس لے کر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

”عشق کی منزل میں موجودیاں کا حساب نہیں رکھا جاتا اسد.....! وہ عزیز تر ہے مگر اسے کھونے کا احساس کسی کو پالینے کے احساس سے زیادہ نہیں۔ ہاں بس، کک بن کر اس دل میں رہے گی ضرور تم ڈیڈ کا خیال رکھنا میں چلتا ہوں۔“

شاید غزین کی مطلوبہ تلاش ختم ہو چکی تھی۔ وہ گہرے لہجے میں مڑے بغیر بولا تو اسد نے جاتے جاتے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف اس کا چہرہ کیا، اس کے چہرے پر عجیب سوچوں کا جال تھا، اندرونی کیفیات کا بیجاں تھا، پائے اور کھونے کا حوصلہ تھا۔ غزین کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ شانے پر سے ہٹا کر آگے بڑھا۔

”خدا حافظ.....!“ پھر غزین رُک کے بغیر آگیا اور اب جیسے جیسے گاڑی وردہ کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی، دھڑکنیں تیز تر ہو رہی تھیں، ہار اور جیت دونوں کے امکانات بہت واضح اور روشن تھے، کتنی عجیب بات تھی، آج وہ اسی لڑکی کو کڈ نیپ کرنے جا رہا تھا جو اس کی عزیز ترین ہستی تھی، جسے وہ چاہتا تھا اور جو حرکت وہ کرنے جا رہا تھا اس کے بعد وہ اسے سو فیصدی کھونے کا یقین رکھتا تھا، پھر بھی رفتار تیز ہوتی گئی دھڑکنوں کی طرح، جب گاڑی کے بریک گیٹ پر آکر بچہ چرائے تو شام گہری ہو چکی تھی۔

گھنے پاؤں کی وجہ سے رات ہی لگ رہی تھی۔ وہ اسٹیرنگ پر بازو رکھے کتنی ہی دیر گہرے گہرے سانس لے کر ہونے والی ممکنہ کارروائی کے لیے خود کو تیار کرتا رہا۔ اک عجیب سی کیفیت تھی، خنکی میں بھی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر جائزہ لیا، چونکدار عالم مغرب کی نماز ادا کرنے گیا ہوا تھا، پورچ میں دونوں گاڑیوں کی عدم موجودگی اپنی کارروائی کی پہلی کامیابی محسوس ہوئی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے وردہ کے موبائل کا نمبر ملا کر چیک کیا وہ گھر پر ہے کہ نہیں۔ وردہ جو اس وقت کچھ اُداس سی تھی اور ٹھنڈ بھی محسوس ہو رہی تھی تو اپنے بیڈ پر لحاف اوڑھے لیٹی تھی، موبائل پر غزین کا نمبر دیکھ کر یکبارگی تو دل زور سے دھڑکا مگر پھر اس نے موبائل آف کر دیا۔ وہ اپنا اعتبار کھو چکا تھا، غزین نے پھر نمبر ملایا مگر نہیں ملا تو اس نے فون کا نمبر ملایا۔ گھر میں اور تو کوئی تھا نہیں، وردہ اپنے کمرے میں تھی اسی نے ریسیو کیا تو غزین جو اتنے عرصے میں تپ چکا تھا، سلگ اُٹھا۔



”مس وردہ وجاہت.....! انسان کو اتنا بھی خوش فہم نہیں ہونا چاہیے، تم کیا سمجھیں کہ میں غزین آفاق تمہارے عشق میں پاگل ہو کر کوئی قلمی کردار پلے کر رہا ہوں.....؟ تم نے ہمیشہ مجھے غلط سمجھا، غلط جانا۔ محترمہ.....! ذرا خوش فہمی کی دنیا سے باہر آئیے اور سنے کہ میرے پاس آپ کے لیے آپ کی ماما کے متعلق ایک بری خبر ہے۔“

”واٹ.....! ماما کے بارے میں.....؟ کک..... کیا ہوا ہے ماما کو.....؟“

وہ جتنا بھی بے اعتبار سہی مگر اس کی ماما کے بارے میں ایسا کیوں کہنے لگا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی، ساری تھکن، ساری شہد ختم ہو گئی۔ وہ لحاف پر بے پھینک کر کھڑی ہو گئی۔ دل کسی انجانے حادثے کے خیال سے بری طرح دھڑک اٹھا۔

”آپ.....! آپ سچ کہہ رہے ہیں غزین.....! کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہے.....؟“ اس کے حلق سے مارے خوف کے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ غزین چشم تصور سے دیکھ رہا تھا، یوں خوفزدہ ہو کر گھبرائی ہوئی کتنی حسین لگ رہی ہوگی۔ وہ اسی خیال سے دھیرے سے مسکرایا۔

”محترمہ.....! مجھے کسی ڈرامہ کے ذریعے آپ تک نہ رسائی چاہیے اور نہ ہی میں اپنے دل کے ہاتھوں اتنا کمزور اور بے بس ہوں اور وہیں بستر پر لیٹے لیٹے گرم گرم لحاف میں بیٹھ کر اپنی ماما کے لیے مگر مند ہونے سے بہتر ہے آپ کم از کم گیت تک تو آجائیں تاکہ میں آپ کو ساری صورت حال بتا سکوں۔“

اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسے وردہ کو گیت تک لائے کے لیے کسی ایسے ہی افسانے کی ضرورت تھی۔

”میں کیسے آپ کی بات پر یقین کروں کیونکہ میں آپ کو کبھی طرح جانتی ہوں۔ یوں بھی ابھی چند منٹ پہلے تو میری ماما سے بات ہوئی ہے، وہ بالکل خیریت سے ہیں اور.....! اس کی بات کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے اس نے خشک حلق کے ساتھ جھوٹ بولا۔

”تو میں نے کب کہا ہے کہ خدا خواستہ آپ کی ماما کا ایکٹینڈنٹ ہوا ہے.....؟“ غزین اس کے جھوٹ کو سمجھ گیا تھا۔

”تو.....“ وردہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا کسی بھی بری خبر کے لیے۔

”محترمہ.....! اگر ذرا سی دیر کے لیے باہر تشریف لے آئیں گی تو آپ کی شان میں کمی نہیں آئے گی.....؟ میں اندر اس لیے نہیں آ رہا کہ آپ کے گھر والے گھر پر نہیں لہذا آپ باہر آ کر مجھ سے اپنی ماما کی میڈیکل رپورٹ لے جائیں جو ڈاکٹر سلطان نے مجھے دی ہے جس کے مطابق آپ کی ڈیئر ماما کو.....“

یہ کہہ کر وہ بالکل خاموش ہو گیا اور وردہ کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ ماما چیک آپ کے لیے ڈاکٹر سلطان کے پاس گئی تھیں مگر ان کو کوئی ایسی بیماری ہے، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ یوں غزین اپنے اس جال میں اسے پھنسانے میں کامیاب ہو گیا۔

”کک..... کیا ہوا ہے ماما کو.....؟“ وردہ کی ٹانگوں سے جان نکل گئی، وہ بیڈ پر گر سی گئی۔

”جس طرح آپ میں سننے کا حوصلہ نہیں وردہ.....! اسی طرح مجھ میں بتانے کا حوصلہ نہیں..... تم آکر رپورٹ لے جاؤ، خود ہی پڑھ لینا۔“

وہ بھی آواز میں درد پیدا کر کے بولا تو وردہ ریسورر کہہ کر دوڑی۔

سرخ اور سیاہ پرنٹڈ کاٹن کے سوٹ میں اُلجھے بالوں اور بدحواس انداز میں گیٹ کی مدہم سی روشنی میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ غزین پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ گیا۔

”جی تو چاہ رہا ہے کہ اس حسین خیال کو اپنی زندگی کی غزل کا عنوان بنالوں۔“ وہ زیر لب جیسے منگنایا، نظریں اس کے حسین سراپے پر جمی تھیں، ایک پل کے لیے تو وہ سب کچھ بھول گیا اور اسے بے خودی کی سی کیفیت میں دیکھ کر وردہ چلائی۔

”کہاں ہے ماما کی رپورٹ.....؟ کیا ہوا ہے ماما کو.....؟“

”گاڑی میں ہے، دروازے کھلے ہیں، نکال لو۔“ وہ جیسے منہ میں بولا مگر وردہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے نہ تو اس کے انداز کو اہمیت دی اور نہ ہی اس کے پراسرار انداز پر توجہ۔ نہ ہی یہ سوچا کہ وہ اسے خود نکالنے کو کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ فرنٹ ڈور کھول کر اُدھر پر نیچے ڈش بورڈ کے اندر سب جگہ بے چینی سے تلاش کرنے لگی، اسے یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ غزین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا ہے اور اس کے پرفوم کی خوشبو جب اس کی ناک سے ٹکرائی تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ غزین نے اسے شانے سے پکڑ کر سیٹ کے ساتھ دھکا دیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف کا دروازہ لاک کرنے کے بعد گاڑی اسپرڈ میں چھوڑ دی۔ وردہ کو صورتحال سمجھنے کا موقع بھی نہ ملا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے.....؟“ اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی، جسم سے تو یہ خیال جان نکال ہی چکا تھا کہ غزین اسے کڈنیپ کر چکا ہے۔

یہ خوفناک حقیقت جب یقین بن کر سمجھ میں آئی تو وہ جنونی انداز میں اس کی جانب چھٹی۔

”تم..... تم کھٹیا آؤ.....! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی، تم نے دھوکہ دیا ہے مجھے۔ ارے.....! تم تو بہت ہی کھٹیا انسان ثابت ہوئے، حیوان، وحشی، جنگلی۔“ اس نے ایک زوردار تھپڑ غزین کو مارا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولنے لگی تو اس کی باتوں اور تھپڑ سے وہ جو سلگ اٹھا تھا۔ اس نے زور سے اسے سیٹ کے ساتھ چٹا اور دھاڑا۔

”شٹ آپ.....! خبردار جو کوئی بھی فضول بکواس تم نے کہی یا سمجھی اور اب اگر تم نے لاک کھولنے کی کوشش کی تو سامنے سے آتے آئل پمپ سے گاڑی مار دوں گا۔“

وہ اس وقت غصے سے پاگل ہو گیا تھا، وہ یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس نے کتنی زیادتی کی ہے، وہ صرف خود کو اہمیت دے رہا تھا۔

”مار..... مارو مجھے اور خود بھی مر جاؤ ذلیل انسان.....! تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا یہ حرکت کر کے۔ ماما تو جیتے جی مرجائیں گی کہ میرے ساتھ بھی وہی ہوا جو.....“

وردہ کے دماغ میں آنندھیاں سی چلنے لگیں۔ جو کچھ علیزہ کے ساتھ ہوا وہی کچھ اس کے ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اب شہلا کی کیا حالت ہوگی، وہ سوچ کر بھی غصے سے پاگل ہو رہی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب چلائے، ساری دنیا کو جھج کرے مگر پھر بدنامی اس کی ہوتی، اس کے والدین کی عزت پر داغ لگتا، اس نے اپنے بال نوچتے ہوئے غزین کو دیکھا، اس کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی، وہ اس شہد میں بھی پسینے میں



شرابور تھا، گاڑی فل اسپید پر چھوڑ رکھی تھی، ہونٹ سختی سے بچھنے ہوئے تھے وردہ کو اس خورد سے شخص سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

”اُف میرے خدا.....! یہ سب کیا ہے.....؟ کیوں ہے.....؟ کیا خطا ہوئی ہے ہمارے والدین سے کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک جیسی صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں.....؟“ وہ خوف اور غصے سے کانپ رہی تھی۔ اب نجانے اس کی کیا نیت تھی، کیا چاہتا تھا، اس کے بعد کیا ہوگا، یہ خیال اس کی رگوں کو کن کر گیا۔

”کیوں.....؟ کیوں کیا تم نے یہ سب.....؟ کیا چاہتے تھے مجھ سے گھٹیا انسان.....! کس بات کا بدلہ لے رہے ہو.....؟ کیا چاہتے ہو.....؟“

”جاننا چاہتی ہو میں نے یہ سب کیوں کیا.....؟ تو سنو.....! تمہارے عشق میں، تمہیں پانے کے لیے، اگر دماغ کے ہزار ویں حصے میں بھی یہ خوش فہمی ہے ناں تو اس کو ختم کر دو۔ میں نے تم سے کہا تھا تم میری ضرورت ہو پھر میں نے تم سے درخواست کی کہ پلیز میری ہیلپ کرو مگر تم نے میری بات نہیں مانی، مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا اور اب تم جب تک میرے پاس رہو گی جب تک میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ جاتا، جب تک میری تلاش ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ تم اس کی ذمہ دار ہو، تمہارا.....“ وہ دھاڑا، ساتھ ہی گاڑی دھماکے سے رُک گئی۔

”مما.....! پلیز آپ نے دونوں سے ڈھنگ سے کچھ کھایا یا نہیں، وہ جو آپ کے پاس نہیں ہے آپ اس کے لیے اتنی اُداس رہتی ہیں، آپ جی رہی ہیں تو اسی سے اپنے کی آس میں اور ہم جو سارا وقت آپ کو دیکھتے رہتے ہیں، آپ کی زندگی صحت کی دُعا کرتے رہتے ہیں، آپ کو دیکھ کر جیتے ہیں، ہم کچھ نہیں ماما.....! آپ کے.....؟“

زود ہاتھ تیرا بار سوپ لے کر آئی تو آصف نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تو وہ پھٹ پڑی اور پہلی بار شکوہ زبان پر آ گیا تو آصف نے تڑپتی ممتا کے ساتھ اسے دیکھا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی زوہا بھی، ان دونوں بچوں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ان کو بیمار پایا تھا اور اپنے باپ کی طرح نہ صرف ان سے محبت کی تھی بلکہ خدمت بھی کرتے تھے اور وہ اپنے چھڑے سکون کے لیے تڑپتی رہتی تھیں اور یہاں وہ خود بھی محسوس کرتی تھیں کہ وہ اپنے ان دونوں بچوں کی ساتھ نا انصافی کر جاتی ہیں۔ مگر وہ بھی کیا کرتیں، انسان تھیں اور انسانی فطرت ہے کہ ان کے بے شمار نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا جو اللہ نے اسے عطا کر رکھی ہوتی ہیں، جو نہیں ہوتی اس کا شکوہ کرتا ہے۔ آصف نا شکری تو نہیں مگر کیا کرتیں، وقت نے ان کی ممتا کے گلشن کو ویران کیا تھا، پھر وہ کیسے خوش رہ سکتی تھیں مگر اس وقت زوہا کے شکوے پر انہوں نے دونوں بازو پھیلا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

”مجھے معاف کر دینا میرے بچو.....! میں ہی زیادتی کر جاتی ہوں تم دونوں کے ساتھ مگر کیا کروں میری جان.....! میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے یا تو یہ آگ اس کے ملاپ سے بجھ سکتی ہے یا پھر یہ آگ موت بجھا سکتی ہے، دُعا کرو میرے بچو.....! اللہ میری آگ بجھا دے، میں نہ جی سکتی ہوں نہ مر سکتی ہوں۔“

آصف کو جب ڈپریشن کا دورہ پڑتا تو ایسے ہی غمناک حال ہو جاتا کرتیں مگر اب ظفر کا صبر جواب دے گیا تھا۔ وہ

اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے تھے، انہوں نے بہت صبر آزمائی گزارا تھا آصف کے ساتھ، وہ خود کو ان کو اور بچوں کو سنبھالتے سنبھالتے غمناک حال ہو گئے تھے۔

”اور..... اور تم اس بے یقینی کی کیفیت میں تب تک جتلا رہو گی آصف.....! جب تک تم یقین نہیں کر لیتیں کہ وہ مر چکا ہے، میں نے خود اسے مٹی کے سپرد کیا ہے، مردے کبھی زندہ نہیں ہوا کرتے، کیسے یقین ہوگا تمہیں.....؟ اسی بے یقینی میں تم نے میرے ساتھ بچوں کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی، اس ایک خاطر تم نے ان دونوں کی اہمیت کو ختم کر دیا، اس ایک کی خاطر ان دو سے ممتا چھین لی۔“

ظفر بہت چاہنے والے ہمدرد دوست نما شوہر تھے۔ آصف کا بے حد خیال رکھا مگر آج جانے کیسے وہ اتنے کم حوصلہ ہو گئے کہ آصف جن کی انہوں نے ہمیشہ عزت کی، حوصلہ دیا، آج اپنا ٹیپر لوڑ کر گئے تو آصف دل تھام کر رہ گئیں۔ زوہا اور نعمان حیرت سے ظفر کو دیکھ رہے تھے۔

”ظفر.....! کتنا چٹانوں جیسا حوصلہ ہے آپ کا.....؟ کیسے منہ بھر کر کہہ دیا.....؟ ماں نہیں ہیں ناں، باپ ہیں ناں آپ.....! اسی لیے میرے پھول سے بچے کے لیے اتنے بڑے الفاظ کہہ دیئے جو ماں مر کر بھی نہیں کہہ سکتی۔ میرا پھول سا بچہ.....!“

آصف دل پر ہاتھ رکھے بری طرح بکھر گئیں۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی تو زوہا، نعمان نے شاکی نظروں سے باپ کو دیکھا تب ان کو بھی اپنے الفاظ کی سنگینی کا اندازہ ہوا تو وہ لہجے میں ندامتوں کی دُھند لیے ان کے قریب آ گئے۔

”آصف.....! وہ میری بھی اولاد تھا جس طرح تمہارے لیے یہ یقین کرنا کہ وہ اب نہیں ہے مشکل ہے، اسی طرح میرے لیے مشکل ہے مگر تم یہ بات کیوں نہیں مان لیتیں کہ پھول ڈالی سے ٹوٹے ہی مرجھا جاتا ہے اور تمہارا پھول بھی.....!“

”ممتا کا یقین زندہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔ میرے پروردگار.....! میرے یقین کو حیات بخش دے یا مجھے بھی اٹھالے۔“

”بس کریں ماما.....! اب تو ہم سے بھی یہ سب برداشت نہیں ہوتا، ہم بھی انسان ہیں، کیا آپ کی صرف وہی اولاد تھا جس کے لیے آپ جیتی مرتی ہیں.....؟ آپ پر ہمارا کوئی حق نہیں.....؟ آپ کو ہمارا ذرا بھی خیال نہیں.....؟“

نعمان کو تو اب اپنے اس انجانے، اُن دیکھے بھائی سے حسد سا ہونے لگا تھا جس کی محبت میں ان کی ماں نے ان کو خود سے دُور رکھا تھا، جب جب وہ خوش ہوئے آصف اپنے بیٹے کا ذکر لے کر بیٹھ جاتیں، یوں ساری خوشی مٹ جایا کرتی، آج باپ کی طرح وہ بھی پھٹ پڑا تھا۔

”ہاں ہاں.....! میں مجرم ہوں تم سب کی، تم دونوں کی تمہارے باپ کی، کیا کروں میں.....؟ کیا کروں.....؟ مجھے معاف کر دو میرے بچو.....! معاف کر دو.....!“ آصف نے زوہا اور نعمان کو ساتھ لگا لیا اور شدتوں سے رو دیں۔



”چھوڑو.....! چھوڑو مجھے وحشی انسان.....! کہاں لے جا رہے ہو.....؟“

غزین سختی سے اس کی کلائی پکڑے اسے گھسیٹا ہوا جانے کہاں لے جا رہا تھا، وہ جہاں بھی لے جا رہا تھا ایک اطمینان تو ساتھ تھا کہ اس کی نظر میلی تھی اور نہ تیت گندی تھی پھر بھی اس کا یہ انداز، یہ وحشی پن بے مقصد تو نہیں تھا اور اگر اس کا مقصد کچھ تھا تو کیا تھا، یہی سوچ وردہ کی جان نکالنے کے لیے کافی تھی۔

وہ اسے اپنے بڑے سے گھر کے وسیع لان سے گھسیٹتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے آیا اور اسے جھکے سے صوفے پر دھکیلا اور جنونی انداز میں کمرے سے نکل گیا۔ وردہ کی آنکھوں کے سامنے تو اندھیرا سا چھایا ہوا تھا، وہ صوفے میں دھنسی روتی رہی کہ کسی نے شانے پر نری سے ہاتھ رکھا، ہاتھ کا لمس بہت دوستانہ مہربان سا تھا، یہ لمس اس جنگلی وحشی کا تو نہیں ہو سکتا تھا پھر یہ لمس کس کا ہے، یہی سوچ کر وردہ نے سر اٹھایا تو اپنے قریب کھڑے اسد کو پایا جس کے چہرے پر دکھ بھی تھا اور ہمدردی بھی اور یہ یقین دہانی کہ اس کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں، نہ ہی جان کو خطرہ ہے۔

”آ..... آ..... آپ.....!“ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

”سوری.....! سوری وردہ.....! میں جانتا ہوں کہ یہ سب بہت غلط کیا ہے غزین نے، اپنا سب کچھ گنوا دیا ہے اس نے یہ حرکت کر کے مگر میں کیا کرتا.....؟ کبھی کبھی یاری میں بارے کے لیے وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جسے کرنے کی نہ ضمیر اجازت دیتا ہے نہ انسانیت، لیکن تم فکر نہ کرو، غزین کسی غلط فہمیت سے تمہیں یہاں نہیں لایا وہ.....“

”شٹ آپ.....! شٹ آپ اسد.....! ایک شریف لڑکی کو تم لوگ دھوکہ دے کر گھر سے بلاتے ہو پھر اسے کڈنیپ کرتے ہو پھر بھی چاہتے ہو شرافت کی ٹرائی آپ لوگوں کو دی جائے.....؟ لیکن مت بھولو کہ میں کوئی کمزور، لاوارث لڑکی نہیں ہوں کہ جو ہوا اسے زہر کا گھونٹ سمجھ کر چپ ہو جاؤں گی، میں تم لوگوں کو مخالف نہیں کروں گی، عدالت میں گھسیٹوں گی، ڈگری ضبط کرادوں گی، ساری ڈاکٹری دھری رہ جائے گی، تم دونوں انتہائی گھٹیا انسان ہو، جیلوں میں سڑو گے ساری عمر۔“ وہ روئے گئی، چلتی رہی، اسی وقت غزین دھمکتا ہوا آیا اور پھر سختی سے اسے پکڑا۔

”ہمیں عدالت میں بعد میں گھسیٹ لینا، پہلے میری قید سے اپنے اس رشتے دار کو آزاد تو کرا لو جو مر رہا ہے، ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اسد.....! ڈاکٹر کو میں نے بھیج دیا ہے، اب گھر میں اور کوئی نہیں، خیال رکھنا.....!“

غزین اسد کو ہدایات دیتا وردہ کو گھسیٹتا ہوا آفاق صاحب کے سامنے لے آیا اور دھکا دے کر وردہ کو ان کی طرف پھینکا کہ اس کا سر آفاق صاحب کی سینے پر آ کر لگا۔ وہ بے بسی سے پہلے غزین کو پھر وردہ کو دیکھنے لگے اور وردہ کی سمجھ سے تو یہ سب بالاتر تھا، وہ نہ تو اس بیمار لاچار شخص کو جانتی تھی نہ ہی غزین کی باتوں کا مطلب سمجھ پا رہی تھی جبکہ غزین کسی زخمی شیر کی طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا، آفاق بے بسی کی تصویر بنے لرزتے ہونٹوں کے ساتھ کبھی وردہ کو دیکھ رہے تھے اور کبھی غزین کو دیکھ رہے تھے، وہ وردہ کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے مگر الفاظ اور آواز کھو بیٹھے تھے، بے بسی کے آنسو دونوں اطراف میں بہہ رہے تھے۔ غزین اس وقت بہت سفاک اور زہریلا ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پھر وردہ کو جھٹکے سے الگ کیا۔

”ایسے..... ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آفاق صاحب.....! پچھانے ذرا یہ کون لڑکی ہے.....؟ آنکھوں کی

جلن اور رگوں میں اُبلتے خون نے بتایا نہیں کہ یہ لڑکی کون ہے.....؟ چلے میں تعارف کراتا ہوں، یہ ڈاکٹر وردہ وجاہت ہے، آپ کی دو جڑواں بیٹیاں ہیں ناں.....؟ وردہ وجاہت اور علیہ وجاہت.....؟ آیا کچھ یاد وجاہت علی صاحب.....! آیا.....؟ شعور کی دنیا میں طوفان اُٹھا.....؟ رگوں میں اُبال.....؟ بولے.....! بولے وجاہت صاحب.....! آپ..... آپ آج بھی نہ بولے تو نہ یہ رہے گی نہ میں اور جب میں اور یہ نہیں رہیں گے تو آپ کیسے جی سکتے ہیں.....؟ اس لیے کہ میں جانتا ہوں میری محبت میں جکڑے ہوئے ہیں آپ اور یہ تو آپ کی سگی بیٹی ہے، آپ کا خون ہے، بولے.....!“

دانت پیس پیس کر غزین بول رہا تھا، وردہ کے حواس کام کرنے لگے تو وہ چیخ پڑی۔

”غزین.....! کیا یہ میرے بابا ہیں.....؟“ اور وردہ غزین سے ہاتھ چھڑا کر وجاہت کے قریب آ گئی۔

شدید سردی کے باوجود وجاہت کا سارا وجود پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، دماغ کی رگیں تن رہی تھیں، ہونٹ کپکپا رہے تھے مگر بے بسی یہ تھی کہ وہ نہ تو غزین کو کچھ کہہ سکتے تھے اور نہ ہی ہاتھ بڑھا کر وردہ کو سینے سے لگا سکتے تھے، عجیب سی کیفیت تھی ان کی جبکہ غزین جلاد کا کردار ادا کر رہا تھا۔

”بابا.....! بابا.....!“ وردہ وجاہت کے قریب بیٹھی ان کو بخور دیکھ رہی تھی، جب وہ ان سے جدا ہوئے تھے تو وجاہت نو جوان تھے اور اب وقت اول حالات کے ساتھ بیماریوں نے ان کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا مگر باپ کے وجود سے اُٹھنے والی پدرانہ خوشبو اور ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر وہ پہچان گئی تھی کہ یہی اس کے بابا ہیں جن کے جیتے جی انہوں نے قیاموں والی زندگی گزار لی تھی۔ کتنا دل چاہتا تھا کبھی بھی کہ کوئی مجزہ ہو جائے اور بابا آجائیں اور آج وہ ساری دُعا ئیں قبولیت کا لبادہ اوڑھے سامنے تھیں، وہ ان کے سینے پر سر رکھے رو رہی تھی، رُخ رہی تھی۔ وجاہت کی رگوں میں جتنا خون اُبلنے لگا تھا، وجاہت کے بے جان وجود میں بھی جیسے زندگی دوڑنے لگی تھی، انہوں نے بے بسی سے غزین کو دیکھا، ان کی نگاہوں میں اب بھی اس گستاخ کے لیے بے پناہ محبت تھی جس نے اپنی اولاد کو بھلا کر اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس غزین کو دیکھا، اپنی محبتوں کے خزانے اس پر لٹائے تھے اور غزین بھی اپنے اس ڈیڈ کو ٹوٹ کر چاہتا رہا۔

وہ اس کے آفاق ڈیڈ تھے جنہوں نے اپنی جان سے بڑھ کر اسے چاہا تھا، اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ ساری رات جاگے تھے، وہ اس وقت ان کی محبتوں کے خزانے کا بلا شرکت غیرے مالک بنا ہوا تھا مگر انہی دنوں وجاہت کا دوست ریاض بنزرس میں نقصان پر اتنا پاگل ہوا کہ اس نے غزین کو ساری حقیقت بتا دی کہ وہ نہ تو آفاق صاحب ہیں نہ ہی وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ وہ وجاہت کے بہترین دوست ظفر کا بیٹا ہے جس کو ریاض ہی کے ہاتھوں وجاہت نے اس وقت اغوا کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا جب وہ ابھی سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے ماں اور باپ سے چھین کر ایک عذاب مسلسل میں مبتلا کر دیا اور خود اس کی زندگی کا چاند بن کر اسے اپنی آنکھ کا تار بنا لیا۔ وجاہت نے ظفر سے ایسا انتقام لیا تھا کہ وہ اور آصف بیٹے کی یاد میں پاگل ہو کر رہ گئے تھے۔ ریاض نے یہ اُدھوری معلومات اسے دیں اور قریب تھا کہ وہ ظفر کے بارے میں مزید کچھ بتاتا اسے اسی رات ہارٹ ایکٹ ہوا اور وہ وفات پا گیا۔ تب سے غزین جس کی سوچ آفاق ڈیڈ سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہو جاتی تھی مگر اپنی حقیقت جان لینے کے بعد وہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور کچھ اس انداز میں اپنے اور ان کے رشتے کے بارے میں پوچھا کہ



و جاہت کو شدید قسم کا ایک ہوا، وہ سن سکتے تھے مگر سوچنے اور بولنے کی طاقت گنوا بیٹھے تھے بس تب سے عزیز جیسے اپنے آپ کو کھو بیٹھا تھا۔ وہ اپنے سگے والدین کے بارے میں جانتا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں اور یہ کہ وجاہت نے اس کے والدین سے ایسا انتقام کیوں لیا مگر اس کے سوالوں کا جواب دینے والے آفاق ڈیڈ بے حس و حرکت، بے زبان ہو گئے تھے اور وہ ہر لمحہ بے قرار ہو رہا تھا اپنے ماں باپ کو دیکھنے کے لیے۔ اس کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ ریاض کے بتائے ہوئے ایڈریس پر شہلا اور وردہ کی زندگی میں آئے، اسی لیے اس نے وردہ کے کالج میں داخلہ لیا اور نہ صرف خود اس کی زندگی میں آ گیا تھا بلکہ نہ چاہتے ہوئے بھی وردہ اس کی محبت بن کر اس کے دل میں آ بسی تھی۔ کیا ستم تھا، باپ سے جتنی نفرت ہو رہی تھی، بیٹی سے اتنی ہی محبت ہو رہی تھی لیکن اپنے والدین کی محبت ہر محبت پر حاوی ہو گئی تو اس نے وردہ کو طریقے سے اس ڈرامے میں شامل کرنا چاہا کہ وجاہت کو ڈرامہ کر کے اس کے ذریعے اموشنل ایک دے کر بولنے پر مجبور کیا جائے مگر وردہ نے اسے ہمیشہ غلط ہی سمجھا، تب اسے یہ غلط قدم اٹھانا پڑا۔ وہ جانتا تھا اسی طرح وہ وردہ کو گنوا دے گا مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اپنی ماں چاہیے تھی، باپ کی کمی تو آفاق ڈیڈ نے اتنے بھرپور انداز میں پوری کی تھی مگر ماں کھانسی اسے ہر لمحہ محسوس ہوئی تھی، وہ رویا کرتا تھا ماں کے لیے جس کو مردہ قرار دے دیا گیا۔ اس کے لیے وہ اتنا بے قرار تھا کہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت بھی کر بیٹھا تھا۔

”بابا.....! بابا.....! آپ کہاں چلے گئے تھے.....؟ اور اس ذلیل شخص کے قبضے میں کیسے آ گئے.....؟“  
وردہ روئے بھی جا رہی تھی اور وجاہت سے بات بھی کر رہی تھی کہ وہ وحشی انداز میں آگے بڑھا اور وردہ کو بازو سے پکڑ کر وجاہت سے الگ کیا تو ایک دم وجاہت کے ہاتھ میں جیسے جینٹل ہوئی۔  
”ایسے نہیں.....! ارے وجاہت صاحب.....! ایسے نہیں.....! ملنے والے کا باب بچی کو..... ایسے ہی مجھے میری ماں باپ سے الگ کیا تھا ناں.....؟ ایک ایک پل کے لیے رحم، ترس نامی کوئی چیز انتقام کے طوفان کو چھو کر گزری تھی نہیں، نہیں اگر گزرتی تو آج آپ اس صورت حال کا شکار نہ ہوتے..... میں بہت اذیت میں ہوں، بولیے وجاہت صاحب.....! کہاں ہیں میرے ماں باپ.....؟ بتاتے ہیں کہ کہوں آپ کی لاڈلی کو شوٹ.....؟“  
غزین نے گھٹیا فلمی ولن کا کردار ادا کرتے ہوئے ریو اور نکالا۔ وجاہت کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا، وردہ ہاتھ چھڑا کر پھر ان کے ساتھ جا گئی۔

”بابا! چلیں اُنھیں! میں آپ کو ابھی اسی وقت یہاں سے لے کر جاؤں گی۔ آپ اس کھٹیا انسان کے چنگل میں پھنس کیسے گئے؟“

ورودہ جو ابھی تک اس ڈرامے کے اصل مقصد کو نہیں جان پائی تھی وجاہت کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی تو غزین بھی زخمی شیر کی طرح اس پر چھٹا اور جھٹکے سے ورودہ کو کھینٹا۔ ایک تو ورودہ دیوار سے جا لگی، دوسری طرف وجاہت جھٹکے سے تکیے سے جا لگے۔ یہ ساری صورت حال وجاہت کی رگوں میں مزاحمتی قوت بھر رہی تھی۔

”ایسے نہیں، اتنی آسانی سے تم باپ بیٹی نہیں مل سکتے، جب تک مجھے میرے ماں باپ اور بھائی بہن کا پتہ نہیں مل جاتا۔ وردہ و جاہت.....! ذرا اپنے ڈئیر بابا جان سے پوچھو کیا عمر تھی میری جس وقت انہوں نے اپنے

بہترین دوست ظفر سے دشمنی بھائی.....؟ انتقام لینے کے لیے ان کے معصوم بیٹے کو ان سے یوں جدا کیا کہ نہ ان کو میری زندگی کی اُمید ہوگی نہ انتظار.....؟ و جاہت صاحب.....! بے شک میں اپنے باپ کی اولاد ہوں مگر..... مگر میری تربیت آپ نے کی ہے، آپ اگر اپنے دوست سے انتقام لے سکتے ہیں تو میں اپنے دشمن سے کیوں نہیں لے سکتا.....؟ اب آپ کی آنکھوں کے سامنے جب آپ کی پیاری بیٹی وردہ خون میں لت پت تڑپ رہی ہوگی ناں، تب آپ کو پتہ چلے گا کہ اولاد کی جدائی کیا چیز ہے.....؟ ایسا زہر ہے جوڑگوں کو کاٹتا رہتا ہے مگر مارتا نہیں..... اب آپ بولیں گے آفاق ڈیڈ.....! یا کروں میں آپ کی بیٹی کا کام.....؟“

غزین نے ریو الوروردہ کی کپٹی پر رکھ دیا، اسد سامنے آ گیا۔

”غزین.....! تم.....“

”اسد.....! پلیز اگر اب تک دوستی نبھائی ہے تو تھوڑی دیر اور سہی، تمہیں تو اندازہ ہے ناں کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں.....؟ ذرا سادہ او میری زندگی ویران کر جائے گا، بٹ آئی ڈونٹ کیئر مجھے میرے والدین کا پتہ چاہیے۔ آفاق ڈیڈ.....! نہیں، وجاہت صاحب.....! تیار ہو جائیے.....! ون..... ٹو..... ٹو..... ٹو.....“

غزین کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی، خود بھی کانپ رہا تھا۔ وردہ جس کو ساری کہانی پتہ چل چکی تھی مگر اس کے باوجود وہ غزین ہی کو غلط سمجھ رہی تھی کیونکہ درست منزل پر پہنچنے کے لیے اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ غزین پر آہستہ آہستہ خون سوار ہو گیا، وہ جائز و ناجائز، درست غلط سب کچھ بھول رہا تھا۔

”ڈیڈ.....! پلیز بولے.....! ورنہ.....“

اس کی دھماکے کے ساتھ ہی قاضی کی آواز گونجی۔ درودہ کی چیخ اور وجاہت کی لڑکھرائی آواز گونجی، لفظ ٹوٹ گئے۔

”نن... نن... نہیں! اغز... غز... غزین! نن... نن... نہیں! اا... اا... اا...  
مم... مم... میری بب... بب... بیٹی کو“

والدین کے لیے اولاد سے قیمتی شے کوئی اور نہیں ہوتی اور غزین نے اپنے ماں باپ کو پانے کے لیے ان کی بیٹی کو استعمال کیا اور وجاہت کے ہونٹوں پر برسوں کی چپ کا قفل ٹوٹ گیا تھا اور یہی وہ چاہتا تھا۔ غزین خوشی سے پاگل ہو گیا۔

”یا اللہ.....! تیرا شکر ہے.....!“ وہ گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

”کہاں ہے میری بیٹی.....! میری وردہ.....! کہاں گئی علیہ.....! تم اتنی بے خبر تھیں کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں.....؟ کون آیا.....؟ کون گیا.....؟“

رات گہری ہو رہی تھی۔ شہلا کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ علیزہ بے قصور ہو کر بھی مجرم بنی ہوئی کھڑی  
 ماما سے ڈانٹ کھا رہی تھی۔

”مما.....! میں اپنے کمرے میں تھی، جب آپ لوگ چلے گئے تو وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں۔ پھر میں چائے لے کر اس کے کمرے میں آئی تو ریسیور گرا پڑا تھا اور وہ غائب تھی۔ تب ہی تو میں



نے آپ کو فون کیا۔ خدا جانے کیا مصیبت آگئی کہ اس نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ علیزہ رونے لگی۔  
”خدا خیر کرے.....! یا اللہ.....! کہیں وجاہت کے ساتھ تو کسی نے دشمنی نہیں نکالی.....؟ ہیں شہلا.....!“  
کچھ یاد پڑتا ہے۔

”مجھے کچھ یاد نہیں بھابھی جان.....! کچھ معلوم نہیں، بس معلوم ہے تو اتنا کہ میں ہار گئی ہوں، اکیلے زندگی سنوارنے اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور مستقبل بنانے کا جو دعویٰ میں نے وجاہت سے کیا تھا، وہ آج تھپڑ بن کر میرے ہی منہ پر آگیا ہے۔ بھابھی جان.....! میں ہار گئی، جن لڑکیوں کی خاطر میں نے ایک غلط شخص سے شادی کی، میں انہیں بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکی۔“

شہلا اپنے آپ سے ہی شرمندہ تھیں، جو ادا اور ارمغان جانے کہاں کہاں خوار ہو رہے تھے کہ ارمغان کے موبائل پر وردہ کا فون آگیا، دونوں چونک گئیں۔

”او..... وردہ.....! تم کہاں ہو.....؟ تم خیریت سے تو ہو.....؟“

اور جب وردہ نے غزین کے گھر آنے کا کہا تو دونوں حیران رہ گئیں اور فوراً غزین کے گھر چلے آئے۔  
وجاہت نے اٹکتے ہوئے اپنی اور ظفر کی دوستی کے بارے میں سب کچھ بتا کر اعتراف بھی کیا تھا کہ ہمیشہ انہی کی غلطی ہوا کرتی تھی، ظفر بہت اچھا انسان تھا۔ غزین کے ساتھ وردہ کو بھی اپنے بابا کی اصلیت معلوم ہوئی تو اس کی نظریں جھک سی گئیں۔ غزین وجاہت سے معلومات لے کر اسد کے ساتھ جا چکا تھا۔

”جواد.....! یہ ہمارے کھوئے ہوئے بابا اور غزین کے اتفاق ڈیڈ ہیں۔“ وجاہت کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی، بچوں کے سامنے وہ اس صورت میں آ رہے تھے کہ مجرم بھی تھے اور نادم بھی۔

”ہمارے بابا.....؟“ جواد نے وجاہت کو دیکھا جن کو یوں لگے میں وقت ہو رہی تھی۔ جواد اور وردہ ایک ساتھ ان کی پھلی بانہوں میں سما گئے۔ وجاہت نے اشارے سے ارمغان کو بھی بلا کر ساتھ لگا لیا۔ دولت اور طاقت کے نشے میں بڑے بڑے دعوے کرنے والے وجاہت اپنے ہی بیوی بچوں کی عدالت میں شرمندہ بیٹھے تھے۔

”بابا.....! بابا.....! یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ ہمیں مل گئے ہیں.....؟“

علیزہ نے سب سے زیادہ وجاہت کو مس کیا تھا، وجاہت کی طبیعت خراب ہو رہی تھی مگر وہ سب بچوں کو چٹائے روئے جا رہے تھے۔ شہلا ایک طرف مجرم بنی کھڑی رو رہی تھیں۔

”پچھو.....! میرا خیال ہے ہم پہلے انکل کو ہاسپٹل لے جائیں کیونکہ ان کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ وردہ.....! آؤ پلیز.....! ہیلپ می.....!“ ارمغان آگے بڑھا کہ وجاہت کو سہارا دے کر بٹھائے، علیزہ ان کے سینے سے لگی ہوئی بیٹھی تھی۔ ارمغان نے اک زخمی نگاہ اس پر ڈالی، ایک وہ وقت تھا جب نگاہیں اسے سامنے دیکھنا چاہتی تھیں، آج یہ عالم ہے کہ وہ سامنے تھی اور وہ اس سے بے نیاز تھا۔ علیزہ اپنی نظروں میں گری گئی۔  
”جواد.....! علیزہ سے کہو پیچھے ہٹ جائے، میں ایک طرف سے انکل کو سہارا دیتا ہوں، دوسری طرف سے تم پکڑو۔“

ارمغان کا لہجہ بہت سادہ سا تھا، کوئی چڑانے والی بات نہیں تھی پھر بھی جواد نے شاکی سی نظر ارمغان پر

ڈالی۔ علیزہ کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی، وہ تیزی سے کمرے ہی سے نکل گئی تو ارمغان کو لگا جیسے جسم سے روح نکل گئی ہو اور پھر شہلا خود وجاہت کو ہاسپٹل لے گئیں۔

”ہاں ہاں.....! جاوید.....! کہہ تو رہا ہوں کہ میرا بچہ تو اس وقت پورے ایک سال کا بھی نہیں ہوا تھا جب..... نہیں میرے بھائی.....! تب سے اب تک اس کی ماں کو یہ کہہ کر یقین دلاتا رہا ہوں کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے اور خود اس یقین کے ساتھ زندہ رہتا ہوں کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور آجائے گا، مل جائے گا۔ نہ ماں کا یقین مرا ہے نہ باپ کی آس ٹوٹی ہے۔ ویسے آج تمہیں کیا خیال آگیا اس بارے میں پوچھنے کا.....؟“

ڈکھ کا گہرا سانس جیسے ان کے سینے کو چیر گیا۔ تب جاوید نے ان کو غزین کے بارے میں بتایا کہ وجاہت نے اسے بھیجا ہے اور خود کو ظفر کا بیٹا کہہ رہا ہے تو وہ آصفہ اور زوہا کو کسی ضروری کام کا کہہ کر نعمان کو لے کر اپنے گاؤں پہنچ گئے جہاں غزین جاوید کے ہاں موجود تھا۔ وجاہت نے سب کچھ غزین کو بتا دیا تھا اب جبکہ باپ بیٹا سامنے کھڑے تھے تو تعارف کی ضرورت ہی نہیں تھی، خون میں ابال ہی اتنے اٹھ رہے تھے جس نے صدیوں کے فاصلے مٹا کر بیٹے کو چھڑے باپ کے گلے سے لگا دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو مل جانے کا یقین دلا رہے تھے، دونوں تڑپ تڑپ کر رو رہے تھے۔

”آپ نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی پاپا.....!“ جب سے حقیقت پتہ چلی تھی اس نے سوچا تھا کہ پہلا شکوہ یہی کرے گا۔

”تمہاری تلاش میں تو ہم خود کہیں کھو گئے تھے بیٹا.....! ہماری زندگی کی خوشیاں کھو گئی تھیں اور..... اور تمہاری ماں تو.....“

”مما کہاں ہیں.....؟ آپ ان کو لے کر کیوں نہیں آئے.....؟“

غزین باپ کی شفقتوں کے، محبتوں کے مزے لوٹ چکا تھا، وہ ترسا تو ہمیشہ ماں کے لیے تھا۔

”تمہارے بعد وہ جیسی ہو سکتی ہے بیٹا..... ویسی ہے۔“ ظفر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وجاہت اتنا بھی گر سکتا ہے۔ ان سے دشمنی نبھانے کے لیے اس نے ان کا مصوم بچہ اغواء کر کے ان لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

نعمان کو بھائی کے ملنے کی بے حد خوشی تھی، بچپن سے آج تک اپنی ماں کو سرعام اور باپ کو چھپ چھپ کر روئے دیکھا تھا۔

”ہاں بھئی.....! حارث.....! نہیں.....! وجاہت نے جو تمہارا نام رکھا ہے وہی رہے گا، غزین.....! غزین بیٹا.....! زوہا اور نعمان کو بہت شکوہ ہے تم سے۔“

وجاہت کا ذکر کر کے ظفر کے لہجے میں بچپن کی یاری، محبت، عداوت کیا کچھ نہیں اُتر آیا تھا۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں تو نعمان نے خفگی سے ان کو دیکھا۔

”پاپا.....! جس شخص نے ہم سب کو ایک عمر اذیت، عذاب میں مبتلا رکھا آپ اب بھی.....“

”پلیز بیٹا.....! ٹھیک ہے جو ہوا برا ہوا مگر بیٹا.....! وجاہت میرے لیے کیا ہے.....؟ یہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔“



”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا۔۔۔! ڈیڈ کو کھانا آسان نہیں، وہ کچھ عجیب سے انسان ہیں، اچھے ہیں تو بے حد اچھے، نامہربان ہیں تو۔۔۔“ غزین نے تمام بچپن، جوانی و جاہت کے ساتھ گزاری تھی، ایک عمر تک وہ انہی کو اپنا سب کچھ سمجھتا رہا۔ جب حقیقت کا پتہ چلا تو وہ اپنے خون سے ملنے کو بیقرار ہو گیا اور جاہت کی محبت کے سارے روشن دیے اس نے ایک ہی پھونک سے بجھا ڈالے تو اب انہوں کی محبت کی روشنی میں بھی روشنی کی کمی کا احساس کیوں ہو رہا تھا۔ ظفر غزین کو لے آئے تھے مگر آصف کی طبیعت کے پیش نظر ایک دم اتنی بڑی خوشخبری دیتے ہوئے خوفزدہ تھے کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔

”آصف۔۔۔! تمہیں تو یقین ہے ناں کہ تمہارا بیٹا حادثہ واپس آجائے گا۔۔۔؟“ وہ آصف کو دہشتی طور پر تیار کر رہے تھے۔

”خود پر نہیں ظفر۔۔۔! مجھے خدا کی ذات پر اندھا اعتماد ہے کہ ایک نہ ایک دن میرا حادثہ آجائے گا اگر وہ زندہ نہ ہوتا تو میری متاثر گزرتی بیقرار نہ ہوتی، منتظر نہ ہوتی۔“ آصف کے لیے یہ اعتماد روشنی بن کر پھیل گیا تو نعمان نے ماں کو ساتھ لگالیا۔

”تو پھر ماما۔۔۔! اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ اللہ نے آپ کے انتظار کو باشر کر دیا ہے۔“

”ہاں۔۔۔! ہاں آصف۔۔۔! نعمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔ ہمیں اللہ نے ہمارا بیٹا حادثہ لوٹا دیا ہے۔۔۔“ غزین۔۔۔! غزین۔۔۔! آؤ بیٹا۔۔۔! اپنی ماں کے کلیجے میں گلی آگ بجھا دو۔“

ظفر خود بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ اس بچے کے انتظار میں کیسے کیسے نہیں تڑپے تھے وہ لوگ۔ غزین سامنے آیا تو جیسے وقت ختم گیا، چوبیس سال پیچھے چلا گیا، ایک سال کا بچہ نہیں ہوا تھا جب وہ ماں کی گود سے چھین لیا گیا تھا، اس وقت ماں کی گود بڑی تھی اور وہ چھوٹا تھا، آج ماں کی گود چھوٹی ہو گئی تھی کہ لمبا چوڑا بیٹا اب اس میں سا نہیں سکتا تھا۔ ایک طرف متاثر تھی، دوسری طرف بیٹا تھا اور درمیان میں تڑپتے ہوئے چوبیس سال تھے، دونوں لرز رہے تھے، غزین نے پہلی بار ماں کو دیکھا تھا۔ یہ عورت آصف ظفر تھیں ہی اتنی حسین یا غزین کو لگ رہی تھیں، شاید ماں ہوتی ہی حسین ہے۔ آصف جن کو یقین تھا کہ بیٹا لوٹ آئے گا آج جب یقین مجسم کھڑا تھا تو وہ بے یقین ہو رہی تھیں، یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اللہ نے عمر بھر کی دعاؤں کو غزین کے روپ میں سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ بچی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہی تھیں، تب ظفر نے جھپکے لہجے میں کہتے ہوئے غزین کو ان کی طرف بڑھایا۔

”جس یقین کے ساتھ تم مجھ سے اس کی جدائی سے لڑتی رہیں آج جب یقین مجسم بن کر آیا تو تم بے یقینی سے اسے دیکھ رہی ہو۔۔۔؟ آصف۔۔۔! یہ تمہارا ہی بیٹا حادثہ ہے۔ کیا تمہارے خون میں ابال نہیں آ رہے۔۔۔؟“

”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں عطیہ خاتون۔۔۔! کہاں ہے خولہ۔۔۔؟“

عتیہ خاتون نے سلی کے کپنے پر شہباز کو بلایا تھا اور اب شہباز عطیہ خاتون سے خولہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ عطیہ خاتون نے بغور ان کو دیکھا اور حقارت سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شہباز ان کے سامنے آگئے اور پھر اپنا سوال دہرایا۔

”شہباز صاحب۔۔۔! خولہ وہیں ہے جہاں اسے آج سے بیس سال پہلے ہونا چاہیے تھا۔“ عطیہ خاتون نے سختی سے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے خولہ سلی کے پاس ہے۔۔۔؟ عطیہ خاتون۔۔۔! آپ نے امانت میں خیانت کی ہے، آپ کو معاف نہیں کروں گا۔“ شہباز سلگ اٹھے تھے، ان کا بس چلنا تو عطیہ خاتون کو شوٹ کر دیتے۔ عطیہ خاتون پر سکون تھیں، انہوں نے گہرا سانس لیا۔

”کاش۔۔۔! کاش شہباز صاحب۔۔۔! یہ خیانت میں آج سے بیس سال پہلے کر دیتی تو آج یہ حالات نہ ہوتے جو گزر رہے ہیں۔ رہی بات معافی کی تو اگر آپ میں درگزر کرنے کی عادت ہوتی تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا عطیہ خاتون۔۔۔! میری بیٹی اس اداکارہ عورت سے واپسی لے کر آئیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

شہباز کے لہجے میں آج بھی سلی کے لیے بدگمانی تھی، عطیہ خاتون سلگ اٹھیں۔

”ہونہ۔۔۔! مجھے بہت دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے شہباز صاحب۔۔۔! کہ کاش۔۔۔! کاش خولہ اپنے پار سا باپ کی بجائے اداکارہ کے پاس ہوتی تو آج یوں بکھری ہوئی، ابھی ہوئی، بے راہ روڑ کی ہونے کی بجائے دینی اور مشرقی اقدار کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک اچھی پاک باز لڑکی ہوتی۔“

”عتیہ خاتون۔۔۔! آپ کا دماغ کیوں خراب ہو گیا ہے۔۔۔؟ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔۔۔؟“

شہباز عطیہ خاتون کو ایسے ہی دیکھ رہے تھے جیسے واقعی ان کا دماغ چل گیا ہو۔



”شہباز صاحب.....! دماغ اب ہی تو ٹھیک ہوا ہے جب میں نے تصویر کے دونوں رخ دیکھے ہیں تو چلا ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا.....؟ کون غلط ہے اور کون درست.....؟ لیلیٰ سو فیصد درست ہیں اور آپ سو فیصد غلط ہیں۔“

”عطیہ خاتون.....!“ شہباز غصے سے پاگل ہو گئے، چہرے پر شدید تناؤ اور آنکھوں سے شعلے برہم ہو گئے۔ تب عطیہ خاتون نے ان کو لیلیٰ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ اس نے اس وقت شوہر کو چھوڑ کر مشرقی روایات کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور یہ کہ وہ بے سہارا لڑکیوں کے لیے کام کرتی ہیں اور ان کو دینی تعلیم دیتی ہیں۔ خاتون بتا رہی تھیں مگر شہباز جو ابھی بھی اتنے بدگمان تھے کہ عطیہ خاتون کی کسی بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

”بس کیجئے عطیہ خاتون.....! بس کیجئے، مجھے کسی بات پر یقین ہے نہ اعتبار، کیونکہ اداکارہ ہمیشہ اداکارہ ہی رہتی ہے اور یہ جو کچھ وہ کر رہی ہیں ناں یہ بھی اداکاری ہے، سمجھیں آپ.....! اور میں کسی صورت اپنی بیٹی کو ان کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔“

شہباز راہ میں آتی ہر چیز کو کھوکھو مارتے آگے بڑھ گئے اور اب وہ لیلیٰ کی عدالت میں اپنی کھوکھلی دکالت کرنے کے لیے موجود تھے۔ بیس سال کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے تھے، ابھی دل بن کر ایک دوسرے کے سینے میں دھڑکے تھے، ایک دوسرے کی زندگی جیسے تھے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں خواب بن کر اترے تھے، ایک دوسرے کی چاہت بنے تھے، آج ایک دوسرے کے جاننے تن کر کھڑے گزرے ہوئے ایک ایک ہل کا حساب مانگ رہے تھے، اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی بدگمانی کی گردنیں اُترتی تھیں۔

”خولہ.....! چلو میرے ساتھ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ شہباز ایک طرف کھڑی سی خولہ کی طرف بڑھے۔ وہ سہم کر لیلیٰ کی اوٹ میں ہو گئی۔

”شہباز صاحب.....! خولہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔“

”میں تم سے نہیں اپنی بیٹی سے مخاطب ہوں۔“ شہباز کے لب و لہجے میں آج بھی وہی کڑھکی اور سفاکی تھی جو ان ماں بیٹی کو ترپا گئی۔

”ہونہہ.....!“ آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں، یہ آپ ہی کی بیٹی ہو سکتی ہے، آپ کی تربیت یافتہ بیٹی جو دینی اور اخلاقی روایات کو اپنے قدموں تلے روندتی ہوئی ایک بدکردار قلم میکرو ڈائریکٹر کے ہتھے چڑھ گئی اور اس ڈائریکٹر نے آپ کے غرور، آپ کے نظریات کو جب اپنے قدموں تلے روندنا چاہا تو اللہ نے اسے وہاں سے اٹھا کر ماں کی گود میں لا ڈالا۔“

لیلیٰ کے اندر طوفان اُٹھ رہے تھے اس مد مقابل کھڑے شخص کو دیکھ کر جو ستم گر بنا تیرا زما رہا تھا، جس کو کبھی انہوں نے ٹوٹ کر چاہا تھا، آج وہی اجنبی بنا حساب مانگ رہا تھا۔

”مجھے اس گھٹیا فلمی اسٹوری میں کوئی انٹرسٹ نہیں میڈم لیلیٰ.....! خولہ.....! چلو میرے ساتھ۔“ شہباز آج بھی خود سری کی اس منزل پر تھے۔ وہ آگے بڑھے اور خولہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو خولہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھی بلکہ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”سوری ٹو سے بابا.....! یہ کوئی فلمی کہانی نہیں ہے، یہ وہ کہانی ہے جسے خود آپ نے میری زندگی کی صاف

شفاف کتاب پر رقم کیا ہے۔ نہیں جاؤں گی میں آپ کے ساتھ۔“

”مما.....! آپ نے کیوں جانے دیا تھا مجھے بابا کے پاس.....؟ بابا نے مجھ پر زندگی کا دائرہ اتنا تنگ کر دیا تھا کہ اب میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ بابا نے مجھے میری کسی عمر کا حرا نہیں لینے دیا اور نہ ہی چھوٹی چھوٹی سی خواہشات کو پورا کرنے دیا، میری زندگی کے ایک ایک سانس کو بابا نے اپنی مٹھی میں قید کر رکھا تھا۔ ممما.....! ٹی وی کو بابا نے میری حسرت بنا دیا، میں گھٹ گھٹ کر جینے پر پابند کر دی گئی۔ ممما.....! عطیہ خاتون بھی میری طرح بے بس تھیں، بابا نے آپ سے مقابلہ جیت لینے کے جنون میں مجھے ہار دیا، میری مصمصیت کو داؤ پر لگا دیا۔ نہیں جانا مجھے بابا.....! آپ کے پاس۔ بابا.....! آپ نے توڑ پھوڑ دیا ہے مجھے، بے یقینی میں جتلا کر دیا ہے۔ نہیں جانا مجھے آپ کے ساتھ۔“

خولہ صوفے کی اوٹ میں بیٹھ کر شدت سے رونے لگی، شہباز اندر سے ٹوٹنے لگے، خولہ تو ان کی طاقت تھی، جیت تھی مگر اب وہ ان کی ناکامی، کمزوری اور ہار بن گئی تھی اور ان کی کمزوری لیلیٰ کی طاقت بن گئی، لیلیٰ کی نگاروں میں وہ منظر آ گیا جیسے شہباز جلاد اور سفاک آدمی کا روپ دھارے چند روز کی بچی کو ان کی گود سے ایسے چھین کر لے گئے تھے جیسے کوئی بھنی ہوئی بھول کو چتا ہے۔

”سوری.....! ویری سوری شہباز صاحب.....! میں اب آپ کو کیا کہوں.....؟ آپ کی اپنی تربیت، آپ کی اپنی محبت، آپ کی اپنی بیٹی نے آپ کو ناک آؤٹ کر دیا ہے جس کو آپ ایک اداکارہ سے بچا کر اس لیے لے گئے تھے کہ اس کو ایک آئیڈل مسلمان مشرقی لڑکی بنائیں گے تو بتائیے کیا ہوئے آپ کے وعدے.....؟ آپ نے ٹی وی کو اپنا قریب سمجھ کر اس کی وجہ سے مجھے بھی چھوڑ دیا اور بیٹی کو بھی اس کی سزا دی، آپ نے ہر جائز خواہش کو خولہ کے لیے ناممکن بنا دیا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ پانی کو راستہ درکار ہو تو وہ راستہ مانگتا نہیں خود بنا لیتا ہے، غبارے میں گنجائش سے زیادہ ہوا بھری جائے تو پھٹ جاتا ہے، آپ نے بھی انتہا کا راستہ اپنایا، اعتدال کا راستہ اپناتے تو آج ہماری عدالت میں سر جھکا کے بے دلیل نہ کھڑے ہوتے، کیا اسی لیے میری گود اُجاڑی تھی کہ میری مصمصوم بچی کی ہر خواہش اور ضرورت کو اپنی سنگدلی سے کچل دیں۔“

ایک اداکارہ سے بچا کر کیا کردار سازی کی ہے آپ نے اس کی.....؟ ٹی وی سے، اداکارہ سے بچا کر اور خود بیٹی نے آپ کے رویے سے، آپ کی بے جا پابندیوں سے تنگ آ کر بغاوت کی راہ اختیار کی۔ اگر آپ اس پر، خود پر اعتماد کرتے، جائز طور پر اسے سب کچھ کرنے کی اجازت دیتے تو شہباز صاحب.....! آج وہ شرمناک حالت میں نہ ملتی۔ آپ نے جب اسے میری گود سے چھینا تھا تو اس وقت وہ پاک اور مصمصوم تھی اور جب دوبارہ میری گود میں لوٹی تو اس حلیے میں شہباز صاحب.....! جس میں کبھی تصویر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ٹی وی اور اداکاری سے بچانے والے شہباز.....! سینے آپ کی بیٹی اداکاری کی ٹریننگ لے رہی تھی اور ایک خبیث آدمی..... خیر جو ہوا اور میرے پروردگار نے اسے بچا کر مجھے لوٹا دیا۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھتی ہوں کہ آپ کو مجھ سے انتقام لینا تھا، یہ جنگ جیتنا تھی تو بیٹی کی ایسی تربیت کرتے کہ واقعی یہ مشرقی اور مسلمان بچی ہوتی۔ لاؤ شہباز.....! میری مصمصوم بیٹی کا وہ بچپن جو اس نے میری ممتاز اور دوسری خواہشات کو ترستے ہوئے گزارا، لوٹاؤ.....! میری بیٹی کی کم سنی اور لڑکپن کے دن جو اس نے روتے ہوئے گزارے، جواب دو مجھے ایک اداکارہ کی



آج فاطمہ کو اپنے بیٹے کے ساتھ زیادتی کا بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں خرم موسیٰ کو کتنا چاہتا ہے مگر حیثیت مرتبے کے چکر میں انہوں نے موسیٰ کو صرف ایک ملازمہ ہی سمجھا۔ ایک شریف، اچھی تعلیم یافتہ لڑکی نہیں جو ان کے بیٹے کی محبت بھی تھی اور زندگی بھی۔ انہوں نے دوسرا بازو پھیلا کر خرم کو بھی ساتھ لگا لیا اور شدت سے رو دیں۔

”آپ سب کو مبارک ہو.....! شہباز صاحب کو ہوش آ گیا ہے۔“ ابا نے آکر اطلاع دی تو بھانگے والوں میں لیلیٰ سب سے پہلے تھیں۔

”سوری بابا.....!“ خولہ باپ سے لپٹی رو رہی تھی۔ شہباز بھی رو رہے تھے۔ انہوں نے خولہ کو بچھڑا لیا۔

”سوری تو میری جان.....! مجھے کرنی ہے۔ میں ہی کم ظرف انسان ہوں جس نے پہلے تمہاری ماں کو پھر تمہیں دکھ دیے۔ آئی ایم سوری ٹو بیٹا.....!“

”سوری شہباز.....!“ بھنگی آواز کا لس شہباز نے اپنے ہاتھ پر محسوس کیا تو اپنے قریب خدامت کی دھند میں کھڑی لیلیٰ کو دیکھ کر دایا ہوا پیارا منڈ آیا۔

”نہیں لیلیٰ.....! تم مجھے معاف کر دو۔“ اور پھر معافی طلبانی کا سلسلہ شروع ہوا اور عطیہ خاتون تک پہنچا جو لائق سی بنی کھڑی تھیں۔

”لیلیٰ.....! میں تمہارا گناہگار ہوں مگر عطیہ خاتون عظیم عظمت ہیں جنہوں نے خولہ کو ماں بن کر پالا۔“ لیلیٰ ان کے گلے جا لگیں۔

زندگی کے آگن میں ملن رت اتر آئی تھی۔ معافی طلبانی اور اعترافات کے بعد زندگی کے ملن کے رنگ مسکرانے لگے تھے۔ خولہ نے ماں اور باپ کو پہلی بار یکجا دیکھا تھا اور نہال ہوئی جا رہی تھی۔ پیارے پیارے گزنز سہیو اور شہرام کو پا کر وہ بے حد خوش تھی۔ رنگ برساتے ایسے ہی انہوں میں شہرام نے جب فاطمہ بیگم کے کہنے پر منگنی کی رنگ دوبارہ ردا کو پہنائی تو موسیٰ آہستگی سے خرم کے قریب آ گئیں۔

”خرم.....! میں نے کہا تھا نا کہ میں لوٹ کر آپ کی زندگی میں ضرور آؤں گی.....؟ آگئی ہوں نا.....؟“

موسیٰ کی بات پر اک اُدھوری سی، تشنہ سی مسکراہٹ خرم کے ہونٹوں پر آ گئی۔ سب کو باتوں میں مصروف دیکھ کر شہرام نے ردا کا ہاتھ پکڑا اور باہر جانے لگا تو خولہ اور سنی نے راستہ روک لیا۔

”بہنوں کا نیگ دیئے بغیر بھابھی کو کہاں لے جا رہے ہیں بھیا جی.....!“ دونوں ایک ساتھ بولیں تو ردا شرما گئی۔ شہرام نے دونوں کو گھورا پھر ایک دم بولا۔

”ارے.....! وہ دیکھو تمہارے پیچھے کیا ہے.....؟“

دونوں اس کی شرارت سمجھے بغیر پیچھے مڑیں تو شہرام ردا کا ہاتھ پکڑ کر بھاگ گیا تو دونوں پاؤں شیخ کر رہ گئیں۔

• • •

غزین اپنے والدین کے پاس آ گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسے سکون آ جاتا مگر اک عجیب سی بے قراری

اب بھی تھی۔ اسے وجاہت کی یاد دل رہی تھی۔ بچپن کا ایک ایک دن، ان کی محبت میں گزرا ہوا ایک ایک پل یاد آ رہا تھا۔ وہ سب میں بیٹھا بھی ہوتا تو خود کو وجاہت کے پاس پاتا۔ کئی بار ظفر کو بھی آفاق ڈیڈ کہہ جاتا تو آصف کو غصہ آ جاتا۔

”بیٹا.....! تم اب بھی اس کی محبت کے حصار سے باہر نہیں آئے ہو.....؟“ ماں کو غصے میں دیکھ کر وہ بے بسی سے ظفر کو دیکھتا۔

”آصفہ.....! تم وجاہت کی محبت کو نہیں جانتیں نا، اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو۔ غزین بیٹا.....! میں تمہاری کیفیت کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ ظفر کو واقعی وجاہت سے اتنا پیار تھا کہ اتنی بڑی بات ہو جانے کے باوجود بھی دل میں اس سے نفرت نہیں پیدا ہوئی تھی اور اسی بات پر آصفہ کو غصہ آ رہا تھا۔

”بس بس.....! رہنے دیجئے، میں اچھی طرح جانتی ہوں، آپ وجاہت کی محبت کے نشے میں گم ہیں مگر ایک بات سن لیجئے، میں اپنا بیٹا اب اس ظالم دیوی کی قید میں نہیں جانے دوں گی۔“

”مما.....! ماما ایک بار بھی نہیں.....؟“ غزین نے بے بسی سے پہلے ماں کو پھر باپ کو دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے جانے کی یقین دہانی کرائی۔

”ایک بار بھی نہیں.....!“ وہ اٹل لہجے میں بولیں تو غزین کا چہرہ اتر گیا۔ زوہا اور نعمان نے ہاتھ پکڑ کر ڈھارس بندھائی جو وردہ والا راز جانتے تھے۔

”ایک بار تو ماما.....! ہم سب کو انکل کے ہاں چاہا ہی ہوگا۔“

”کیوں.....؟ کیوں جانا ہوگا.....؟“ کہاب بھاتے ہوئے انہوں نے زوہا اور نعمان کو گھورا تو ظفر نے بچوں کو دیکھا اور خاموش رہنے کا اشارہ کر کے سلا دہانی طرف بڑھاتے ہوئے بیگم کو دیکھا۔

”بھئی.....! آپ بھول رہی ہیں وجاہت کے گھر ہماری ہونے والی بہو ہے، اسے لانے کے لیے تو جانا ہی ہوگا نا.....؟“

”کوئی ضرورت نہیں.....!“ آصفہ نے میز پر پلیٹیں رکھیں۔

”دُنیا میں لڑکیوں کی کیا نہیں ہے کہ ہم وجاہت کی بیٹی کے لیے مرے جائیں.....؟ دُنیا کی آخری لڑکی نہیں ہے وہ۔“

غزین کے چہرے پر اترتی شام کو وہ دیکھ ہی نہیں رہی تھیں، سمجھتا تو دور کی بات تھی۔ اک ٹیس سی غزین کے دل میں اٹھی وہ یہ بھی نہ کہہ سکا ماما سے کہ آپ کیا جانیں وردہ آخری لڑکی ہی ہے جس کی محبت اور طلب ہے اس کے دل میں۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تب ظفر اور زوہا، نعمان نے آصفہ کو گھیر لیا۔

”محبت اتنی تنگ نظر نہیں ہوتی آصفہ.....! جس کا تم مظاہرہ کر رہی ہو۔ مانا کہ وجاہت نے مجھ سے دشمنی نبھانے کے لیے غزین کو کڈ نیپ کر لیا، یہ بھی تو دیکھو کتنا قابل، با کردار سانچے میں ڈھالا ہے اسے۔ تم ماں ہو، ذرا

ممتا کا پاگل پن کم کر کے دیکھو۔ وہ وجاہت سے مل کر اپنے رویے کی معافی مانگنا چاہتا ہے جو اس نے ہم تک پہنچنے کے لئے اس سے ردا رکھا اور وردہ تمہارے بیٹے کی اولین پسند ہے، چاہت ہے، محبت ہے۔“

ظفر بہت نرم لہجے میں آصفہ کا ہاتھ تھامے بتا رہے تھے۔ تب اچانک آصفہ نے ان کو دیکھا، لہجے میں ہلکا



بیٹی کو اس سے بچا کر لے گئے پھر وہ اداکارہ کیسے بنی.....؟ جواب دوشہباز.....!"

لیلیٰ شہباز کا گریبان پکڑے شدتوں سے رو رہی تھیں، گزرے دنوں کا ایک ایک لمحہ جو انہوں نے کرب، اذیت کے ساتھ جیا تھا آج آنسو بن گیا اور شہباز جن کے دل و دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے ان کے مضبوط قدم لڑکھڑاہے تھے۔ آج اپنی ہی سوچوں کی، دعوؤں کی دیوار ان پر آگری تھی، اندر کہیں اعتراف کی برف پکھلنے لگی تھی کہ انہوں نے غلط کیا اور اگر کیا تھا تو اپنے ہی دعویٰ کو غلط ثابت کر دیا۔ اپنے انتقام میں وہ اپنی ہی بیٹی کو توڑ گئے۔ وہ ان کی محبت کے سائے تلے سلتی رہی، جلتی رہی اور ان کو احساس ہی نہیں ہوا۔ کس رعب اور گھمنڈ سے وہ خولہ کو مثالی لڑکی بنانے کے چکر میں، لیلیٰ کو نچا دکھانے کی آرزو میں معصوم بیٹی کو چھین کر لے گئے تھے، پھر اپنے زعم میں اپنے فرائض بھی ادا کرنے بھول گئے۔ کیا سوچا تھا کہ خولہ کو مثالی لڑکی بنا کر، لیلیٰ کو شکست کا ہار پہنا کر خود جیت کی ثرائی حاصل کر لیں گے مگر یہ تو سب اُلٹ ہو گیا تھا، جیت کی بجائے ہار کی گرد آڑ رہی تھی ان کے ارد گرد۔ وہ تو لیلیٰ کو لا جواب کرنا چاہتے تھے مگر وقت اور حالات نے ان کو لا جواب کر دیا تھا، آندھیوں میں ڈولتے ہوئے وہ جانے کیسے باہر نکل گئے تھے، گہری دُھند میں لیلیٰ نے اس شکست خوردہ شخص کو جاتے ہوئے دیکھا جس کی محبت کا دیا ان کے دل میں آج بھی اسی طرح روشن تھا۔

"مما.....! ماما بابا چلے گئے.....؟ بابا مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے ناں.....؟ ماما.....! بابا بہت اچھے ہیں، آئی لو ہم ماما.....! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، میں نے ان کو ہرٹ کیا ہے..... ہے ناں ماما.....!"

خولہ کو اب دُکھ ہو رہا تھا کہ اس نے بابا کو ناراض کیوں کیا، ان کا دل کیوں دُکھایا۔  
"ہاں بیٹا.....! میری اور تمہاری کم نصیبی یہ ہے کہ بعد میں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے غلط کیا۔ اس وقت اگر میں وجاہت کی باتوں میں آکر ایسا نہ کرتی تو..... اور اگر میں نے غلطی کر دی تھی تو تمہارے بابا کو طرف کا ثبوت دینا چاہیے تھا مگر....."

دونوں ماں بیٹی اس شخص کے لیے دُکھی ہو رہی تھیں جس سے دونوں بے حد پیار کرتی تھیں اور اس وقت وہی شخص آندھیوں کی زد میں گاڑی چلا رہا تھا۔ آج حقیقت کے آئینے میں اپنی اچھی شکل بھی انتہائی مکروہ نظر آرہی تھی۔ بات ذرا سے طرف کی تھی، دکھا دیتے تو آج زندگی کا شیرازہ اس طرح نہ بکھرا ہوتا کہ سیٹنا دُشوار ہو جاتا، زندگی نقطہ آغاز سے لے کر اب تک ان کے سامنے تھی، ہر موڑ پر اپنا ہی قصور نظر آ رہا تھا۔ ایک تو ہمارا احساس تھا، بیٹی کی زندگی، اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات تھے، دوسری طرف لیلیٰ کو غلط سمجھنے کا دُکھ جو آج بہترین عورت کے روپ میں معاشرے کی بیٹیوں کو دینی اور اخلاقی تعلیم دے کر معاشرے کی بہترین شہری بنا رہی تھی، کون اُدھورا اور غلط تھا اس سوال کے آئینے میں اپنا آپ فٹ نظر آیا تو سامنے سے تیز رفتاری سے آنے والا آئینہ ٹیکر نظر نہ آیا اور بچے کی بے سود کوشش میں وہ دُخم دُخم ہو کر ہسپتال میں موت اور زندگی کی کشاکش میں جتا تھے۔

"سوری بابا.....! پلیز مجھے معاف کر دیں۔" شہباز کے دماغ پر چوٹ آئی تھی، ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے دیئے تھے، خولہ خود کو بابا کی مجرم سمجھتے ہوئے رو رہی تھی اور لیلیٰ اپنی جگہ نادم اور شرمندہ تھیں کہ اگر قصور وار شہباز تھے تو بے قصور وہ بھی ثابت نہیں ہوئی تھیں، شہباز نے اگر کم ظرفی کا ثبوت دیا تھا تو اعلیٰ ظرف وہ بھی نہیں تھیں۔

"مما.....! اگر شہباز کو کچھ ہو گیا تو..... تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی، نہ ہی خود کو معاف کروں گی۔"

لیلیٰ قاطعہ کی گود میں سر رکھے تڑپ تڑپ کر جب شہباز کے لئے رو رہی تھیں تو کچھ قاصلے پر کھڑے امیر کے اندر اک اُداس سی شام گہری ہو گئی، محبت کے سفر میں وہ تمام عمر تنہا چلے تھے، ایک لمحے کے لیے بھی لیلیٰ ان کے ہمراہ نہیں ہوئی تھیں، شہباز ہار کر بھی ساری بازیاں جیت گئے تھے۔

"ساری بات ظرف، معافی اور درگزر ہی کی تو ہوتی ہے، ایک لمحے کی بات ہوتی ہے جو اس لمحے میں ظرف کا مظاہرہ کر جاتا ہے زندگی کی ساری خوشیاں، کامیابیاں اس کے ہمراہ ہو جاتی ہیں مگر یہ..... خیر اگر ایک وقت میں شہباز صاحب نے کم ظرفی دکھائی تو وقت نے یہ موقع لیلیٰ.....! آپ کو بھی دیا اور آپ نے بھی وہی کیا۔ اب فیصلہ کون کرے کہ کون جیتا کون ہارا.....؟"

"میں جانتی ہوں عطیہ خاتون.....! کہ میں نے غلط کیا ہے، مجھے ہی ظرف کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ بس آپ اللہ سے دُعا کیجئے شہباز لوٹ آئیں تو میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔ اس وقت غلطی میری ہی تو تھی، نہ میں کمزور پڑتی اپنے وقتی شوق کے ہاتھوں اور نہ میری زندگی تباہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور شہباز کو واپس لوٹا دے۔"

شہباز کا پتہ مومی اور اختر کو بھی چل گیا تھا۔ وہ لوگ ہسپتال آئے تو مومی لیلیٰ کی طرف بڑھیں، دونوں ایک مدت کے بعد مل کر خوب روئیں۔ شہرام اور والد ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔  
"خدا سے دُعا کرو لیلیٰ.....! انت شاء اللہ شہباز بھائی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"مومی.....! تم نے مجھے ٹھیک مشورہ دیا تھا کہ شوق کی مدت چھ سات سال ہوتی ہے، اس کی خاطر اپنا گھر برباد مت کرو مگر..... مگر مجھے شیطان نے بہکا دیا اور میرا آشیانہ نکا نکا ہو کر بکھر گیا۔ مومی اب میں کس طرح سمیٹوں اس کو.....؟"

لیلیٰ مومی کے ساتھ لگی چل چلی گئی، مومی نے اک زخمی سی نظر خرم پر ڈالی، گزرے وقت نے انہیں اور باوقار کر دیا تھا، دل میں ناراضگی کی میس اُبھری تو وہ سر جھٹک کر قاطعہ کی طرف مڑیں تو سارا درد آنکھوں میں اُتر آیا جواب تک نہیں بدلتی تھیں۔ آج بھی "میں" کی مسند پر براجمان تھیں، وہ ان کی طرف بڑھیں جنہوں نے ان کی معصوم بیٹی ردا کو اپنا کر شکر ادا کیا تھا۔

"آپ کیسی ہیں بیگم صاحبہ.....!" مومی کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا یا انہیں محسوس ہوا تھا۔ ان دنوں وہ خود بھی اک اذیت سے گزر رہی تھیں۔ یہ مال و دولت، یہ طبقاتی فرق، معاشرتی معیار، یہ سب انسان کے اپنے بنائے ہوئے قاعدے قانون اور اصول ہیں اور وہ خود ہی ان کو لاگو کرتا ہے ورنہ دین اسلام نے تو تمام انسانوں کو برابری کا درس دیا ہے اور دولت، حیثیت اور مرتبے کا جادو ٹوٹا تو قاطعہ کو مومی لیلیٰ کی طرح لگیں اور پہلی بار ان کو اپنے بیٹے خرم اور مومی کے ساتھ زیادتی کا احساس ہوا تو انہوں نے دونوں بازو مومی کے لیے پھیلا دیئے۔

"بیگم صاحبہ کیوں.....؟ ماما کیوں نہیں کہاتم نے مجھے.....؟ مومی.....! اتنا کچھ گنوا دینے کے بعد بھی ہم نہ سدھرے تو وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں جو ماضی میں کر چکی وہ مجھے معاف کر دو مومی.....! کاش ہم انسان ٹھوکر لگنے سے پہلے سنبھل جایا کریں تو شاید اتنا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔"



ساطر آگیا۔

”اور آپ کی محبت کی بیٹی بھی ہے وردہ۔۔۔۔۔!“

ان کی بات پر ظفر نے آصفہ کو دیکھا۔ ان کو مرحومہ زینت کی حیثیت ظفر کے دل میں معلوم تھی اور وہ مرحومہ ہی کیوں نہ ہو، کسی بیوی کو اس کا ذکر پسند نہیں آتا۔

”ہاں۔۔۔۔۔! ایک وجہ یہ بھی ہے مگر میرے لیے اہمیت میرے بیٹے کی خوشی رکھتی ہے۔ اب اس کو کیا کہیے

کہ میرے بیٹے کی محبت میری محبت کی نشانی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ غزین خوش رہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں تو پھر ماں ہوں مگر میں یہ بتائے دیتی ہوں اب میں اپنا بیٹا

وجاہت کو لوٹاؤں گی نہیں۔“

آصفہ میں یہی اچھی بات تھی، درست دلائل کو نہ صرف منتی تھیں بلکہ ماں لیتی تھیں، جلد ہی ماں گئیں تو ظفر

بہت خوش ہو گئے۔

”آپ خاطر جمع رکھیے بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔! میرا دوست بے غیرت نہیں کہ غزین کو گھر داماد بنا کر رکھے گا۔

آؤ۔۔۔۔۔! آؤ غزین بیٹا۔۔۔۔۔! بھئی۔۔۔۔۔! میں تو تمہارا کیس لڑا کر تھک گیا ہوں، تمہاری ماں تو مانتی نہیں، اب تم خود

اپنا دفاع کرو میاں۔۔۔۔۔!“

ظفر نے سامنے سے غزین کو آتا دیکھ کر بات بدل دی تھی۔ غزین اس وقت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ وہ آصفہ کے

مسکراتے چہرے کا مطلب بھی نہ سمجھ سکا۔

”ٹھیک ہے ماما۔۔۔۔۔! اگر آپ کو وردہ پسند نہیں تو نہ سہی مگر آپ مجھے ایک بار جانے کی اجازت دے دیں۔

میں ڈیڑے سے اپنے رویے کی معافی مانگ کر لوٹ آؤں گا، پراس۔۔۔۔۔! اس نے باقاعدہ ہاتھ آگے بڑھا دیا تو

ماں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔! پھر تم اکیلے نہیں جاؤ گے، مجھے تمہارے ڈیڑے پر کوئی بھروسہ نہیں۔“

”آپ میرے ساتھ ضرور چلے ماما۔۔۔۔۔! لیکن آپ ڈیڑے کے لیے کوئی غلط بات کہیں گی اور نہ ہی ان کو برا

کہیں گی۔ میں نے ان کی محبتوں کو پہلے ہی شرمندہ کیا ہے حالانکہ وہ میری ذرا سی تکلیف پر ہماری رات بیٹھ کر

گزارہ کرتے تھے اور جب وہ بیمار ہوئے تو میں ان کو آپ کی وجہ سے اذیت دیا کرتا، ڈلا دیتا، گڑبلا کرتا مگر

انہوں نے مجھے کبھی برا بھلا نہیں کہا اور تو اور آپ لوگوں کا پتہ معلوم کرنے کے لیے میں نے وردہ کو کڈ نیپ کیا، ان

کو اموشنلی بلیک میل کیا۔ پپا۔۔۔۔۔! پلیز مجھے ان سے معافی دلا دیجئے ورنہ میں ایک پل بھی سکون سے نہیں جی

پاؤں گا، پلیز پپا۔۔۔۔۔! ماما۔۔۔۔۔!“

ایک ماما کا اور ایک ہاتھ پپا کا آنکھوں سے لگا کر غزین شدت سے رو دیا تو ماں اور باپ جن کو ڈھیروں

منتوں، مرادوں کے بعد یہ بیٹا دوبارہ ملا تھا، اس کے آنسو دونوں کو تر پائے۔

”غزین۔۔۔۔۔! میری جان۔۔۔۔۔! میں سمجھ سکتا ہوں کہ وجاہت نے تمہیں کتنی محبت سے پالا ہوگا اور پیدا

کرنے والے سے پالنے والے کی محبت زیادہ پاؤں ہوتی ہے آج یقین آگیا۔ ہم ضرور جائیں گے تمہارے ڈیڑے

کے پاس اور تمہارے بجائے ہم ان کے پاؤں چھو کر ان سے معافی مانگ لیں گے، خوش۔۔۔۔۔!“

”ٹھیک پپا۔۔۔۔۔! ٹھیک پوسوچ۔۔۔۔۔!“

غزین نے خوشی سے ماں اور باپ دونوں کو ساتھ لگا لیا۔

”غزین بیٹا۔۔۔۔۔! ہم بہت جلد وجاہت کے ہاں جائیں گے۔ اب میں بہو گھر لانا چاہتی ہوں ناں اس

لیے۔“ ایک ساتھ کائنات کے سارے رنگ غزین کے چہرے پر اتر آئے۔

• • •

”شہلا۔۔۔۔۔! وقت اور حالات نے مجھے میرے بد اعمال کی سزا دے تو دی ہے اور میرے خدا نے مجھے

معاف بھی کر دیا ہے تم سب کو لوٹا کر پھر تم مجھ سے کیوں خفا ہو۔۔۔۔۔! کیوں ڈور ڈور ہو۔۔۔۔۔! میں جب سے آیا ہوں

تم ایک بار بھی میرے قریب نہیں آئیں اور نہ ہی خود سے بات کی۔ میں نے جو بات کی تم نے نظریں چراتے

ہوئے جواب دے دیا۔ کیا اب بھی مجھ سے خفا ہو۔۔۔۔۔!“

وجاہت کی سوچ، عمل، الفاظ سب میں تبدیلی آگئی تھی۔ انہوں نے گڑ گڑاتے ہوئے اپنے رب عظیم سے

اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی تھی تو دل میں اتر جانے والا سکون اس بات کی گواہی دے گیا کہ ان کی توبہ قبول کر

لی گئی ہے مگر شہلا کا گھبرانا، بات میں مکمل نہ کرنا، ڈور ڈور ہانا ان کو پریشان کر جاتا کہ شاید انہوں نے ان کو معاف

نہیں کیا ہے مگر شاید وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ شہلا ان سے کترا کیوں رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ان کا مجرم سمجھ رہی

تھیں کہ انہوں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ وہ اکیلے ہی زندگی کی جنگ لڑیں گی اور جیت کر دکھائیں گی، وہ دعویٰ ان کی

ہار میں کر آنکھوں میں عداوت کا ڈھواں بھر گیا تھا۔ وہ بچوں کی درست تربیت نہیں کر پائی تھیں۔ علیزہ والے

دستے کی وجہ سے وہ وجاہت سے نظریں نہیں ملا پائی تھیں۔ ان کی اس بات پر وہ ہمت کر کے ان کی طرف مڑیں

اور ان کے سینے پر سر رکھ کر شدت سے رونے لگیں۔

”سوری وجاہت۔۔۔۔۔! آئی ایم ویری سوری۔۔۔۔۔! آج میں اپنی ہار کا اعتراف کرتی ہوں۔ میں ہار گئی

ہوں وجاہت۔۔۔۔۔! میں شرط ہار گئی ہوں۔“

اور پھر شہلا ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی کمزوری کا اعتراف کرتی چلی گئیں تو وجاہت نے ان کو

بولنے دیا تا کہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ پھر وہ بڑی ہمت کر کے بیٹھ گئے اور شہلا کو قریب بٹھالیا۔

”دیکھو شہلا۔۔۔۔۔! زندگی توازن کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں توازن اور اعتدال رکھا مگر کم ظرف

انسان ذرا سی دولت اور طاقت کے نشے میں اپنی اوقات بھول جاتا ہے اور بڑے بڑے دعوے کر بیٹھتا ہے۔ پھر

وقت وہی دعوے اس کے منہ پر دے مارتا ہے۔ میں اور تم اسی بشری کمزوری کا شکار ہوئے ہیں، اپنی اپنی طاقت

کے بل پر اتنے بڑے بڑے دعوے کیے اور وقت نے وہی دعوے ہمارے منہ پر دے مارے۔ اگر ہار جیت ہی

کی بات ہے تو ہار تو میں ہوں، تم تو اس وقت بھی جیت گئی تھیں شہلا۔۔۔۔۔! جب تم نے ایک انجان انجینی عورت

زینت کی بیٹیوں کو گود لے لیا تھا، جیت تو تم اس وقت بھی گئی تھیں جب تم نے محض ان بچیوں کو کسی اور سوتیلی ماں

سے بچانے کے لیے مجھ جیسے بد کردار آدمی سے شادی کر لی، جیت تم اب بھی گئی ہو میرے بچوں کو بہترین تعلیم و

تربیت دے کر معاشرے کا بہترین شہری بنایا۔“

وجاہت بڑے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ان کی جیت کو تسلیم کر رہے تھے مگر شہلا علیزہ والی بات



پراب بھی شرمندہ تھیں۔

”نہیں وجاہت! آپ! آپ! آپ کچھ نہیں جانتے کہ.....“

”میں جانتا ہوں شہلا!.....! علیزہ نے مجھے ساری بات بتادی ہے کہ میری وجہ سے وہ ہمیشہ تم کو تنگ کرتی رہی اور تمہاری چڑ میں وہ غلط راستے پر چلی اور اس انجام سے ہمکنار ہوئی۔ تم تو اب بھی جیت گئی ہو کہ تمہاری تربیت نے علیزہ کو بچ بولنے کی تربیت دی اور وہ سچ بول گئی اور سفارش کر کے گئی ہے کہ بابا یہ صرف اور صرف میری خطا ہے، اس کی ذمہ دار میں خود ہوں، ماما کو کچھ مت کہیے گا، ماما جیسی سوتیلی مائیں خدا ان سب کو دے جن کی اپنی مائیں نہیں رہتیں۔ دیکھا تم پر میرا رب عظیم، اتنا مہربان ہے کہ تم ساری بازیاں جیتی چلی گئی ہو اور اب تم نے مجھے بھی جیت لیا ہے۔“

وجاہت نرم اور جیسے لہجے میں بول رہے تھے۔ شہلا ان سے لپٹ کر شدت سے رو دیں۔

”وجاہت! آپ اور آپ کے بچے بے حد اچھے ہیں کہ مجھے جیسی کو جیت کا میڈل پہنا دیا۔“

”نہیں شہلا!.....! میں اچھا صرف اس وقت ہوں جب وہ مجھے معاف کر دے گی۔ میں بہت مقروض ہوں اس کا۔ دعا کرو وہ معاف کر دے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔“

”لیلیٰ کا تصور کر کے وجاہت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کیا وقت تھا وہ گرائی کا کہ وہ شیطان بنے ہر ایک کی زندگی برباد کرتے چلے گئے، آج کھا تا کھولا تو سب سے زیادہ مقروض لیلیٰ کے نکلے۔ شہلا سمجھ گئیں کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپچل سے ان کا چہرہ صاف کیا۔“

”آپ اطمینان رکھیے وجاہت!.....! اللہ نے چاہا تو وہ بھی آپ کو معاف کر دے گی۔“

”مجھے لیلیٰ کے ہاں لے چلو!.....! بہت بوجھ ہے میرے دل پر۔“

”جی بہتر!.....!“

چند گھنٹوں میں وہ نادام شرمندہ لیلیٰ کے سامنے موجود تھے۔

”شہباز!.....! میں اگر ذلیل، کم ظرف اور برا تھا تو تم ہی بڑے پن کا ثبوت دیتے۔ کتنا سفر کیا ہے لیلیٰ اور خولہ نے میری اور تمہاری وجہ سے.....؟ قسم سے دل چیر کر نہیں دکھا سکتا مگر..... مگر میں بے حد شرمندہ ہوں، نادام ہوں۔ لیلیٰ!.....! خولہ بیٹی!.....! پلیز معاف کر دو!.....!“

وجاہت کے بھیکے لہجے میں سچائی تھی۔ فاطمہ بیگم نے بڑھ کر وجاہت کو پیار سے ساتھ لگا لیا۔

”چلو بچو!.....! سب اپنا اپنا دل صاف کرو اور گلے ملو۔ پرانی عداوتیں بھول کر نئے رشتوں کے دیے جلاؤ۔“

فاطمہ بیگم نے آگے بڑھ کر خولہ اور جواد کو ساتھ لگا لیا تو بڑے بھی خوشی سے بغل گیر ہو گئے۔

”ڈیڈ!.....! ڈیڈ مجھے معاف کر دیں پلیز!.....! آپ جانتے ہیں ناں کہ میں نے وہ سب کیوں کیا.....؟“

پلیز ڈیڈ!.....! آئی لو یو!.....! میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتا۔“

غزین وجاہت کے قدموں میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا اور وجاہت تڑپ کر رہ گئے تھے۔ کتنی محبت سے پرورش

کی تھی، وہ غزین کو اس رویے کے لیے حق بجانب سمجھ رہے تھے مگر وہ ابھی اسے معاف نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”کوئی معافی نہیں ملے گی، جاؤ اپنے کم ظرف بزدل باپ کو بلا کر لاؤ جو ابھی بھی پردے کے پیچھے چھپا ہوا میری تڑپ سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔“

ظفر دانستہ طور پر سامنے نہیں آئے تھے مگر وجاہت کی بات پر وہ تیر کی طرح باہر نکلے اور وجاہت سے جا ملے۔

”وجو!.....! میرے دوست!.....! میری جان!.....!“

”یار ظفری!.....! میں تو برا تھا ہی تم کہاں کھو گئے تھے.....؟“ دونوں دوستوں کی ناراضگی، خشکی آنسوؤں میں بہہ گئی۔

”ظفری!.....! تو مجھ سے لڑے گا نہیں.....؟ میں نے تیرا بیٹا کڈ نیپ کر لیا.....؟“ وجاہت نے غزین کو

ساتھ لگا لیا۔

”یار!.....! ابھی تو نے غزین کی تربیت کی ہے ناں تو سوچتا ہوں کاش تم میرے دوسرے دو بچوں کو بھی کڈ نیپ کر لیتا۔“

ظفر ایک بار پھر وجاہت کے گلے گلے گئے۔ بدگمانی کی دھند چھٹی تو ایک دوسرے کی محبت کا چاند روشن ہو گیا۔

”ظفری!.....! میں بہت کمینہ آدمی تھا، جب زینت کی وجہ سے تم نے مجھے بدکردار کہا تو میں نے تم سے انتقام لینے کے لیے غزین کو کڈ نیپ کر دیا کہ اسے غلط راستے پر ڈال کر تمہیں برائی اور بدکرداری کی شکل دکھاؤں گا مگر بار!.....! میں ایسا کر ہی نہیں سکا۔ شاید میرے اندر ایک اچھا آدمی تھا جسے میں نے ہی چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے غزین کی بہترین تربیت کی، میں امانت میں خیانت کر ہی نہیں سکا۔ ظفری!.....! مجھے یہ لڑکا بے حد عزیز ہے، بھابھی!.....! غزین مجھے واپس لوٹا دیں، پلیز!.....!“

وجاہت نے غزین کو ساتھ لگا کر لیلیٰ سے لہجے میں کہا۔ آصف مسکرائے لگیں۔

”وجاہت!.....! یہ کیا بات ہوئی.....؟ کیا اسے گھر داماد بنانے کا ارادہ ہے.....؟“

”اس!.....! کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ وجاہت نے چونکہ خود اس پر کچ پر نہیں سوچا تھا، ان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

”غزین بیٹا!.....! تم ذرا باہر جاؤ، تمہارے کند ذہن ڈیڈ کو اپنی بات کا مطلب سمجھا دوں۔“ غزین تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

”دیکھو وجاہت!.....! ماضی میں زینت تمہاری تھی اور اب زینت کی بیٹی وردہ میری ہے۔ میری بیٹی ہے میری بہو ہے۔“

وجاہت کا ہاتھ تمام کر ظفر نے بڑی محبت سے وردہ کو مانگا تو وجاہت حیرت اور خوشی کے ساتھ اس بات کا مطلب سمجھ کر جھوم اٹھے۔

”تو!.....! تو تمہاری بات کا یہ مطلب تھا.....؟“



”جی و جاہت بھائی.....! ہماری بات کا یہی مطلب ہے اور مجھے آپ کی ہاں کی ضرورت بھی نہیں، اپنے بیٹے کو کڈ نیپ کرنے کا میں بدلہ ضرور لوں گی آپ کی بیٹی کو کڈ نیپ کر کے لے جاؤں گی، کیوں بھابھی.....!“

”ضرور ضرور بھابھی.....! ضرور۔“ شہلا اور آصفہ گلے لگ گئیں۔

• • •

”ارمغان.....! مجھے تم پر اس قدر اعتماد تھا اور مجھے شاید خوش فہمی تھی کہ میں تمہیں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں لیکن یہ صرف میری خوش فہمی تھی، غلط فہمی تھی تم تو اس سے بہت مختلف ہو جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔“

وردہ کو اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ اس واقعے کے بعد ارمغان علیزہ سے دستبردار ہو گیا تھا۔

”اور مجھے دکھ اس بات کا ہے وردہ.....! کہ مجھے اتنی اچھی طرح جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے تم یہ کہہ رہی ہو.....؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ سب کرنا میرے لیے آسان ہے.....؟ اس لڑکی سے جو میرے دل کی دھڑکن ہے، میری خواہش ہے، میری محبت کا عنوان ہے، میری زندگی ہے، میری تنہا ہے، اس سے دستبردار ہو جانا میرے لیے آسان ہے.....؟ سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں.....؟ صرف اسی لیے کہ مجھے وہی علیزہ لڑتی جھگڑتی، ہر ایک کو خاطر میں نہ لاتی پسند تھی جو مجھے انکسور کرتی تھی۔ اس وقت وہ مجھے اچھی لگتی تھی، میں چاہتا تھا وہ اسی طرح خود سری سے ہٹ دھرمی سے اڑتی پھرے اور میں اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے آگے پیچھے پھروں، اس کی ایک نگاہ التفات کے لیے میں اس کی نظر کے ذریعہ پرکھتا ہوں مگر میں نے ایسی علیزہ کا کبھی خواب نہیں دیکھا تھا جس کی نظر اور گردن شرمندگی سے جھکی رہے، وہ محض اپنی غلطی کے احساس تلے دب کر تمام عمر میری بیوی بن کر شرمندگی کے احساس کے ساتھ گزار دے، شرمناک ہو کر، احسان مند ہو کر نہیں وردہ.....! مجھے ایسی علیزہ نہیں چاہیے جس کی نظر بار چاکی کی پچائے شرم اور مذمت سے جھکی رہے۔ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اس واقعہ کے بعد وہ کتنی بدل گئی ہے، اس میں وہ بھی نہیں رہی۔“

آج پہلی بار ارمغان نے اپنے موقف کی وضاحت کی تھی، پہلی بار دل کا غبار نکالا تو وردہ جو اس سے سخت بدگمان تھی، اب سمجھ گئی تھی۔

”سوری ارمغان.....! میں نے تمہیں غلط سمجھا۔“

وردہ کا دل تو ارمغان کی طرف سے صاف ہو گیا تھا مگر علیزہ جس کو اس واقعہ کے بعد ہی احساس ہوا تھا کہ وہ ارمغان کو کتنا چاہتی ہے، اس نے ارمغان کی بات کا آخری جملہ سن لیا تھا کہ نہیں چاہیے مجھے ایسی علیزہ۔ وہ غصے سے سر تاپا کانپ گئی، وہ خود پر ضبط نہ کر سکی اور سامنے آ گئی۔

”ارمغان صاحب.....! آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں.....؟ کیا کیا ہے میں نے کہ آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں.....؟ شکر الحمد للہ! میرے خدا نے میری عزت محفوظ رکھی، آپ نہیں کرتے شادی مت کیجئے۔ ارے.....! میں کوئی آپ کے قدموں میں پڑی ہوں کہ آپ چاہیں تو اپنائیں، چاہیں تو ٹھکرا دیں.....؟ حد ہو گئی.....؟ آپ تو دنیا کے آخری مرد بین بیٹھے علیزہ کے لیے.....؟ سات جنم لے کر بھی آئیں گے ناں تب بھی آپ مجھے گوارہ نہیں، کم ظرف انسان کی میری زندگی میں گنجائش ہی نہیں۔“

آج اتنے دنوں کے بعد پہلی والی علیزہ سامنے آ گئی۔ اس کا چہرہ غصے سے تپ کر سرخ ہو رہا تھا اور وہ

حیرت سے دیکھ رہی تھی اور ارمغان کو لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی پرانا خواب دیکھ رہا ہو۔ بے خودی سے بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”وردہ.....! مجھے چنگی کاٹو.....! میں..... میں خواب تو نہیں دیکھ رہا.....؟“ ارمغان کے اندر تو خوشی کے پٹانے پھوٹ رہے تھے، وہ پھر پہلے کی طرح شوخ ہو گیا تھا۔

”چنگی سے گزارہ نہیں ہوگا وردہ.....! ان کے بھوسا بھرے دماغ پر یہ گلا مارو، تب ہوش ٹھکانے آئیں گے۔“ علیزہ نے غصے سے بڑے سے گلے کی طرف اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔

”کیسے.....! اب کیا ارادہ ہے.....؟“ وردہ نے ارمغان کو دیکھا تو وہ خوشی سے اسے پکڑ کر جھوم گیا۔

”شادی کا.....! یہ..... یہی تو علیزہ میں چاہتا تھا۔“

”او کے.....! گڈ لک.....! جائے اور منائے.....!“

وردہ خوش اور پرسکون ہو کر آگے بڑھ گئی کیونکہ اس کو معلوم تھا ارمغان علیزہ کو منالے گا اور ارمغان علیزہ کو منانے چل دیا۔

”علیزہ.....! پلیز میری بات سنو.....!“ وہ ہر جگہ علیزہ کا پیچھا کرتا رہتا، اس وقت بھی لان میں اسے آتا دیکھ کر علیزہ جانے لگی تو وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”مجھے کچھ نہیں سننا.....! سمجھے آپ.....!“ وہ اسی رعوت سے بولی۔

”لیکن مجھے سنانا ہے۔ آئی لو علیزہ.....! پلیز.....!“ اب پھر پہلے کی طرح علیزہ کو منانا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”مجھے فضول باتوں اور فضول لوگوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔“ وہ آگے بڑھی تو وہ پھر سامنے آ گیا۔

”مجھے تو ہے..... وہ میرا مطلب ہے صرف میری ایک بات کا جواب دے دو پھر میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“ وہ پرانے انداز سے بول رہا تھا۔

”فرمائیے.....!“ وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

”دیکھو.....! وہ تمہیں وردہ اچھی لگتی ہے.....؟“ اس بے تکلی بات پر وہ خود بھی حیران ہوا اور علیزہ تو گھور کر رہ گئی۔

”یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے والی.....؟ ظاہر ہے، ہاں.....!“

”اور..... اور و جاہت انکل سے پیار ہے.....؟“

”ہاں.....!“

”اور شہلا پچھو سے بھی پیار ہے.....؟“

”ہاں.....!“ علیزہ کو اب شدید تائو آرہا تھا۔

”مجھ سے شادی کرو گی ناں.....؟“

”ہاں.....! ہاں.....! کہہ دیا ناں ہاں.....!“

”بس.....! یہ ہوئی ناں بات.....!“ اس کے سوالوں کے جواب میں ہاں کہتے کہتے وہ شادی والی بات

”ہاں.....! ہاں.....! کہہ دیا ناں ہاں.....!“

”بس.....! یہ ہوئی ناں بات.....!“ اس کے سوالوں کے جواب میں ہاں کہتے کہتے وہ شادی والی بات

”ہاں.....! ہاں.....! کہہ دیا ناں ہاں.....!“

”بس.....! یہ ہوئی ناں بات.....!“ اس کے سوالوں کے جواب میں ہاں کہتے کہتے وہ شادی والی بات



پر بھی ہاں کہہ گئی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور ڈھیر ساری شرم میں وہ ڈوب گئی۔ کتر اکر جانے لگی تو ارمغان نے اس کا راستہ روک لیا۔

”بس.....! ایک اور ہاں کا سوال ہے بابا.....! ڈوبو پو پو.....؟“

اس کے سوال پر علیزہ نے اسے دیکھا مگر آنکھوں میں جانے کیا کچھ تھا کہ وہ زیادہ دیر اسے دیکھ نہیں پائی۔

”ہاں.....!“ اس کے شرمگین لہجے میں اُتری چھوٹی سی ہاں ارمغان کی زندگی رنگین کر گئی تو وہ اس کا ہاتھ تھامے گنگنا نے لگا۔

”مل گئی، مل گئی مجھ کو پیار کی منزل۔ اے اللہ.....! تیرا شکر یہ.....!“

علیزہ شرم سے اسے دیکھ کر رہ گئی اور دُور کھڑی وردہ اور شہلا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

وجاہت اور نظیر پرانی باتیں مٹائے نئے رشتے کا اعلان کرنا چاہتے تھے مگر وردہ غزین سے سخت خفا تھی ہر چند کہ وہ اس بات کو ماننی تھی کہ وجاہت نے غزین کو انتقام کے لیے کڈ نیپ کر کے غلط کیا ہے اور اس کے روجل کے طور پر غزین کا رویہ بالکل درست تھا مگر پھر بھی غزین سے بہت ناراض تھی۔ وہ جہاں بھی ہوتا وہ کھسک جاتی اور غزین اس کی نظروں میں آنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشتا رہتا اور وہ اسے مسلسل اگنور کر رہی تھی۔

”ہائے.....! آف.....! مر گیا یار.....! بہت تکلیف ہے، کسی ڈاکٹر کو بلاؤ.....!“ اس وقت وردہ تیار ہو کر ہاسپٹل جا رہی تھی کہ لاؤنج سے گزرتے ہوئے غزین اسے دیکھتے ہی چلایا تو ہنی بھاگی آئی۔

”کیا ہوا غزین بھیا.....!“

”ارے.....! ہونا کیا ہے.....؟ بہت بڑے بڑے زخم ہیں، دیکھو تو.....!“ غزین نے وردہ کے ناخنوں کے نشان دکھائے جو اُس وقت غصے میں اسے وردہ نے مارے تھے۔

”ارے بھیا.....! واقعی یہ تو خاصے زخم ہیں، یہ تو لگتا ہے جیسے کسی نے ناخن.....“

”ارے ہاں.....! خدا تمہارا بھلا کرے، ہونا آخروڈا لڑکی بہن، دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ کسی جنگلی جھگڑاوبلی کے پنجوں کے نشان ہیں۔ لگتا ہے زہر سارے جسم میں پھیل گیا.....“

غزین کی شوخ نظریں وردہ پر تھیں جو نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ ہنی غزین کی بات کا مطلب یوں بھی نہیں سمجھ پارہی تھی کیونکہ غزین کے آنکھ اور ہونٹ کے قریب گہرے زخم کے نشان تھے، صاف لگ رہا تھا واقعی کسی بلی نے پنچے مارے ہیں۔ اسے واقعی ہمدردی ہونے لگی۔

”تو بھائی.....! آپ نے دیر کیوں کی.....؟ کسی ڈاکٹر کو دکھائیں ناں، کہیں جراثیم پھیل نہ جائیں۔“

”کیا پھیل نہ جائے.....؟ ارے لڑکی.....! خطرناک بلی کا زہر پورے بدن میں سرایت کر گیا ہے، اب تو بچنے کی اُمید بھی کم کم ہے۔ مجھے عشق کا لگا روگ میرے بچنے کی نہیں اُمید۔“ اپنی فائل تلاش کرتے وہ الماری کے قریب آئی تو غزین نے اسے سنانے کو کہا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تو وہ یک دم ہم جانے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

”باپ رے باپ.....! بلی پھر غرار ہی ہے، مجھے اپنی آنکھیں اور چہرہ کہیں چھپا کر رکھ دینا چاہیے۔ ہاں، اس میں چھپا لیتا ہوں اپنا حسین چہرہ ورنہ بلی پھر ناخن مار دے گی۔“

غزین نے شرارت سے وردہ ہی کے آنچل میں چہرہ چھپا لیا تو ہنی ساری کہانی سمجھ گئی اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

”اوہ.....! تو یہ بات ہے غزین بھیا.....! آپ بھی ناں.....!“

”جی.....! یہی بات ہے ہنی بہنا.....! آپ بھی ناں کم عقل ہیں، بالکل وردہ آپ پر پڑی ہیں عقل کے معاملے میں۔“ وہ مسلسل وردہ کو دیکھتے ہوئے چھیڑ رہا تھا۔

”مجھے موضوع گفتگو بنانے کی ضرورت نہیں، چھوڑیے میرا دوپٹہ.....!“

وہ سخت خفا تھی۔ اس نے غصے سے اپنا دوپٹہ کھینچا تو وہ خود بھی کھینچا چلا آیا۔

”دیکھا، کاشن کے دوپٹے سے کھینچے چلے آئے سرکار آپ کے۔“ وہ اسے منانے کے فل موڈ میں تھا۔

”غزین صاحب.....! دوپٹہ چھوڑیے، مجھے ہاسپٹل سے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ کتر اکر آگے بڑھی تو وہ پھر ہانسنے آگیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

”جب مریض گھر پر ہو تو ہاسپٹل جانے کی کیا ضرورت ہے.....؟ اس مریض دل کے لیے بھی کوئی علاج تجویز ہو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا شوخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ کھینچا۔

”ایک پڑیا زہر بچا یک بچے بچنا اتفاق ہوگا۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ پھر آگے آگیا اور اپنے زخموں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”اور.....! اور ان زخموں کے لیے بھی تو کچھ ارشاد ہو۔“

”مٹھی بھر تک مریضیں چڑک لیتے۔“

وہ تیز قدم اُٹھاتی لان میں آگئی کیونکہ آج اس کی ایوننگ تھی اور اب تین بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی تو وہ گاڑی کے ہونٹ پر بندھ گیا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ ہونٹ پر بیٹھا رہا تو اسے اُتارنے کے لیے وردہ نے زور سے بریک لگائے اور وہ اُچھل کر زمین پر آ رہا۔ کئی چھل گئی اور خون بھی بہنے لگا۔ وہ غصے سے اُٹھا، گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ ذرا سا گھبرائی۔

”اُترے مجھ نہ.....! ایک سیڈنٹ کیا ہے آپ نے، اس کی سزا تو آپ کو ہر صورت ملے گی۔ ارے.....! ہنی دیکھو، لڑکی ہو کر ہلا کو خان بنی رہتی ہو.....؟ کبھی منہ تو جتی ہو، کبھی گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کر کے کہنی زخمی کرتی ہو۔“ وہ لڑکا انداز میں اسے گھور رہا تھا۔

”جو سزا سنانی ہے جلدی سنائیے.....! مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو غزین نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”سزا کے طور پر آپ کو مجھ نالائق سے شادی کرنا ہوگی۔“

غزین کے لہجے میں بے تحاشا محبت تھی اور آنکھوں میں قدیم یں روشن تھیں۔ وہ ڈگمگاسی گئی پھر ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹی۔

”ہرگز نہیں.....! آپ دُنیا کے آخری مرد بھی ہوتے تب بھی نہیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولی تو وہ مقابل آ کر



کا کردار، اس کی باتیں، حرکتیں، سب کتنا ناگوار گزرا کرتا تھا مگر بہت تلاش کے باوجود کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ملا تھا جب اس نے غزین سے نفرت کی ہو۔ بدتمیز، خونرو سا یہ شخص دل کے آس پاس ہی رہا تھا اور جب اس کی حرکتوں کی وجہ بھی معلوم ہوگئی جس کی ایک خاص وجہ خود اس کے بابا تھے تو اس سے ساری ناراضگی یوں بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب تو بس بلا وجہ کی ناراضگی اور چڑ تھی، اب وہ ایسا بھی تو نہیں کر سکتی تھی کہ کھٹ سے اپنی رضامندی دے دیتی مگر اب اتنا تنگ کرنے کے بعد تو یوں بھی وہ مان گئی تھی اور اس وقت جبکہ وہ آنکھیں بند کیے ہاتھ پھیلانے کھڑا تھا تو وہ کس دل سے ٹھکراتی اور یہ دل اسے کیسے ٹھکرانے دیتا جو صرف اور صرف غزین ہی کا طلبگار تھا۔ اس نے مسکرا کر اپنا نرم نازک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تو غزین جس کی دھڑکنیں کسی بھی ناگہانی کے خوف سے منتشر تھیں، اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”ہوں.....! اس کا مطلب ہے آپ بھی ہم سے محبت کرتی ہیں.....؟“ وہ شوخ ہونے لگا۔  
 ”جی.....! دماغ تو میرا بھی خراب ہے ناں.....!“ غزین کی نگاہوں کی شوخی وردہ کے رخساروں پر دھنک رنگ بن کر بکھر گئی، پلکیں جھک گئیں۔  
 ”یا اللہ.....! تیرا شکر ہے.....! خطرناک لڑکی قابو میں آگئی۔“  
 غزین نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا تو وہ اسے دیکھے گئی۔ اسی وقت غزین نے اسے دیکھا اور اس کی شوخ ہنسی اطراف میں پھیل گئی۔

